TEXT PROBLEM WITHIN THE BOOK ONLY

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

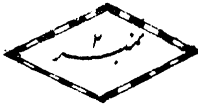
بیادگارِ علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

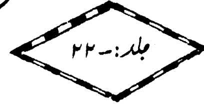
اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔اے

فہرستِ مضامینِ "ہمایوں"





بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۳۲ء

تصاویر { زخمی انگلی / بچوں کا ہفتہ

چندہ سالانہ چار روپے چھ آنے مع محصول فی پرچہ ۶/ ویلر بک سٹال پر ۸/

جہاں نما

جاپان میں شادی کی رسم

جاپان کی رسم شادی کو جاپانی زبان میں "یومیری" کہتے ہیں جس کا ترجمہ "دلہن کی آمد" ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یہ شادی کے ذریعہ سے مرد اور عورت کے اتحاد ہی کی رسم نہیں ہوتی بلکہ فی الحقیقت یہ دلہن کو پہلے پہل دولہا کے خاندان میں داخل کرنے کی تقریب ہوتی ہے۔ یہ رسم ہمیشہ رات کو ادا کی جاتی تھی لیکن بڑے بڑے شہروں میں دوپہر کے بعد بلکہ صبح کو بھی اس رسم کے ادا کرنے کا رواج ہوگیا ہے۔ اس رسم میں مذہب کو کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔

دلہن کو اس کے ماں باپ اور مشاطہ وغیرہ دولہا کے گھر لے جاتے ہیں۔ دلہن کو ایک خاص عروسی جوڑا پہنایا جاتا ہے اور ایک سفید تکونی پٹی اس کے سر پر باندھ دی جاتی ہے جسے "سونو کاکوشی" یعنی "سینگوں کی پوش" کہتے ہیں یہ ایک قدیم جاپانی عقیدہ ہے کہ ہر عورت کے حسد کے سینگ ہوتے ہیں۔ جو اس تکونی نقاب کے پہننے سے چھپ جاتے ہیں مغربی تہذیب کے اثرات سے یہ چیزیں مفقود ہوتی جارہی ہیں۔ مکان کے بہترین کمرے میں دلہن دولہا کے بالمقابل بٹھادی جاتی ہے۔ اس وقت وہاں صرف لڑکی کے ماں باپ دولہا مشاطہ اور چند کمسن خادمائیں موجود ہوتی ہیں جب یہ سب لوگ اطمینان سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں تو دولہا کے پاس تین پیالوں کا ایک سٹ لایا جاتا ہے وہ سب سے اوپر کا پیالہ اٹھالیتا ہے جس کو خادمہ تین دفعہ تھوڑی تھوڑی سیک (پینے کی چیز) کی مقدار ڈال کر بھر دیتی ہے اور وہ اُسے تین گھونٹوں میں ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہی پیالہ دلہن کے پاس لایا جاتا ہے جسے وہ اسی طریقہ سے خالی کردیتی ہے۔ دوسرا پیالہ پہلے دلہن کو اور پھر دولہا کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور آخری پیالہ پہلے دولہا کو اور پھر دلہن کو پلایا جاتا ہے۔ یہ تینوں پیالے اسی طریقے سے تین دفعہ بھرے جاتے ہیں اور پھر اسی طریقے سے خالی کردئے جاتے ہیں۔ سیک پینے کی یہ رسم جاپانی شادی کا اہم ترین لازمہ ہے۔ اس کے بعد شادی کا تقدس قائم ہوجاتا ہے

اس رسم کے بعد فوراً شادی کی دعوت کی رسم منائی جاتی ہے جس میں بہت سے رشتہ دار اور دوست مدعو ہوتے ہیں اس موقع پر عموماً دلہن اپنا عروسی جوڑا تبدیل کر ڈالتی ہے۔

اسی طرح دونوں گھرانوں کا رشتۂ اتحاد جوڑنے کی رسم بھی سیک ہی پی کر ادا کی جاتی ہے۔ دونوں خاندانوں کے اراکین دو قطاروں میں آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر قطار کا معتبر آدمی قطار کے ایک سرے پر اپنی

بیوی کے ہمراہ بیٹھ جاتا ہے۔ بعد ازاں دولہا اور دلہن لائے جاتے ہیں۔ پہلے تو دولہا کا باپ سیک کا ایک پیالہ پیتا ہے۔ اس کے بعد اسی پیالے میں دلہن کو سیک دی جاتی ہے اور آخر کار وہ دولہا کی ماں تک جا پہنچتا ہے دوسرے پیالہ میں پہلے دلہن کے باپ کو سیک پلائی جاتی ہے پھر دولہا کو اور آخر کار دلہن کی ماں کو۔ اخیر کا پیالہ دلہن کے باپ سے ہوتا ہوا دولہا کے باپ، دلہن کی ماں، دولہا کی ماں، دلہن اور دولہا کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں خاندانوں کے تعارف کی رسم کو مکمل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور دعوت دی جاتی ہے جس کا مقصد نئے شادی شدہ جوڑے کا دوستوں اور رشتہ داروں سے تعارف کرانا ہوتا ہے۔ لیکن یہ رسم اکثر کسی دوسری شام کو ادا کی جاتی ہے۔

شادی کی رسم کے بعد کا دن قدیم رسم و رواج کے مطابق نہایت پر تکلف دعوت سے منایا جاتا ہے اور دوسرے دن دلہن کو دولہا کے رشتہ داروں اور دوستوں کے گھر باقاعدہ تعارف کے لئے لے جاتے ہیں۔

تیسرے دن دلہن اپنے میکے چلی جاتی ہے۔ دولہا اس کے ساتھ نہیں جاتا۔ دلہن دو راتیں وہاں رہ کر پھر دولہا کے گھر جاتی ہے۔ اس موقع پر وہ اپنے میکے والوں کے سامنے دولہا اور اس کے تمام رشتہ داروں کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر سکتی ہے۔ دولہا سے شادی کی شام سے پہلے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی ہوتی۔

چوتھے دن دولہا دلہن کے گھر جاتا ہے اور اپنے ساتھ اُس کے گھرانے کے لئے بہت سے تحائف لے جاتا ہے دلہن تو پہلے ہی اپنی سسرال والوں کے لئے بہت سے تحائف لے جاتی ہے۔ اس لئے دولہا کے تحائف ایک طرح ان کا بدلہ ہی خیال کئے جا سکتے ہیں۔

دولہا کی آمد پر ایک اور دعوت ہوتی ہے جس میں دولہا کو دلہن کے رشتہ داروں اور دیگر متعلقین سے متعارف کیا جاتا ہے۔ دولہا ان کے رشتہ داروں اور دوستوں کے گھر میں بھی جاتا ہے۔ وہ ایک رات وہیں بسر کرتا ہے اور صبح کو دولہا دلہن دونوں اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی متاہل زندگی شروع ہو جاتی ہے۔

پرانے زمانے میں شادی کے بعد شاذ و نادر ہی بیوی کبھی اپنے میکے جا سکتی تھی۔ مگر اب یہ دستور مٹتے جاتے ہیں

جیک بوکانن کا ایک جلیل القدر مدّاح

جیک بوکانن لنڈن کے ایک بازار میں سے گزر رہا تھا کہ ایک تیز رو چھوٹے سے آدمی کا شانہ اس کے شانے سے ٹکرایا۔ وہ آدمی مُنہ پھیر کر مسکرایا اور بولا "جیک مجھے افسوس ہے"۔ اس کے بعد آگے بڑھ گیا۔

کچھ دن کے بعد ایک رات کسی پارٹی کے موقع پر جیک نے اس چھوٹے سے آدمی کو پھر دیکھا وہ کمرے کے دوسرے سرے پر بیٹھا ہوا جیک کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جیک فوراً اُٹھ کر اُس کے پاس گیا اور معذرت

کرنے لگا کہ مجھے آپ کا نام یاد نہیں۔

جواب ملا "کچھ مضائقہ نہیں۔ ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔ مگر میں سینما میں آپ کے کمالات سے بہرہ اندوز ہوتا رہا ہوں۔ دیکھئے نا! مجھے بہت فرصت ہوتی ہے۔ میں ایک زمانے میں امان اللہ شاہِ افغانستان ہوتا تھا"

جنگ اور ڈکیتی

کوئی ایسی بات نہیں جس کا فیصلہ صلح و امن کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ اس لئے جنگ کا آغاز کرنے والے جنگ کے جواز کے لئے جو وجوہ پیش کرتے ہیں۔ وہ معقول نہیں سمجھی جا سکتیں۔ مہذب لوگ ہر بات کا فیصلہ صلح و آشتی سے کر سکتے ہیں۔ اگر جنگ و جدال جائز ہے تو ڈکیتی اور لوٹ مار بھی جائز ہے۔ لڑائی سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ خاک بھی نہیں۔ اس سے حق و باطل کے درمیان کسی قسم کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ لڑائی سے اس کے سوا اور کچھ ثابت نہیں ہوتا کہ بہتر لڑنے والا کون ہے۔

ایک زمانے میں یورپ میں ڈوئل کا عام دستور تھا اگر کوئی شخص کسی کو جھوٹا کہتا ہو تو وہ اُسے مجادلہ کی علامت دیتا اور اسے تلوار سے مار ڈالتا تھا۔ اس کے خیال میں اس طرح اس کی "صداقت" ثابت ہو جاتی تھی۔ حالانکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص تلوار کا دھنی ہونے کے باوجود سخت جھوٹا ہے۔

برنارڈ شا کی شادی

برنارڈ شا دراصل رسم و رواج اور معاشرت کی قیود سے اتنا آزاد نہیں جتنا وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس بیان کی تصدیق اس کی شادی کی دلچسپ داستان سے ہوتی ہے۔

مس شارلوٹ پین ٹاؤنشنڈ سے برنارڈ شا کی ملاقات پہلے پہل مسٹر اور مسز سڈنی ویب کے ہاں ہوئی۔ شا کے یہ میزبان ان دنوں ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھے اس لئے شا اور مس ٹاؤنشنڈ کو تنہائی کی ملاقاتوں کا کافی وقت ملتا رہا۔ چند ہی ہفتوں کے بعد برنارڈ شا نے مرحومہ مس ایلن ٹیری کو ایک خط میں لکھا کہ "مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دل میں مس ٹاؤنشنڈ کی محبت پیدا ہو رہی ہے۔"

لنڈن آنے کے بعد بھی شا مس ٹاؤنشنڈ کی اقامت گاہ پر جاتا رہا اور ایک سال تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن ان دونوں کا تعلق پوری طرح اس وقت استوار ہوا جب برنارڈ شا سالہا سال کی شدید محنت کی وجہ سے سخت بیمار ہو گیا۔ اس بیماری کا سلسلہ اٹھارہ مہینے تک رہا۔ شا کی والدہ اور مس ٹاؤنشنڈ نے یہ مدت نہایت بیقراری اور پریشانی میں گذاری انہوں نے کوشش کی کہ شا مس ٹاؤنشنڈ کے دیہاتی مکان میں چلا جائے تاکہ کھلی ہوا اس کی صحت کی ترقی میں مدد کرے۔ اس وقت دفعۃً معلوم ہوا کہ شا رسم و رواج کا نہایت کٹر پابند ہے اُس نے "ایک کنواری لڑکی" کے مکان میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔

ادھر مس ٹاؤنشنڈ اس کے لے جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ آخر شا نے ہار مان لی لیکن ایک شرط کے ساتھ اس نے کہا "جاؤ شادی کی ایک انگشتری اور لائسنس لے آؤ۔" اس طرح دونوں کی شادی ہو گئی۔

جب بعد میں شا سے اس کی شادی کے متعلق تذکرہ ہوا تو اُس نے کہا کہ "میں نے محبت یا دولت کے لئے شادی نہیں کی میں نے محض اس لئے شادی کی

کہ ایک دوسرے کے لئے ہمارا وجود ناگزیر ہوگیا تھا

مسز شا کی اپنی جگہ بالکل ایک الگ شخصیت ہے یہ بات اسکی شادی کے مذکورہ بالا واقعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے لیکن وہ اس قدر دور اندیش ہے کہ اس نے کبھی اس شخصیت کو اپنے جلیل القدر شوہر کی شخصیت کے مقابلہ میں ساوی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ شا کی شادی کو تیس سال گزر چکے ہیں اور اس کی خانگی زندگی بالکل عام رسمی زندگی کے مطابق ہے وہ محض اپنی تحریروں میں رسم و رواج سے آزاد نظر آتا ہے عملی طور پر اس کی زندگی ایک عام کاروباری آدمی کے شانہ ہے برنارڈ شا اور ہے اور برنارڈ شا ڈراما نویس اور ہے۔

ٹرکی میں متاہل زندگی

سنہ ۱۹۳۰ء کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کی بے شمار درخواستوں کے باوجود عدالتوں نے صرف ۲۱۲۷ درخواستیں منظور کیں اسی سال شادیوں کی تعداد ۵۰۶۸۹ تھی حقیقت یہ ہے کہ طلاق لینا آسان نہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عدالتیں طلاق منظور کرنے کے خلاف ہوتی ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات کی سماعت بہت طول کھینچتی ہے۔ ۱۳۱ مقدمات ایسے پیش ہوئے جن میں طلاق تین سال کی سماعت کے بعد منظور ہوئی۔ تقریباً ۶۰ فیصدی طلاقیں مزاجوں کی ناموافقت کی بنا پر منظور ہوئیں۔ ۲۶۰ مقدموں میں بیوی کی بیوفائی اور ۲۶ مقدموں میں شوہر کی بیوفائی طلاق کا باعث ہوئی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ترک شوہر ترک بیویوں سے زیادہ وفادار ہوتے ہیں بلکہ شوہر کی ہنگامی اور اتفاقی بیوفائی نظر انداز کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر بیویاں عدالت میں نہیں جاتیں، حالانکہ ان کے پاس اپنے شوہر کی بیوفائی کا ثبوت ہوتا ہے بیویوں کی یہ رواداری تعددِ ازدواج کی قدیم رسم کا نتیجہ ہے جس کے اثرات نئے قوانین ابھی محو نہیں کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۳۸ مقدمات میں تعددِ ازدواج کا بھی ثبوت ملا لیکن یہ تعداد اصلی تعداد سے بہت کم ہے۔ بالخصوص دیہات میں تعددِ ازدواج کی رسم ابھی کافی ہے۔

باوجودیکہ دیہات میں شادی کم عمری کے زمانہ میں کی جاتی ہے۔ رجسٹروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئے قوانین کے ماتحت صرف ۲۹۳۶۵ شادیوں کا اندراج ہوا۔ اس بات کے پیش نظر حکام اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صرف "سوس سول کوڈ" (SWISS CIVIL CODE) تعددِ ازدواج کی روک تھام کے لئے کافی نہیں یہ رسم اس قدر گہرے اثرات پیدا کر چکی ہے کہ امام اور خود عہدہ داران حکومت بھی بعض اوقات غیر قانونی شادی میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے مجلس ملیہ اس بات پر مجبور ہوتی ہے کہ ایسے اماموں۔ سرپرستوں اور حکام کے لئے قانونی سزا مقرر کرنے پر غور کرے جو اس باب میں قوانین حکومت کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں۔

اردو بک سٹال لاہور

رُباعیات

(۱)

پہلے تھا یہ خطرہ میں غافل ہوں میں
پھر وہم ہوا یہ دل کو کامل ہوں میں
اب ٹھوکریں کھا کھا کے یہ معلوم ہوا
دنیا ہے جو خار زار حاصل ہوں میں

(۲)

اپنا یہ جور و وفا محبت سب ہیچ
تدبیر اثر سکون مسرت سب ہیچ
ہمہ حاصل زیست ہے کہیں ذوق یقیں
خوش ہوں کہ ہے یہ غم و مشقت سب ہیچ

(۳)

کیوں تو نے یہ ٹھان لی ہے دکھ بھرنے کی
تدبیر کر تو جیتے جی مرنے کی
ہو جائے گا کیا کیسے نہ کرنے سے ترے
تشویش یہ چھوڑ کچھ نہ کچھ کرنے کی

(۴)

کرتا ہے تو کیا سب کی خوشی کا ساماں
دنیا کی خوشی کا ہے یہی [illegible]
ممکن ہے کہ یاں رنج سے خوش ہوں یارے
اک دل ہی بہت ہے اگر ہو کچھ بھی شاداں

ب ل

نواہائے راز

دو دل یکجا نہ ہوں گے، دل کو تڑپانے سے کیا حاصل
ازل سے ہے یہی افسانہ، دُہرانے سے کیا حاصل

فنا ہونے بھی دے، مٹنے بھی دے اے ناصحِ ناداں
سمجھتا ہو جو سب کچھ اُس کو سمجھانے سے کیا حاصل

وہ مجنوں دو جہاں ٹھکرا دیئے ہوں جس نے اے لیلیٰ
تجھے خاطر میں کب لائے گا دیوانے سے کیا حاصل

مرا دل بھی وہیں، جاں بھی وہیں، سب کچھ وہیں یارب
یہ جبر اُس انجمن سے مجھ کو لے جانے سے کیا حاصل

یونہی دل میں رہو گے عمر بھر داغِ نہاں ہو کر
خدا حافظ تمہارا، جاؤ! اب جانے سے کیا حاصل

جو پھول نہ نکلے ترے گلزار کے قابل
وہ داغ بنے، باغِ دلِ زار کے قابل

سب راز کھلے، پر نہ کھُلا راز ہمارا
حالانکہ وہی راز تھا اظہار کے قابل

وہ بے سبب آزار ہے، بدنام نہ ہو جائے
اِس خوف سے ہم بن گئے آزار کے قابل

ہر چند کہ گلزار ہے داغوں سے مرا دل
یہ نذر کہاں ہے نگہِ یار کے قابل

اے خسروِ اقلیمِ سخن بار مجھے دے
حالانکہ نہیں ہیں ترے دربار کے قابل

حامد علی خاں

"ہمایوں" کا دسواں "سالگرہ نمبر"

مسٹر رام چند منچندہ بی اے۔ ایل ایل بی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ لاہور

مضامین کا انتخاب اور اُن کا تنوع لاجواب ہے۔ مضامین دلچسپ اور مفید ہیں اور اُن کا ادبی معیار بھی بہت بلند ہے۔ ہمایوں کو مخزنِ علم کہا جائے تو بجا ہے۔ اس دور کے اُس عظیم الشان انسان کی یادگار قائم رکھنے پر جس کی دوستی کا فخر مجھے بھی اس کی زندگی میں حاصل تھا میں آپ کو سچے دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔

ایک بات دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ وہ یہ کہ ہمایوں کی فہرستِ مضامین میں مجھے کسی ہندو مضمون نگار کا نام نظر نہیں آیا۔

مسٹر غلام حسین ایڈووکیٹ لکھنؤ

میں نے سالگرہ نمبر کے بعض مضامین بار بار پڑھے ہمایوں تنوعِ مضامین اور بلندیٔ معیار کے اعتبار سے ادبی رسائل میں بلند مرتبہ کا مستحق ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ لکھنؤ اور دہلی اردو زبان و ادب کی وہ خدمات انجام دینے سے قاصر ہیں جس کی اُن سے اُردو کا مرکز ہونے کی حیثیت سے توقع تھی۔ پنجاب اور اہلِ پنجاب نے زبان کی ترقی کے لئے تحقیق و تدقیق کی جو نئی راہیں تلاش کی ہیں اُن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں دلی استحسان کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ کسی تجارتی مقصد کے بغیر آپ نے یہ رسالہ محض اردو زبان کے ذریعہ سے علمی خدمت انجام دینے کے لئے جاری کر رکھا ہے۔ آنریبل جسٹس میاں شاہدین مرحوم کی یاد میں ایک ایسے رسالہ سے بہتر کوئی یادگار قائم نہ کی جا سکتی تھی جو اس زبان میں شائع ہو جس سے انہیں بے انتہا محبت تھی اور جس کی انہوں نے اپنے استادانہ مضامین نظم و نثر سے بیش بہا خدمت انجام دی۔

تصاویر۔ زخمی انگلی:۔ یہ ایک فرانسیسی مصور (F-D VOR AK) کی تصویر ہے بچے نے ماں کے منع کرنے کے باوجود چاقو اٹھا لیا اور چپکے سے باغ میں جاکر درختوں کی ٹہنیاں کاٹنے لگا۔ انگلی کٹنے پر اس کے ہمجولی ہمدردی کیلئے جمع ہو رہے ہیں۔ یہ تصویر حقیقی زندگی کا ایک دلچسپ باب پیش کر رہی ہے۔

بچوں کا مشغلہ۔ پانچوں بچے ناخوش معلوم ہوتے ہیں کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے جو انہیں ناگوار ہے ان کی دنیا ہی بدل گئی ہے ماں وہیں موجود ہے لیکن نہایت اطمینان کے ساتھ انہیں دیکھ رہی ہے سب بچے ایک دوسرے کیلئے اجنبی ہیں۔ پہلے یہ اتنے بڑے کمرے میں کبھی نہیں آئے انہوں نے کبھی اتنے بچے دیکھے ہیں نہ کبھی اتنی مائیں تین بڑے بچے انکو اس سخت اعتراض ہے ننھی بی بی جو منہ میں انگوٹھا ڈالے چوس رہی ہیں اس واقعہ پر حیران ہیں لیکن ابھی انہیں رونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی وہ اماں کو دیکھ رہی ہیں آپکے ساتھ والی کا استغنا بھی قابل ملاحظہ ہے تیسرا بچہ موجودہ صورت حال سے سخت ناخوش معلوم ہوتا ہے۔ چوتھا بچہ ذرا زیادہ نازک مزاج ہے اسکا خیال ہے کہ ایک چیختی ہوئی بچی کو اسکے بائیں پہلو میں لا بٹھانا ظلم کے ساتھ توہین کا اضافہ ہے چنانچہ وہ طیش میں آ گیا ہے چھوٹی لڑکی اپنی جگہ بہت تنگ ہے اسے بچے کے طیش

جذبِ محبّت

ڈراما کے افراد

پائیرو　　　پائیرٹ　　　پائیرو کی ماں

مقام: پائیرو کے قدیم مکان میں نشست کا کمرہ۔

وقت: موسمِ سرما کی ایک رات۔

کمرہ صاف ستھرا اور معمولی سادہ سامان سے آراستہ ہے۔ بائیں طرف اوپر کے کمروں میں جانے کے لئے ایک زینہ ہے۔ ایک میز اور دو کرسیاں کمرے کے وسط میں رکھی ہیں۔ زینے کے قریب دیوار سے کلاک لٹک رہا ہے دائیں طرف آتشدان ہے۔ ایک کیتلی اور ایک چائے دانی چولھے کے قریب پڑی ہیں۔ انگیٹھی کے اوپر اور زینے کے قریب شمعدان میں موم بتیاں روشن ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے تو پائیرو کی بڑھیا ماں جس کے بال سفید ہیں اور جس کے چہرے سے نیکی ظاہر ہوتی ہے دائیں جانب کی کھڑکی کے پردے ڈالتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے بعد وہ آتشدان کی طرف آ کر کیتلی کو چولھے پر رکھ دیتی ہے اور پھر وہاں سے ہٹ کر کچھ بُننے لگ جاتی ہے۔ بُنتے ہوئے اُس کا جسم آہستہ آہستہ ہلتا ہے اور ایک آہ اُس کے مُنہ سے نکل جاتی ہے۔ ایک لمحے کے بعد بیرونی دروازے پر ایک کمزور سی دستک سنائی دیتی ہے۔ بڑھیا اپنی عینک اتار کر رکھ دیتی ہے اور سننے لگتی ہے۔ دستک پھر سنائی دیتی ہے۔ بڑھیا اٹھ بیٹھتی ہے اور جا کر دروازہ کھولتی ہے۔ کمرے کی زرد روشنی باہر کی تاریکی میں سے گذر کر ایک غمگین صورت پر پڑتی ہے۔ یہ بے چاری پائیرٹ ہے جس کے کپڑے کسی قدر بھیگے ہوئے ہیں۔ روشنی کی طرف دیکھ کر وہ ایک دو دفعہ آنکھیں جھپکتی ہے۔ پھر ایک ایسے بچے کی طرح باتیں کرنے لگتی ہے جو راہ بھول گیا ہو۔

پائیرٹ۔ بیگم صاحبہ، آداب۔ خبر نہیں آپ مجھے . . . .

ماں۔ (ذرا حیران ہو کر) کون ہے؟ مجھے نظر نہیں آتا۔ روشنی میں آ جاؤ۔

پائیرٹ۔ (نہایت احتیاط سے آگے بڑھ کر) باہر ایسی تاریکی اور سردی ہے اور یہ مکان مجھے ایسا آرام دہ اور گرم معلوم ہوا کہ میں اس کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر نہ رہ سکی۔ خبر نہیں آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دیں گی یا نہیں

لیکن . . . .

ماں (فوراً اپنی فیاضی سے متاثر ہو کر) ٹھیرو میری بچی! ٹھیرو میں دروازہ بند کر دوں ورنہ ہم سردی سے اکڑ جائیں گے۔ تم بڑی خوشی سے آؤ۔ آؤ آگ کے سامنے اپنے آپ کو گرم کر لو۔ لیکن یہ کیا بات ہے، تم اس تاریک رات میں کہاں بھٹک رہی ہو؟ تمہارا کوئی گھر گھاٹ نہیں؟

پائیرٹ۔ (ملول ہو کر) اب کوئی گھر نہیں۔

ماں۔ افسوس! کوئی روپیہ پیسہ؟

پائیرٹ۔ کچھ نہیں۔

ماں۔ ہائے ہائے! پھر تم صرف سردی سے بچنے کے لئے آوارہ پھر رہی تھیں؟

پائیرٹ۔ ہاں (رونے لگتی ہے)

ماں۔ (اسے اپنی آغوش میں لے کر اور آگ کے قریب لے جا کر) بس بس، بچی! اب جانے دو۔ مت رو میری جان۔ رفتہ رفتہ تمہاری حالت اچھی ہو جائے گی۔ تم بڑی کرسی پر بیٹھ کر مزے سے آگ تاپو، میں تمہارے لئے ایک پل میں چائے تیار کر کے لاتی ہوں۔ وہ پک ہی رہی ہے۔ تم دیکھو میں تمہارے لئے کیسی اچھی چائے بناتی ہوں۔

پائیرٹ۔ میں بہت تھک گئی ہوں اور سخت بھوکی ہوں۔ میں کوسوں چلی ہوں، اور مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کروں گی۔

ماں۔ لیکن تم کہاں سے آئی ہو؟

پائیرٹ۔ ایک جگہ جو یہاں سے بہت دُور ہے۔

ماں۔ اچھا! تو اُس جگہ کا نام کیا تھا؟

پائیرٹ۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں نے کبھی اُن مقامات کے ناموں کی طرف توجہ نہیں کی جہاں ہم جایا کرتے تھے۔ مجھے صرف اُن کی شکل یاد ہے، یا اُن کے باشندوں کی وضع قطع بس اس سے زیادہ کچھ یاد نہیں۔

ماں (چائے تیار کرتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے تم نے بہت سے سفر کئے ہیں۔

پائیرٹ (آہ بھر کر) ہاں۔ ہم کبھی زیادہ دیر تک ایک جگہ نہیں رہے اور بعض اوقات تو ہم کئی کئی دن چلتے رہتے تھے۔

ماں۔ لیکن تم لوگ سفر میں کیا کیا کرتے تھے؟

پائیرٹ۔ ناچتے تھے اور گاتے تھے۔

ماں۔ اوہ!

پائیرٹ۔ ہاں ہاں، ہم ناچتے تھے اور گاتے تھے، اور دنیا کو خوش رہنے کا سبق دیتے تھے۔

ماں۔ لیکن کیا تم خود بھی ہمیشہ خوش رہتے تھے؟

پائیرٹ۔ ہاں پہلے پہل ہم خوش تھے لیکن اس کے بعد جب ہم اچھی طرح ایک دوسرے سے واقف ہو گئے . . . . . آہ وہ کیسا بُرا وقت تھا! . . . . . مجھے کچھ علم نہ تھا کہ انسان پر اس درجہ ہولناک مصیبت بھی آسکتی ہے۔

ماں۔ آہ غریب لڑکی۔ مجھے ساری بات سناؤ۔ شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔

پائیرٹ۔ نہیں، آپ میری مدد نہیں کر سکتیں۔ آپ میری بات نہیں سمجھیں۔ قصور سب میرا تھا، اور اب کچھ نہیں ہو سکتا، اب وقت گذر چکا ہے۔

ماں۔ شاید یہ درست نہیں۔ وقت کبھی نہیں گزرا۔ یہ لو چائے۔ دیکھنا کہیں اپنے اوپر نہ گرا لینا۔ بہت گرم ہے اور یہ کیک بھی اس کے ساتھ کھاؤ۔ یہ نارنجی کیک ہے۔

پائیرٹ۔ آہ کیسا اچھا ہے! میں نے کبھی ایسا مزیدار کیک نہیں کھایا۔

ماں۔ سو تم رقاصہ ہو؟

پائیرٹ۔ ہُم (اُس کا منہ کیک سے بھرا ہُوا ہے)

ماں۔ بڑی مصیبت کی زندگی ہو گی۔

پائیرٹ (لقمہ نگل کر) بعض اوقات۔

ماں۔ لیکن تم مصیبت سے گھبراتی تو نہ ہو گی؟

پائیرٹ۔ کبھی نہیں مصیبت میں بھی ایک مسرت ہے جس سے ہر بات کی تلافی ہو جاتی ہے۔ لیکن . . . .

ماں۔ لیکن کیا؟

پائیرٹ۔ میں نہیں بتا سکتی، ورنہ میں رونے لگوں گی۔ (اپنی پیالی میں بقیہ چائے پر حسرت بھری نظر ڈال کر) میں روتے روتے چائے نہیں پی سکتی۔

ماں۔ تو پھر چائے ختم کرلو۔ (وہ مشفقانہ انداز میں مسکراتی ہے) اور یہ لو ایک اور کیک کھاؤ چھوٹے چھوٹے ہی تو ہیں۔

پائیرٹ۔ آہ آپ کتنی مہربان ہیں! میں حیران ہوں اگر آپ مجھے اندر نہ آنے دیتیں تو میرا کیا حال ہوتا

ماں۔ اب ان باتوں کی طرف خیال ہی نہ کرو۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اکیلی کیسے رہ گئیں۔ تمہارے وہ ساتھی کہاں ہیں جو تمہارے ساتھ پھرا کرتے تھے۔

پائیرٹ (پیالی نیچے رکھتے ہوئے) ہم جدا ہو گئے۔ ہم لڑ پڑے، اور دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا۔

ماں۔ تم دو ہی تھے؟

پائیرٹ۔ نہیں، لیکن قابلِ ذکر ہم دو ہی تھے۔

ماں۔ اور دوسرا کون تھا؟

پائیرٹ۔ پائیرو

ماں۔ پائیرو؟

پائیرٹ۔ ہاں میں اُسے یہی کہہ کر بلاتی تھی۔

ماں۔ اور تمہارا نام........؟

پائیرٹ۔ پائیرٹ۔

ماں۔ پائیرٹ؟

پائیرٹ۔ ہاں وہ مجھے یہی کہہ کر بلاتا تھا۔

ماں۔ سو پائیرو اور پائیرٹ کی لڑائی ہو گئی۔

پائیرٹ۔ سب میرا قصور تھا۔ اوّل اوّل ہمیں ایک دوسرے سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ کوئی چیز اُس میں مخل نہ ہو سکتی تھی۔ ہم ناچتے تھے اور گاتے تھے اور لوگوں کا دل خوش کرتے تھے، لیکن اس کا ہمیں خیال ہی نہ آتا تھا کہ کس کو زیادہ داد ملی۔ ہم ہر بات میں ایک دوسرے کے شریک تھے اور ہر ایک دوسرے کو کامل سمجھتا تھا لیکن کچھ دیر کے بعد جب ہم زیادہ محبت سے کچھ تنگ آ گئے تو ہم نے یہ دیکھنا شروع کیا کہ لوگ کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میں پائیرو سے زیادہ مغرور تھی، اور۔ مجھے اپنے رقص پر اتنا ناز تھا کہ پائیرو کو اپنے گانے پر نہ تھا، اس لئے اگر اُسے داد ملتی تھی تو مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ میں اس خیال کو برداشت ہی نہ کر سکتی تھی کہ میں لوگوں کی محبوب نہیں ہوں۔ چنانچہ میں نے پائیرو سے کہنا شروع کیا کہ اگر میں نہ ہوں تو تمہیں کون پوچھے۔ میں اُس کے گانے پر ہنستی تھی اور اُس کا مذاق اُڑاتی تھی۔ بہت دیر تک وہ یہ سمجھتا رہا کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں میرا مطلب وہ نہیں ہے۔ پھر ایک دن اُسے غصّہ آ گیا، اور اس نے مجھ سے کہا کہ تم ایسی باتیں کہہ کہہ کر مجھے دیوانہ کر دو گی۔ اور اگر پھر تم نے کبھی کوئی ایسی بات کی تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ میں مغرور تھی، اور میں نہ سمجھی کہ وہ مجھے سچ مچ سچ مچ چھوڑ دے گا۔ میں اُس سے اپنی تعریف کرانا چاہتی تھی۔

ماں (ملائمت سے) کیسی سخت غلطی ہے!

پائیرٹ۔ اپنی تعریف کرانے کی خواہش ؟

ماں۔ نہیں، نہیں۔ بلکہ اُس کو اِس بات پر مجبور کرنا کیسی غلطی تھی! تم کیسی ننھی اور ناتجربہ کار ہو!

پائیرٹ۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے غلطی کی مگر اور میں کرہی کیا سکتی تھی۔

ماں۔ کیوں تم اُس کے لئے ماں بن جاتیں۔ تمام مرد دل کے بچے ہیں، اور اگرچہ وہ محبّت بڑے بہادرانہ انداز میں کرتے ہیں اور اپنی محبوبوں کو بڑے دم خم دکھاتے ہیں، لیکن دل سے وہ یہی چاہتے ہیں کہ کوئی ہو جو اُن کے بالوں کو کنگھی کرے اور اُن کی زخمی اُنگلیوں پر بوسے دے۔ کیا تم نے پائیرو کے لئے یہ باتیں کی تھیں ؟

پائیرٹ۔ قطعاً نہیں! وہ اور ناراض ہو جاتا۔

ماں۔ (مسکراتے ہوئے) اچھا تم اس خیال سے ڈرتی رہیں؟ لیکن عقلمند عورت وہ ہے جو اُوپر سے تو اپنے محبوب کی معشوقہ بنی رہے لیکن جو دل میں یہ سمجھے کہ وہ اُس کا چھوٹا بچّہ ہے جس کی تفریح اور آرام کا خیال رکھنا اُس کا فرض ہے۔

پائیرٹ۔ (اُٹھ کر ذرا دُور جاتے ہوئے) میں یہ کبھی نہیں مان سکتی۔ اور اس کے علاوہ میں کسی چھوٹے بچے سے محبت کرنا نہیں چاہتی۔ پائیرو ایک مرد تھا!

ماں۔ اور تم نے اُس کو کھو دیا۔

پائیرٹ۔ (ایک دھکا سا محسوس کرتے ہوئے) لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی۔ سب میرا قصور تھا . . . .
آہ میں جانتی ہوں سب میرا قصور تھا . . . . . . وہ اِس لئے خفا ہو گیا کہ میں اُس سے جلتی تھی اور اُس کا مذاق اڑاتی تھی۔

ماں۔ پائیرٹ میرا خیال ہے کہ تم غلطی پر ہو۔

پائیرٹ۔ مگر اُس نے مجھے بتا دیا تھا کہ یہی وجہ ہے۔ کاش میں اتنی مغرور نہ ہوتی!

ماں۔ یہ صرف اُس کا بہانہ تھا۔ ممکن ہے کہ حقیقی وجہ اُسے خود بھی معلوم نہ ہو۔ ہم سب ایسے ہی ہیں پہلے ہم کوئی بات کر لیتے ہیں پھر بعد میں اس کے لئے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔

پائیرٹ۔ آہ میں سخت غمگین ہوں! کاش میں سب کچھ کھو دیتی لیکن پائیرو مجھ سے جدا نہ ہوتا! (وہ ماں کے قریب فرش پر بیٹھ جاتی ہے)

ماں۔ اور کیا تمہارے خیال میں وہ بھی غمگین نہیں ہوگا ؟

پائیرٹ۔ (اپنے سر کو ایک مایوسانہ جنبش دے کر) نہیں، وہ غمگین نہیں ہوگا۔ وہ نہایت زندہ دل اور خوش رہنے والا آدمی ہے۔ وہ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی غمگین نہیں ہُوا۔

ماں۔ (مسکراتے ہوئے) کیا تمہیں یقین ہے

پائیرٹ۔ ہاں پختہ یقین۔ جتنا عرصہ ہم اکٹھے رہے ہیں میں نے اُسے ایک آنسو بہاتے بھی نہیں دیکھا۔

ماں۔ یہ اس لئے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تم اُسے آنسو بہاتے دیکھو۔ مرد اسی قسم کے ہوتے ہیں جب تک اُن کی تربیت نہ کی جائے۔

پائیرٹ۔ پائیرو روتا ہوگا؟ میں اس کا تصوّر بھی نہیں کرسکتی۔ اگر وہ رو ہی دیا ہوتا تو میں اُس کے ساتھ روتی اور ہم پھر خوش ہو گئے ہوتے۔

ماں۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں تم اُس کی اس حرکت کو بچپن نہ سمجھو۔

پائیرٹ۔ شاید آپ ہی درست کہتی ہوں۔ ممکن ہے اُسے شفقت ہی کی ضرورت ہو جو اُسے مجھ میں نہ ملی لیکن یہ کیسی نادانوں کی سی اور پرانی طرز کی بات ہے۔

ماں۔ ہاں، پرانی طرز کی۔ محبت بھی تو میری جان پرانی طرز کی بات ہے۔

پائیرٹ۔ کاش مجھے ایک موقع اور مل جائے! اگر میں ایک دفعہ اُس سے پھر جا ملوں اور وہ مجھے معاف کردے تو میں کبھی اُس کے دل کو اپنی ذات سے منحرف نہ ہونے دوں (وہ ایک پُر اضطراب انداز سے اُٹھ بیٹھتی ہے)

ماں۔ تم یقیناً اُس سے جا ملوگی ۔۔۔۔۔ یا وہی تم سے آملے گا۔

پائیرٹ۔ وہ مجھے تلاش نہیں کرے گا۔ وہ اِس وقت بھی کہیں گا رہا ہوگا۔ ناچ رہا ہوگا ۔۔۔ مجھے معلوم ہے، اور میں یہاں . . . . . . (رونے لگتی ہے)

ماں (اُٹھ کر اُسے گلے لگالیتی ہے) اب رونے دھونے کو چھوڑو۔ اِس سے وہ کہیں واپس تو نہیں آجائے گا۔ تمہیں سو رہنا چاہئے۔ صبح تک پائیرو کو بالکل بھول جاؤ۔ اس طرح تمہیں کچھ سکون نصیب ہوگا تو تم سوچ سکوگی کہ اُسے کیوں کر تلاش کیا جائے۔

پائیرٹ۔ کیا آپ سچ مچ مجھے اپنے مکان میں سونے دیں گی۔

ماں۔ کیا تم یہ خیال کررہی تھیں کہ میں تمہیں ایسی سخت سردی میں گھر سے نکال دوں گی؟

پائیرٹ۔ بعض لوگ ایسا ہی کرتے خصوصاً مجھ سی بے خانماں کو دیکھ کر۔

ماں۔ پاگل! دنیا اتنی بُری نہیں ہے بچی۔ آؤ میں تمہیں اوپر ایک بہت بڑے پلنگ پر سُلا آؤں جس پر پروں والا نرم نرم بستر بچھا ہوا ہے۔

پائیرٹ۔ (ہونٹوں پر ایک خواب آلود تبسّم لاکر) اوہ، نرم نرم پروں والا بستر! شاید اس میں تو خوشی سے مجھے نیند بھی نہ آئے۔

ماں۔ نیند کا فکر نہ کرو۔ تمہاری آنکھیں آدھی بند تو پہلے ہی ہو رہی ہیں۔ اور چائے بھی تمہیں "نند یا پور" تک پہنچانے میں مدد دے گی۔

پائیرٹ۔ (انگڑائی لیتے ہوئے) چائے نے تو مجھے .... واقعی ..... بیہوش سا کر دیا ہے۔

ماں۔ (شمعدان سے ایک جلتی ہوئی موم بتی لے کر سیڑھیوں کا راستہ دکھاتے ہوئے) آؤ، میری بچی سنبھل کر آنا کہیں سیڑھیوں سے پاؤں نہ پھسل جائے۔ یہ بہت سیدھی ہیں۔

پائیرٹ۔ میں آرہی ہوں۔ آہ میں اتنی تھک گئی ہوں کہ بمشکل اوپر پہنچ سکوں گی۔

ماں۔ (سیڑھیوں کو طے کر کے اور نظروں سے اوجھل ہو کر) یہ ہے تمہارا کمرہ پائیرٹ۔

(دونوں نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ آگ میں سے تڑ تڑ کی آواز آتی ہے اور کیتلی میں سے چائے کے ابلنے سے ایک نغمہ سا پیدا ہوتا ہے۔ ایک لمحے کے بعد باہر کچھ کھٹکا سا سنائی دیتا ہے۔ پاؤں دروازے کی سیڑھیوں پر پڑتے معلوم ہوتے ہیں، دروازے کی چٹخنی اٹھائی جاتی ہے اور تھوڑا سا دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے۔ پائیرو کا سر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، پھر کسی کو نہ پا کر سارا دروازہ کھول دیتا ہے اور دبے پاؤں اندر آجاتا ہے۔ اُس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے ہیں اور اس کے چہرے پر رنگ کے کچھ نشان ہیں۔ اُس کی آنکھیں مرجھائی ہوئی ہیں اور اس کا سر غم سے جھکا ہوا ہے۔ وہ آگ کے قریب جا کر بڑی شکستہ دلی سے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ ماں سیڑھیوں کے اوپر ظاہر ہوتی ہے اور چپ چاپ نیچے آجاتی ہے۔ پائیرو کو اُس کے آنے کی خبر نہیں ہوتی، نہ وہ اُسے دیکھتی ہے۔ وہ خوش ہے اور مسکرا رہی ہے، پھر بیرونی دروازے کی چٹخنی لگانے کے لئے بڑھتی ہے۔ پائیرو چونک اُٹھتا ہے مڑ کر دیکھتا ہے اور اٹھ بیٹھتا ہے۔)

پائیرو۔ (ٹوٹی ہوئی آواز میں) اماں! تم مجھے نہیں پہچانتیں، اماں؟

ماں۔ (چونک کر اور اُس کی طرف حیرانی سے دیکھ کر) ہیں .... تم .... ؟

پائیرو۔ (اُس کی طرف جا کر) ہاں یہ میں ہوں۔ اور تم نے مجھے پہچانا نہیں؛ میں جانتا ہوں، ایک عرصہ ہو گیا اور میں کچھ بدل بھی گیا ہوں۔ لیکن امی، میں اب بھی تمہارا پیارا بچہ ہوں۔

ماں۔ (باہیں پھیلا کر۔ بیٹے کو پہچان کر اُس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگتا ہے) پطرس!

پائیرو۔ (ماں سے بغل گیر ہو کر) پیاری امی! کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ میں کبھی واپس نہیں آؤں گا؟

ماں۔ میرے دل میں ابھی یہ خوف پیدا ہونا شروع ہی ہوا تھا، پطرس۔

پائیرو۔ (ماں کو چھوڑ کر) اماں، میں کیسا احمق تھا کہ اتنی دیر باہر رہا، جب کہ تم سی مہربان ماں گھر میں میرے انتظار کا دکھ اٹھا رہی تھی۔

ماں۔ (اس کے سارے جسم پر ایک نگاہ ڈال کر) یہ عجیب وغریب کپڑے تم نے کہاں سے لئے؟ اور یہ تمہارے منہ پر زنگ کے دھبّے کیسے ہیں؟ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے!

پائیرو۔ (ایک اداس مسکراہٹ لبوں پر لاکر) میں غمزدہ اور بیمار ہوں، اماں میں ایک مسرور پرندہ تھا، لیکن اب میرے پَر مرجھا گئے ہیں۔ . . . . . مجھے کچھ کھانے کو دو، اس کے بعد میں تمہیں ساری کہانی سناؤں گا۔ (وہ چائے کے سامان کی طرف بھوکی نگاہوں سے دیکھتا ہے)

ماں۔ (چولھے کی طرف جاکر) ضرور! خبر نہیں مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہ آیا کہ تمہیں سخت بھوک لگ رہی ہوگی اور آج کیسی ہولناک رات ہے! تم کس طرح آئے ہو؟

پائیرو۔ (بلا تامل) پیدل

ماں۔ ہائے میں صدقے! تمہیں بڑی سخت سردی لگی ہوگی؟

پائیرو۔ لگی تو تھی، لیکن ابھی گرم ہوا جاتا ہوں۔ مگر چائے جلدی تیار کرو، امّی۔ میری جان نکلی جا رہی ہے۔ او ہو، تمہارے پاس تو نارنجی کیک بھی ہیں۔ اب ان کو کھائے مدتیں ہی ہوگئیں۔ اماں تمہیں یاد ہے جب میں نے آخری دفعہ تمہارے نارنجی کیک کھائے تھے؟ (وہ ایک پورا کیک منہ میں رکھ لیتا ہے)

ماں۔ (کیتلی کو چولھے سے اتار کر) جس دن تم یہاں سے گئے تھے، پطرس۔ اور میں چاہتی تھی کہ تم اور کھاؤ اور کھاؤ . . . .

پائیرو۔ اور میں نے اپنی تمام جیبیں بھر لیں تھیں۔ خدا کی قسم وہ کتنے اچھے کیک تھے! اور دیکھو، میں پھر یہیں ہوں، اپنی پیاری امّی کے پاس، اور وہی لطیف نارنجی کیک کھا رہا ہوں!

ماں (خوش ہوکر) چلو آؤ۔ اس آرام کرسی میں بیٹھ جاؤ اور میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔ یہاں تمہارے سر کے لئے تکیہ اور تمہارے پاؤں کے لئے چوکی بھی رکھ دیتی ہوں۔ (کہنے کے مطابق دونوں چیزیں رکھ دیتی ہے) اسے ہے تمہارا جوتا تو بالکل پھٹ چکا ہے۔ تم کتنے بے پروا ہوگئے ہو!

پائیرو۔ اماں، تم کیا جانو، میرا تو دل بھی پھٹ چکا ہے (چائے کا ایک گھونٹ پیتا ہے) آہ، کیسی عمدہ چائے ہے۔ میں نے تو سالہا سال سے ایسی چائے نہیں پی۔

ماں۔ پطرس، میری جان پطرس! تم نے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہوں گی۔ اس طویل عرصے میں تم کیا کرتے رہے؟ تم نے کبھی خط تک بھی نہ لکھا۔ تمہارے اس تغافل نے میرا دل توڑ دیا۔ آہ پطرس تم اتنے ظالم کیسے ہوگئے جب تم جانتے تھے کہ تمہارے فکر سے میری جان پر بن جائے گی؟ (اس کی آواز کانپنے لگتی ہے۔ وہ اپنے

آپ کو پائیرو کے ساتھ والی کرسی میں ڈال دیتی ہے اور متفکرانہ انداز سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

پائیرو۔ (متانت سے) امّی، میں تمہاری طرف ضرور خط لکھتا، لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چاہتا تھا کہ میں سونے کی ایک تھیلی کما کر ایک گھر واپس آؤں اور تمہیں حیران کر دوں۔ میں نے دولت اور شہرت کے لئے سخت کوشش کی اور ہر روز میں یہی سمجھتا رہا کہ کل میں ضرور اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اسی طرح دن گذرتے گئے، اور میں تمہاری طرف خط لکھنا ملتوی کرتا رہا اور آخر کار مجھے تم سے شرمندہ ہونا پڑا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شرمندہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ماں۔ اور پطرس کیا تم سے ہمدردی کرنے والا کوئی نہ تھا؟

پائیرو۔ نہیں، میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اُس کا اب ذکر ہی کیا ہے۔ میں دلیر بننا چاہتا تھا۔ اگر میں مر بھی رہا ہوتا تو میں کسی سے ہمدردی کی درخواست نہ کرتا۔ کچھ عرصے تک میں بہت اچھا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں بہت دیر تک خوش بھی رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں تک کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں تک کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (وہ آہ بھرتا ہے اور پھر چائے کا ایک گھونٹ لیتا ہے)

ماں۔ لیکن تم گزر اوقات کے لئے کیا کرتے تھے بیٹا؟

پائیرو۔ مسخرہ پن۔

ماں۔ (صدمہ محسوس کر کے) مسخرہ پن! آہ تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟

پائیرو۔ اماں، امیر ہونے کا یہی ایک یقینی طریقہ ہے۔

ماں۔ تم مذاق کر رہے ہو۔

پائیرو۔ نہیں یہ بالکل درست ہے۔ کسی دنیادار سے پوچھ لو۔

ماں۔ پھر تم کیوں امیر نہ ہو گئے؟

پائیرو۔ کیونکہ میں ایک ادنےٰ درجے کا مسخرہ تھا۔ جانتی ہو یہ بھی ایک فن ہے ـــــ ایک زبردست فن، اور اس کے لئے ایک بڑے ہوشیار آدمی کی ضرورت ہے۔ میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔

ماں۔ پطرس، تم ہمیشہ ایسی ہی واہی تباہی باتیں کرنے کے عادی ہو۔ میرا خیال تھا کہ تم اب سیانے ہو گئے ہو گے۔

پائیرو۔ ہاں سچ ہے۔ میں جتنا بڑا ہوا اتنا ہی غمگین ہو گیا۔

ماں۔ لیکن تمہیں غمگین نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں مصائب میں بھی خوش رہنا چاہئے۔

پائیرو۔ (آہ بھرتے ہوئے اور آخری نارنجی کیک لیتے ہوئے) یہ کہنا بہت آسان ہے

ماں۔ لیکن تم نے امید ہی کو کھو دیا تو باقی کیا رہا۔
پائیرو۔ (کیک سامنے کرکے) نارنجی کیک۔
ماں۔ (اُس کے مسخرہ پن پر ہنس کر) شریر لڑکے، تمہاری موجودگی میں نارنجی کیک بھی کہاں رہتے ہیں۔ کل مجھے ایک اور گھان نکالنا پڑے گا۔
پائیرو۔ (کھاتے ہوئے) امّی، ضرور۔ میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔
ماں۔ اچھا، اچھا، میں تمہیں ہر وہ چیز دوں گی جس سے تمہیں مسرت ہو۔
پائیرو۔ (کرسی سے اٹھ کر اور ایک طرف جاکر) نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی مسرت کھو چکا ہوں۔
ماں۔ کیسی بے معنی بات کرتے ہو۔ دنیا میں کامیاب ہونے کے لئے ابھی تمہارے پاس ایک عمر پڑی ہے
پائیرو (سنجیدگی سے) آہ مجھے کامیابی کی فکر نہیں ہے۔ کامیابی حاصل کئے مجھے مدتیں ہوگئیں۔
ماں۔ پھر تمہیں اور کیا فکر ہے؟
پائیرو۔ (آگ کی طرف مڑتے ہوئے اور نہایت غمگین ہوکر) اماں، اگر میں تمہیں بتاؤں گا تو تم کہو گی کیسا احمق ہے!
ماں۔ (ایک ہاتھ اُس کے بازو پر رکھ کر) میں کیوں کہنے لگی۔ پطرس، میں تمہاری ماں ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے۔ میں تمہارے جذبات کو سمجھوں گی۔
پائیرو۔ (کچھ تامل کے بعد دھیمی آواز میں) آہ یہ ایک لمبی کہانی ہے، اور مجھے تو تمام کی تمام یاد بھی نہیں لیکن ـ مجھے ایک حسین، نازک اندام، رسیلی آنکھوں والی لڑکی سے محبت ہوگئی۔ وہ مجھے ایک باغ میں ملی جو یہاں سے دور بہت دور ہے۔ وہ ایک چار دیواری کے اندر اُس پھول کی طرح پلی تھی جس نے آفتاب کی روشنی اور پتوں کی آغوش کے سوا دنیا کی اور کوئی چیز نہ دیکھی ہو۔ اُس کی محبت ابھی نہاں خانۂ دل ہی میں پوشیدہ تھی کہ میں نے ایک دن ایک پھول توڑنے کے لئے جا کر اُس دیوار کو پھاندا اور دیکھا کہ وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ایک کنج میں چھپی بیٹھی ہے۔ میں نے اُس کے سامنے اپنا ایک حسین ترین نغمہ گایا اور وہ اُسے سُن کر مجھ سے محبت کرنے لگی۔ ہم دونوں دیوار کو پھاند کر سڑک پر آگئے، اور ہاتھ میں ہاتھ اور دل میں دل دئے ہوئے ناچتے گاتے اُس سرزمین کو چلے گئے جہاں محبت کے سوا اور کسی چیز کی حکومت نہیں (وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے پھر کہتا ہے) اُس نے وہ تمام کرتب سیکھ لئے جو مجھے یاد تھے بلکہ کچھ زیادہ بھی۔ ہم دونوں اپنے فن میں بڑے ماہر تھے اور لوگ ہمارے شیدا تھے۔ جلد ہی کچھ اور مغنی بھی ہم سے آملے اور ہم اکٹھے سفر کرنے لگے۔ آہ یہ کتنی زندہ دل ٹولی تھی! ہمارے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ اس زندہ دلی کا انجام بھی کچھ ہوگا۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت

تھی اور اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہ تھا لیکن آخر کار حالات بدل گئے۔ ہماری محبّت فرسودہ ہوگئی۔ یہ ایک قدیم کہانی معلوم ہونے لگی اور ہم میں سے کسی نے بھی اِس کی تجدید کی کوشش نہ کی۔ میں اس کی تجدید کرسکتا تھا لیکن میرے غرور نے اسے گوارا نہ کیا۔ کاش میں اُس کے پاس جاتا اور اُس سے کہتا کہ مجھے معاف کردو! کاش میں اپنا سر اُس کے آگے خم کردیتا اور کہتا کہ میں دیوانہ ہوگیا تھا! اِس کی بجائے میں نے یہ کیا کہ میں ہمیشہ کسی ایسی جگہ چھپ چھپ کر روتا رہا جہاں وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ پھر میں اُس سے بدمزاجی کرتا رہا اور دل میں یہ سمجھتا رہا کہ مجھے کیا پروا ہے کہ وہ میری نسبت کیا خیال کرے گی۔ میرے اِس طرزِ عمل نے اُس کے دل میں سخت نفرت پیدا کردی مجھے معلوم ہے وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اُس نے کئی بار مجھ سے یہ کہا بھی تھا اور میں اتنا مغرور تھا کہ میں نے اُسے اپنا دل کھول کر نہ دکھایا کہ اُس کے کتنے ٹکڑے ہوگئے ہیں۔

ماں۔ (اُس کے پاس جاکر اور ہاتھ اس کے گلے میں ڈال کر) میرے بچے پطرس! تم نے واقعی بڑا دکھ اُٹھایا ہے، میری جان۔

پائیرو۔ اور اب وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوچکی ہے! (وہ اپنا منہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے)

ماں۔ یہ تم کیسے جانتے ہو؟ ممکن ہے وہ بھی تمہاری تلاش کررہی ہو اور تمہارے لئے بیقرار ہو۔

پائیرو۔ نہیں! نہیں! میں نے اُس کے دل سے محبّت کا ایک ایک ذرہ فنا کردیا تھا۔ جب وہ مجھے چھوڑ کر جارہی تھی تو وہ خوش تھی۔ غالباً وہ اب بھی کہیں . . . . اپنے مسرور نغمے گارہی ہوگی، مگر میں . . . . میں

ماں۔ پطرس، اُس کا نام کیا تھا؟

پائیرو۔ اُس کا نام پائیرٹ تھا۔

ماں۔ (اپنی جگہ خوشی سے مُسکرا کر) پائیرٹ؟ کیسا پیارا نام ہے! اور وہ تمہیں پطرس کہا کرتی تھی؟

پائیرو۔ نہیں، وہ مجھے پائیرو کہا کرتی تھی۔

ماں۔ پائیرو! پطرس سے اِس نام کو کتنی مناسبت ہے، اور تمہارے لئے موزوں بھی کتنا ہے[1]!

پائیرو۔ اب میں کبھی یہ نام نہیں سنوں گا۔

ماں۔ اتنے مایوس نہ ہو۔ ممکن ہے وہ تمہیں مل جائے لیکن اِس وقت، پطرس! بہتر ہے کہ تم سو رہو صبح جب تم اچھی طرح نیند کرکے اٹھو گے تو تمہارا یہ سب غم کافور ہو جائے گا۔

پائیرو۔ اچھا اماں۔ مجھے کچھ نیند بھی آرہی ہے۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔

ماں۔ آؤ پھر، اب تو بہت دیر ہو رہی ہے۔

[1] پائیرو اُس خانہ بدوش مُغنّی کو کہتے ہیں جس کا چہرہ رنگا ہوا ہو اور سفید لباس میں ملبوس ہو۔

پائیرو۔ کیا مجھے اوپر اپنے قدیم بستر میں سونا ہے؟

ماں۔ نہیں پطرس۔ وہ اِس وقت تیار نہیں ہے۔ آج رات تم یہیں سو رہو (وہ انگیٹھی سے ایک بتی اُٹھاتی ہے اور پائیرو کے آگے آگے دائیں جانب کے دروازے کی طرف روانہ ہوتی ہے)

پائیرو۔ لیکن یہ تو تمہارا کمرہ ہے۔

ماں۔ پھر کیا ہے۔ تم میرا فکر نہ کرو۔ جس طرح میں کہتی ہوں تم اُس طرح کرو۔

پائیرو۔ جیسے تم کہو، امّی۔ آہ کتنی نیند آرہی ہے! (اُس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے)

ماں۔ (دروازہ کھول کر) یہ دیکھو، سب سامان تمہارے لئے تیار ہے۔ شب بخیر، پطرس۔

پائیرو۔ (اندر سے) شب بخیر، امّی۔

(وہ دروازہ بند کر دیتی ہے، اور ایک لمحے تک کھڑی اُس کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر آگ کے پاس آتی ہے۔ سرخ کوئلوں کو راکھ میں سے کرید کر آرام کرسی میں بیٹھ جاتی ہے۔ اور دوبارہ بُننے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُونگھنے لگتی ہے۔ آگ بجھنی شروع ہوتی ہے بڑھیا سو جاتی ہے۔

یکایک کہیں سے مگر گھر کے باہر سے موسیقی کی دلکش آوازیں آنی شروع ہوتی ہیں۔ ابتدا میں یہ آوازیں دھیمی ہوتی ہیں اور کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، لیکن رفتہ رفتہ قریب آتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کمرہ اُن کے شور سے بھر جاتا ہے۔ ہوا میں ایک سحر پیدا ہو جاتا ہے موسیقی کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

زینے کے سر پر ایک از سرتا پا سفید صورت نظر آتی ہے۔ یہ پائیرٹ ہے، جس کی ہیئت تبدیل ہو چکی ہے۔ وہ شگفتگی اور لطافت کا ایک خواب معلوم ہو رہی ہے۔ اُس کے کان موسیقی پر لگے ہیں، اور وہ نہایت سبک رفتار کے ساتھ نصف سیڑھیاں طے کر جاتی ہے، جہاں آ کر وہ ٹھہر جاتی ہے اور منتظر نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ہے۔

بائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور اس میں سے پائیرو کا سر ظاہر ہوتا ہے پھر وہ بالکل سامنے آجاتا ہے۔ اُس کی ہیئت بھی بدل چکی ہے چیتھڑوں کے بجائے اب اُس کے بدن پر بھی سفید لباس ہے۔ اُس کی نظر پائیرٹ پر پڑتی ہے اور اُسی لمحہ پائیرٹ کی نظر اُس پر پڑتی ہے۔ دونوں حیران و ششدر رہ جاتے ہیں)

پائیرو۔ (متحیّر سرگوشی کی آواز میں) پائیرٹ!

پائیرٹ۔ (اسی لہجے میں) پائیرو!

(موسیقی جاری ہے لیکن اُس کے سُر بہت دھیمے ہو چکے ہیں۔ پائیرو دوڑ کر سیڑھیوں کے نیچے جا کھڑا ہوتا ہے، اور اوپر پائیرٹ کی طرف دیکھتا ہے جس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں)

پائیرو۔ تم مجھے بلا رہی تھیں ؟
پائیرٹ۔ میں سمجھی تم مجھے بلا رہے تھے۔
پائیرو۔ ابھی میں نے تمہاری آواز سنی تھی۔
پائیرٹ۔ میں خواب دیکھ رہی تھی اور تمہاری آواز نے مجھے جگا دیا۔
پائیرو۔ نیچے آ جاؤ، پیاری۔ میں تمہیں دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔
پائیرٹ۔ او پائیرو! میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔
پائیرو۔ نیچے آؤ، پیاری!
پائیرٹ۔ ہش۔ ش ش! (وہ اپنی انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتی ہے اور نیچے اتر کر اس کی آغوش میں چلی جاتی ہے)
پائیرو۔ مجھے چھوڑ کر تم کہاں چلی گئی تھیں ؟
پائیرٹ۔ آہ میں نے تمہاری تلاش میں ایک دنیا چھان ماری۔ لیکن تمہیں یاد ہے تم نے مجھے چھوڑا تھا۔
پائیرو۔ اچھا! میں سمجھتا تھا تم نے چھوڑا تھا۔
پائیرٹ۔ ہم دونوں کو مغالطہ ہوا۔ ہم دونوں چھوڑ گئے تھے۔
پائیرو۔ اور اب ہم دونوں واپس آ گئے ہیں۔
پائیرٹ۔ ہم بھول جائیں گے کہ ہم جدا ہوئے تھے۔
پائیرو۔ کیا تمہیں اب تک مجھ سے محبت ہے ؟
پائیرٹ۔ پہلے سے زیادہ۔
پائیرو۔ اور اسی طرح میری محبت بھی تمہارے لئے پہلے سے بہت زیادہ ہے۔
پائیرٹ۔ کیوں ؟
پائیرو۔ کیونکہ میں نے تمہیں کھو دیا تھا۔
پائیرٹ۔ مگر میری محبت کی وجہ یہ نہیں ہے۔
پائیرو۔ وہ کیا ہے ؟
پائیرٹ۔ کیونکہ میں نے تمہیں پا لیا ہے
پائیرو۔ کھونا، پانا، پانا کھونا ایک ہی بات ہے۔ کھونے اور پانے ہی میں محبت کی زندگی ہے۔
پائیرٹ۔ تم یہاں کیسے آ گئے ؟

پائیرو۔ یہ کسی زمانے میں میرا گھر تھا۔
پائیرٹ۔ (دوسری طرف دیکھتے ہوئے) تمہارا گھر؟ پھر یہ بیگم . . . .
پائیرو۔ میری ماں ہے۔
پائیرٹ۔ اوہ پائیرو، مجھے تو یہ معلوم ہی نہ تھا۔
(موسیقی رُک جاتی ہے۔ وہ ماں کی طرف دیکھتے ہیں)
پائیرو۔ یہ بڑی ہی مہربان ماں ہے اور میں نے اس سے بڑی ہی بے رُخی برتی ہے (یکا یک)
پائیرٹ، ہم اماں کے ساتھ یہیں رہیں؟
پائیرٹ۔ ہمیشہ یہیں رہیں؟
پائیرو۔ ہاں، اماں کے ساتھ۔ یہاں رہیں جہاں ہر طرف امن اور سکوت ہے، اور ظلم اور حماقت نام کو نہیں۔
پائیرٹ۔ وہ ہم سے بڑی محبت کرے گی، اور ہم اُس کی خدمت کریں گے۔ اور شام کے وقت ہم سب مل کر آگ کے سامنے بیٹھا کریں گے اور . . . .
پائیرو۔ کیتلی میں چائے پک رہی ہوگی، اور پاس . . . . . .
پائیرٹ۔ بہت سے نارنجی کیک پڑے رہا کریں گے . . . . . .
پائیرو۔ ہاں ہاں، بہشت سے اترے ہوئے نارنجی کیک!
پائیرٹ۔ اور نرم نرم پروں والے گرم بستر سونے کو!
پائیرو۔ پائیرٹ ہم یہیں رہ جائیں؟
(وہ اُس کا ہاتھ مستفسرانہ انداز میں پکڑ لیتا ہے، اور وہ دونوں خوش ہو کر مسکراتے ہیں لیکن موسیقی پھر شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک جادو ہے، دل کو موہ لینے والا جادو۔ یہ اُن کے تصورات کو اِس پُرامن و سکون مقام سے کھینچ کر کہیں دُور لے جاتا ہے۔ اُن کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں اور اُن کے جسم موسیقی کی رَو میں بہنے لگتے ہیں)
پائیرٹ (بائیں طرف رقص کرتے ہوئے) کیا تمہیں وہ طویل سڑک یاد ہے جو ایک پہاڑی کے گرد پیچ و خم کھاتی ہوئی اُس شہر کو چلی گئی ہے جہاں شام کے وقت دھیمی دھیمی بتیاں روشن ہو کر ستاروں کی طرح ٹمٹماتی ہیں؟
پائیرو۔ (اُس کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے) کیا تمہیں سمندر کے کنارے وہ مقام یاد ہے جہاں ریشمی سائبانوں میں سے موسیقی کی تانیں اُٹھتی تھیں اور چاندنی رات کے سنہری پانیوں پر سوار ہو کر خدا جانے کہاں چلی گئی تھیں؟
پائیرٹ۔ (تیز تر حرکات اور بڑھتے ہوئے جوش کے ساتھ) مجھے وہ پُر رونق بازار اب تک یاد ہے جہاں

ایک دوپہر کو ہزاروں چمکتے ہوئے چہرے ہماری نظروں کے سامنے سے گزر گئے تھے اور جہاں لوگوں کے مختلف الالوان لباسوں سے ایک موجِ رنگ پیدا ہو گئی تھی!

پائیرو۔ (پُرجوش انداز میں) مجھے ہزاروں آوازوں کا وہ نشاط انگیز شوروغل ابھی تک یاد ہے جب گھُپ اندھیرے میں نیلے اور پیلے رنگ کے آسمانی گولے فضا میں چھوڑے جا رہے تھے!

(موسیقی تیز تر اور بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ اُس میں ایک کیفِ نشاط پیدا ہو جاتا ہے)

پائیرٹ۔ اور رقص میں میں کس طرح چکر کھاتی گئی، کھاتی گئی، کھاتی گئی، یہاں تک کہ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے آسمان نیچے گر رہا ہے . . . . . . گر رہا ہے . . . .

پائیرو۔ اور میں نے کس طرح گایا کہ میری رُوح اُڑ کر تاروں سے جا ملی، جو آسمان کی بساط پر رقص کر رہے تھے، ناچ رہے تھے . . . .

پائیرٹ۔ پائیرو! موسیقی ہم کو بُلا رہی ہے!

پائیرو۔ (مخمور ہو کر) ہاں بُلا رہی ہے، پائیرٹ، اور ہم جواب دے رہے ہیں!

(وہ اُسے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ چٹخنی اُٹھا کر دروازہ کھولتا ہے اور اُسے نیچے رکھ دیتا ہے۔ تھوڑی دیر وہ تامل کرتے ہیں اور مڑ کر ماں کی طرف ایک نگاہ ڈالتے ہیں، جو چُپ چاپ سو رہی ہے۔ پائیرو دوڑ کر واپس جاتا ہے اور اُس کے بالوں کو آہستہ سے ایک بوسہ دیتا ہے۔ وہ دروازے میں واپس آ جاتا ہے تو پائیرٹ ماں کے پاس جا کر اُس کا تتبع کرتی ہے۔ پھر وہ دوڑ کر پائیرو کی آغوش میں آ جاتی ہے۔ موسیقی کی آواز دُور بہت دُور گم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے)

پائیرو۔ (ہاتھ کی ایک محبت آمیز حرکت سے) خدا حافظ، پیارے گھر!

پائیرٹ۔ خدا حافظ، پروں کے نرم نرم بستر!

پائیرو۔ خدا حافظ، نارنجی کیکو!

(وہ یکایک دروازہ بند کر کے اور پائیرٹ کو ساتھ لے کر باہر نکل آتا ہے)

ترجمہ — منصور احمد

———

میگھ ملہار

لاگ اساڑھ چلی پُرُوّیا[1] بھورے بَدرا چھائے

(۱)

کرے کُلیل بچھیرا بَن میں، گوالا شور مچائے

جھیل کنارے بگلا ڈولے، سارس دوڑ لگائے

چھائیں مائیں کھیلیں بالک گورا ڈھول بجائے

بوندا برسیں ہوا چلے اور بِرچھ جھکولے کھائے

لاگ اساڑھ چلی پُرُوّیا بھورے بدرا چھائے

(۲)

چمک چمک بج[2] پلکیں مارے، میگھ[3] گھور آدھائے

ٹھنڈ لگے دِینہانَن کلپنے، سکھی اَساڑھ جوڑائے

---

[1] پُرُوّیا ۔ پُروا ہوا ۔ بادِ صبا

[2] بج یعنی بجلی ۔ [3] میگھ یعنی بادل

ٹھنڈے ٹھنڈے بوند گریں ہرواہا تان لگائے

شیام بنا سونی ہے برکھا ہردے کچھو نہ بھائے

لاگ اساڑھ چلی پروا بھورے بدرا چھائے

(۳)

راج باغ میں پڑا ہنڈولا سب کوئی جھولن جائے

دھیرے دھیرے جھولے کوئی، کوئی پینگ لگائے

کوئی ہنسے کوئی چھیڑ کرے، اور کوئی کجلی گائے

جیا للچاوے شیام بنا کچھو میگھ ملہار نہ بھائے

لاگ اساڑھ چلی پروا بھورے بدرا چھائے

سید مقبول حسین
(احمد پوری)

۵۵ کسان

قرونِ وسطیٰ

میں

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

اس عنوان سے "اسلامک کلچر" کے جولائی ۱۹۲۷ء نمبر میں ایس خدا بخش کے قلم سے یہ آرٹیکل شائع ہوا تھا، ذیل کا مضمون اسی کی تلخیص ہے۔

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے، اسلامی تاریخ کی اہمیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان تخیلات کے اثرات و نتائج پر غور کیا جائے، جن کے ذریعہ سے اسلام نے صدیوں تک ایشیا، افریقہ، اور مغربی یورپ کی مختلف قوموں کو باوجود ان کے سیاسی اور مذہبی اختلافات کے باہم متحد کر رکھا تھا، اس حیرت انگیز اتحاد اور شیرازہ بندی کا راز صرف مسلمانوں کے طرزِ تعلیم میں پنہاں تھا، جو دو درجوں پر مشتمل تھی ایک ابتدائی مدارس اور دوسرے اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں، لیکن دونوں جگہ موجودہ زمانے کے نظامِ تعلیم کے برخلاف نہ تو حکومت کو کوئی دخل و اختیار تھا اور نہ قواعد و ضوابط کی سختیاں تھیں، بلکہ پورا نظام صرف غیر سرکاری سعی و عمل پر قائم تھا، اور اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا قدیم نظامِ تعلیم درس و تدریس کی آزادی کا ایک شاندار نمونہ تھا۔

درس و تدریس کا یہ ذوق و شوق زیادہ تر مذہب سے وابستہ تھا، موجودہ تعلیمِ مدارس کی قیدیں اس وقت ناپید تھیں، قرآن مجید نے قوموں پر جو روحانی اثر ڈالا تھا، اس نے بلا کسی خارجی دباؤ کے ان میں تحصیلِ علم کی تحریک پیدا کر دی تھی جو خود بخود رفتہ رفتہ تمام دنیائے اسلام میں پھیل گئی،

ابتدائی مدارس بلا کسی قسم کے بالائی جبر و اثر کے خود بخود قائم ہو گئے تھے، زمانہ مابعد ہی میں صرف یہ حالت نہ تھی کہ ہر گاؤں میں یا ہر مسجد سے متعلق ایک مدرسہ موجود تھا، بلکہ ابتدائی دور میں بھی اس طرح کے تعلیمی انتظامات موجود تھے، جن کی نگرانی خود عوام کے ہاتھ میں تھی چنانچہ حکومتِ عباسیہ کے بانی ابو مسلم نے خراسان کے اسی قسم کے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، دوسری صدی کے آخر میں ایران میں ایک مدرسہ موجود تھا جہاں بلا کسی سرکاری مداخلت کے بچوں کی باضابطہ حاضری کی پابندی کی جاتی تھی، ان مکاتب کے فیضِ تعلیم سے غربا بھی مستفید ہوتے تھے یہاں تک

کہ اکثر غلام بچپے بھی حلقۂ درس میں داخل کر لئے جاتے تھے، متعدد ممالک میں جیسا کہ سعدی کی گلستاں سے ظاہر ہوتا ہے۔ لڑکوں کے ساتھ ساتھ اکثر لڑکیاں بھی تعلیم پاتی تھیں۔

ان ابتدائی مدارس میں زیادہ تر قرآن خوانی کی تعلیم ہوتی تھی تاکہ لوگ اپنے مذہبی فرائض کو احکامِ شریعت کے مطابق انجام دے سکیں، لیکن رفتہ رفتہ نصابِ تعلیم میں علوم صرف و نحو بھی شامل کر لئے گئے، جس کی وجہ سے مذہبی اثر بہت زیادہ محدود ہو گیا لیکن اعلیٰ تعلیم کی درسگاہوں میں یہ اثر اور زیادہ قوی ہو گیا"

اعلیٰ تعلیم ابتداءً فقہ تک محدود تھی جس کے اصول و آئین قرآن مجید اور احادیث وغیرہ سے مستنبط کئے گئے تھے، اس فن سے اس قدر شغف اور دلچسپی کا اظہار کیا گیا کہ اور علوم نظر انداز ہو گئے، چنانچہ آٹھویں صدی کے ایک مسلّم الثبوت استادِ فن نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر فقہ کے مقابلہ میں جو روح اور دماغ کے لئے صحت بخش ہے کسی فن کا نام لیا جا سکتا ہے، تو وہ صرف علمِ طب ہے، جو جسمِ انسانی کو صحیح اور تندرست رکھتا ہے بقیہ فنون بالکل لغو ہیں۔

لیکن اس قسم کی تنگ نظری اور کوتہ خیالی علوم کی رفتارِ ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی تھی چنانچہ رفتہ رفتہ علم اللسان اور دیگر علوم کی تحصیل و سرپرستی کی طرف اکثر اربابِ فن کی توجہ مبذول ہوئی۔ اگرچہ اب بھی علومِ مذہبی کا اقتدار قائم رہا، یہ کہنا انصاف سے بعید ہو گا کہ مذہب نے نقطۂ نظر کو محدود کر دیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں میں تحصیلِ علم درس و تدریس، اور آزادئ خیال کی جو غیر معمولی عالمگیر تحریک پیدا ہو گئی تھی، وہ زیادہ تر مذہب ہی کے جوش و اثر کا نتیجۂ عمل تھی،

ابتدا ہی سے اعلیٰ تعلیم کے اغراض کے لئے مسجدوں سے کام لیا جاتا تھا بخلاف عیسائیوں کے مسجد مسلمانوں کے لئے صرف عبادت گاہ نہ تھی، بلکہ دیگر امورِ خیر کے لئے بھی مستعمل تھی، غریب مسافر اس میں ٹھہرتے تھے، بیماروں کے لئے شفاخانہ کا کام دیتی تھی، اکثر اس سے عدالت گاہ کا کام لیا جاتا تھا، عبادت کے بعد علم سب سے زیادہ مقدس چیز سمجھا جاتا تھا، اس بنا پر اسلامی مساجد کے دروازے علمی بحث و ذکر کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ علمِ فقہ کی غیر معمولی اشاعت و ترقی نے اور بہت سے ایسے مباحث کے لئے دروازہ کھول دیا تھا جن کو مذہب سے تعلق نہ تھا، چنانچہ حریری نے جو مغرب میں بہت زیادہ مشہور ہے، بصرہ کی ایک مسجد میں فنِ شاعری پر اکثر خطبے دئے۔

اس سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو جو خطبوں کے ذریعہ سے دی جاتی تھی، نہ صرف علمی درسگاہوں کے قیام سے، بلکہ مذہب کی فیاضانہ امداد اور ہمدردی کی وجہ سے کس قدر اشاعت اور ترقی ہوئی، اس غرض کے لئے اکثر مسجدوں سے متعلق علیحدہ کمرے ہوتے تھے، جہاں علمی تقریریں ہوتی تھیں، جن سے خاص و عام یکساں مستفید ہوتے تھے کسی کے لئے کوئی ممانعت نہ تھی، اگرچہ رفعِ فساد کی غرض سے اکثر سامعین کا داخلہ خطیب کی مرضی اور اجازت

پر منحصر ہوتا تھا، لیکن اکثر ارباب فن اس قید کو پسند نہیں کرتے تھے، سامعین خطیب کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے، اور جس موضوع پر خطیب چاہتا تھا تقریر کرتا تھا تقریر ختم ہونے پر بحث و تنقید کا سلسلہ شروع ہوتا تھا اور چونکہ اکثر اربابِ فہم اس میں شریک رہتے تھے، اس لئے خطیب کو اپنے موضوع کلام پر پہلے سے غیر معمولی توجہ اور احتیاط کے ساتھ تیار ہونا پڑتا تھا، چونکہ ان درسگاہوں کا تعلق مساجد سے ہوتا تھا، جہاں کسی قسم کی ممانعت نہ تھی، اس لئے تحصیل علم کا ذوق عام ہوگیا، لیکن اسلام نے اس میں اپنی ایک خاص خصوصیت کا اضافہ کیا، یعنی تنوع اور وسعت جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔

مسلمانوں میں سیر و سیاحت کا ایک عام ذوق تھا جس کی وجہ سے مشہور درسگاہوں میں مختلف ممالک کے طالبانِ علم کا مجمع رہتا تھا، علم و فن کی تحقیق و جستجو میں لوگ دور و دراز ملکوں کا سفر کرتے تھے، اس علمی جدوجہد کی تحریک میں مذہب کو خاص دخل تھا، حج کے فرض ہونے کی وجہ سے مکۂ معظمہ میں مشتاقانِ علم اور اکثر اربابِ فن دور و دراز ملکوں سے جمع ہوتے تھے، اور بغداد، دمشق، مصر وغیرہ کی درسگاہوں کی سیر کرتے تھے اور وہاں کی علمی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے تھے، اس علمی سیر و سیاحت میں فنِ حدیث کے ذوقِ تحصیل نے خاص تحریک پیدا کی، احادیث کی تحقیق و جستجو میں اربابِ فن نہایت دشوار مسافتیں طے کرتے تھے، چنانچہ امام بخاری نے اسی غرض سے ترکستان، بغداد، عرب، مصر شام وغیرہ کا سفر کیا، اور سولہ سال کے سفر اور تلاش و کاوش کے بعد ساٹھ ہزار حدیثیں جمع کیں، اسی طور پر ابوالقاسم نے نے تیرہ سو حدیثوں کی مختلف وسائل سے تحقیق کی، ان واقعات سے کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی تحقیقات کے لئے سیر و سیاحت کا جوش کس حد تک موجود تھا۔

ادبی اور علمی تحقیقات کے لئے بھی سیر و سیاحت کا جوش ابتداءً مذہبی اغراض سے وابستہ تھا، قرآن مجید نے حجاز کی زبان کو عربوں کی مستند زبان بنا دیا تھا، اس بنا پر قدیم فقہائے علم اللسان حتی الوسع اس کی کوشش کرتے تھے کہ بدوؤں سے راہ و رسم پیدا کریں، ان کے گیت اور اشعار کو یاد کریں، اُن کی تقریریں سنیں اور ان کے محاوروں کی امتیازی خصوصیات سے واقفیت پیدا کریں، ہندوستان سے بھی اس قسم کے پرستارانِ علم آتے تھے، اِن ساکنانِ صحرا کے ساتھ رہنے کا شوق اس قدر غالب تھا کہ ان کے لوٹ مار کے حملے خوش نصیبی کی دلیل سمجھے جاتے تھے چنانچہ جب مشہور فقیہ علم اللسان اظہری کو کسی سفر کے دوران میں بدوؤں نے گرفتار کرلیا، تو اس پر وہ نہایت خوش ہوا کہ اسی حیلے سے کچھ روز ان کی صحبتوں سے ادبی استفادہ اٹھانے کا موقع ملے گا، زمانۂ مابعد میں بھی یہ ذوقِ سفر مذہبی خیال سے وابستہ رہا کیونکہ بجز قرآن مجید کے اور کوئی چیز عرب کو اس قسم کی سیر و سیاحت کا مرکز نہیں بنا سکتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ بدوؤں کے علم ادب کے مطالعہ کا ایک مستقل ذوق پیدا ہوگیا، اس قسم کی ادبی تحقیقات نے مسلم طلبہ اور اساتذہ کی زندگی میں سیر و سیاحت کا وہ غیر معمولی جوش پیدا کر دیا تھا جو مسلمانوں کے نظام تعلیم کی ایک نمایاں خصوصیت ہے، سولہ سال کی عمر میں نوجوان طلبہ اپنے

وطن میں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے مزید تحصیل علم کی غرض سے بڑے بڑے شہروں کا عموماً سفر کرتے تھے، اکثر سن رسیدہ اشخاص اور ارباب فن بھی توسیع معلومات کے لئے اس زحمت کو گوارا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض خود اساتذہ تھے، جو دور و دراز ملکوں میں جا کر مشہور علما کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے، اس علمی تحقیق و کاوش اور سیر و سیاحت نے اسلام کے نظام تعلیم میں غیر معمولی تنوع اور وسعت پیدا کر دی، اُس زمانہ میں جدید خیالات کی اشاعت کے لئے علمی رسائل و اخبار کی ضرورت نہ تھی، یہی علمی مسافر تھے، جو ان علمی خطبات کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں پھیلا دیتے تھے، اس طور پر نویں صدی میں بغداد میں یونانی فلسفہ کے مطالعہ نے جو جدید مذہبی اور عقلی مسائل پیدا کر دئے تھے۔ وہ نہایت تیزی کے ساتھ چاروں طرف پھیل گئے۔

ان سفر کردہ علما کے باہمی اختلاط اور راہ و رسم کا ایک فوری اثر یہ ہوا کہ بحث و تنقید کا ایک عام ذوق پیدا ہو گیا، جو اکثر یاوہ گوئی کی حد تک پہنچ جاتا تھا، بعض اوقات کشت و خون کی نوبت آجاتی تھی، اور ایک فریق دوسرے فریق کی اہانت اور دلآزاری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا تھا، چنانچہ حنبلیوں یعنی پیروان امام حنبل کی مذہبی سختی اور تقشف کی بدولت گیارھویں صدی تک بغداد میں اکثر معرکۂ کارزار خون سے رنگین ہو جاتا تھا، یہ واقعات اگرچہ اسلام کے نظام تعلیم کے دامنِ آزادی کے بدنما داغ ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اسلامی علوم و فنون کے ائمۂ ثلاثہ حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی نے باوجود اپنے شدید علمی اختلافات کے معقول پسندی اور سلامت روی کی ایک نہایت شاندار مثال پیش کی، یہ فرقے اگرچہ ہمیشہ حریفانہ جوش سے لبریز رہتے تھے، لیکن متانت اور سنجیدگی کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا تھا، ہر فریق کی یہ کوشش ہوتی تھی، کہ وہ بحث و استدلال کی قوت سے دوسری جماعت کے باثر علمائے فن کو اپنا ہم آہنگ اور حامی بنائے، چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر فریق کو اپنے دلائل و براہین کے ساتھ ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا، تاکہ شکست کی ذلت برداشت نہ کرنی پڑے، اس قسم کے علمی مناظروں اور بحث آرائیوں کی وجہ سے قوتِ حافظہ کو خاص ترقی ہوئی، اور لوگوں کو علمی معلومات کے زبانی حفظ کرنے کا شوق پیدا ہو گیا، لیکن اس شوق کی وجہ یہ نہیں ہو سکتی، کہ اس زمانہ میں کتابوں کی کمی تھی، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو زمانہ مابعد میں اس میں تنزل آجاتا، کتابوں کی کبھی کمی نہ تھی، چنانچہ پہلی صدی ہجری میں بھی اکثر واقعات ایسے ملتے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے، کہ کتابوں کا کافی ذخیرہ موجود تھا،

مسجدوں اور مدرسوں سے متعلق کتب خانے بھی تھے، جن میں سے اکثر تعداد کتب کی کثرت کی وجہ سے بہت زیادہ مشہور تھے، ان علمی خزائن کا وجود زیادہ تر علم پرست اصحاب کی فیاضی اور سرپرستی پر منحصر تھا، ابن حاجب النعمان کے پاس نہایت شاندار کتب خانہ تھا، خلیل بغدادی نے اپنی تمام کتابوں کو مسلمانوں کے حق میں وقف کر دیا تھا، الواقدی جو نویں صدی میں گذرا ہے، اس کا اتنا بڑا کتب خانہ تھا کہ ۱۲۰ اونٹوں پر کتابیں بار کی جاتی تھیں، فتح بن خاقان نے بھی ایک شاندار کتب خانہ

قائم کیا تھا، غرض اسلامی ممالک میں کتابوں کی کوئی کمی نہ تھی، لیکن باوجود اس کے علمی مناظروں اور بحث آرائیوں میں امتیاز اور کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے لوگ زیادہ تر قوتِ حافظہ پر اعتماد کرتے تھے۔

قوتِ حافظہ کی تربیت کا یہ ذوق دراصل اسلامی نظامِ تعلیم کی آزادی اور عمومیت کا نتیجہ تھا، جس طرح معلم کا حلقۂ درس ہر خاص و عام کے لئے کھلا رہتا تھا، اسی طرح معلم کے لئے بھی کوئی قید نہ تھی، چنانچہ ہر ممتاز مسلمان جس کو اپنی قابلیت پر اعتماد ہوتا تھا بحیثیت مدرس کے منبر پر کھڑے ہونے کا حق رکھتا تھا، حکومت کو ان خطیبوں اور معلموں کے انتخاب و تقرر میں گیارھویں صدی تک جب کہ باضابطہ مدارس قائم ہوئے، کوئی دخل نہ تھا، اور نہ موجودہ طرزِ امتحان کا کوئی رواج تھا، غلاموں تک کے لئے بھی تعلیم و تعلم کی کوئی قید نہ تھی۔

کتابوں کے استعمال و استفادہ کے متعلق یہ قاعدہ تھا، کہ کوئی شخص بلا مصنف کی تحریری اجازت کے اس کی تصنیف سے خطبہ دیتے وقت کام نہیں لے سکتا تھا، مصنف کی وفات کے بعد بھی اس کے ورثا سے اجازت لینی پڑتی تھی، خطبات کے متعلق بھی یہی قید تھی، اس قید سے دو فائدے تھے، ایک تو مصنف کے حقوق کا تحفظ اور دوسرے جس کو اجازت ملتی تھی اس کی اہلیت کی سند ہوتی تھی۔

باضابطہ مدارس کے قیام کے بعد اگرچہ بانیوں اور ان کے اہلِ خاندان کو معلموں کے تقرر اور موقوفی کا اختیار حاصل تھا، لیکن طریقۂ تعلیم اور انتخابِ مضامین میں اساتذہ کو کامل آزادی حاصل تھی، حکومت صرف اسی وقت مداخلت کرتی تھی، جب مذہب کو کسی قسم کا صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا تھا، اس طور پر ایک بڑی حد تک اسلام کے نظامِ تعلیم میں تنوع اور وسعت پیدا ہو گئی تھی، لیکن یہ آزادی محض بے راہ روی نہ تھی۔

اس نظام کی خاص خصوصیات یہ تھیں، درس و تدریس کے اوقات کے متعلق کوئی مستقل قاعدہ نہ تھا، یہ صرف خطیب کی خواہش اور مرضی پر منحصر تھا، کچھ روزانہ خطبہ دیتے تھے اور دوسرے ہفتہ میں ایک بار خصوصاً دوشنبہ کے دن نماز کے وقت خطبہ بند کر دیا جاتا تھا، سال میں مستقل تعطیلات کا کوئی رواج نہ تھا، تعطیل کا دارومدار خطبات کے اختتام پر تھا یہاں خطیب کو کامل آزادی حاصل تھی وہ عام طور پر خود اپنی یا دوسروں کی تصانیف سے کام لیتا تھا، تجربہ کار خطیبوں کو اپنی درسی کتابیں زبانی یاد رہتی تھیں۔ اس لئے اگر کبھی کتاب لانا بھول جاتے تھے، تو ان کو خطبہ دینے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، خطیب محض تقریر پر اکتفا نہیں کرتا تھا، وہ اس کا اطمینان کر لیتا تھا کہ طلبہ نے اس کے مفہوم کو بخوبی سمجھ لیا ہے یا نہیں، اس غرض کے لئے وہ طلبہ کے ساتھ بحث و سوال کرتا تھا اور ان کو خود سوالات کرنے کی ہمت دلاتا تھا، اکثر معلمین کا یہ دستور تھا کہ بحث و سوال کے وقت اپنی جگہ چھوڑ کر طلبہ کے حلقہ میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ مجمع میں خطیب ہمیشہ سامنے بیٹھتا تھا۔ وہ کسی طالب العلم کو بغیر سوالات کئے ہوئے جانے نہیں دیتا تھا۔ صرف مسجد ہی تک یہ فرض محدود نہ تھا بلکہ اکثر طلبہ کے گھروں پر بھی جا کر ان سے بحث و سوال کرتا تھا، اس طور پر اعلیٰ مدارس کی تعلیم صرف تقریروں کے سننے تک محدود نہ

تھی بلکہ اس کا مقصد طلبہ کی مکمل دماغی تربیت تھا تاکہ ان کو اس خاص فن پر کامل عبور حاصل ہو جائے۔

تعلم و تعلیم کا یہ سلسلہ درسگاہوں سے باہر بھی جاری رہتا تھا۔ طلبہ استاد سے ذاتی تعلقات قائم رکھتے تھے اور اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مشکلات اور شکوک کو رفع کیا کرتے تھے۔ دسویں صدی سے یہ دستور قائم ہو گیا کہ سن رسیدہ اساتذہ طلبہ کی جماعت میں سے جو ممتاز اور قابل ہوتا تھا، اپنی اعانت کے لئے اس کو منتخب کر لیتے تھے جس کو معید کہتے تھے۔

چونکہ استاد مجمع عام میں خطبے دیتا تھا جس میں ہر قسم کے خیال کے لوگ شریک رہتے تھے، اس لئے اس سے مختلف قسم کے سوالات بکثرت ہوتے تھے، جن کا جواب دینا اس کا فرض تھا، ابتدا میں علوم و فنون کی شاخیں ایک دوسرے سے الگ نہ تھیں، اس لئے استاد کو اس بارے میں غیر معمولی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی۔ اگرچہ بعد کو علوم کے مستقل شعبے قائم ہو جانے کی وجہ سے یہ بار گراں کسی قدر ہلکا ہو گیا، تاہم عوام کے ساتھ بحث و مکالمہ اسلام کے نظام تعلیمی کا ایک وقت طلب پہلو تھا۔

چونکہ استاد کسی مستقل نظام کے ماتحت نہ تھا، اس لئے اس کی آمدنی پر اس کا بہت زیادہ اثر پڑتا تھا گیارہویں صدی تک یہ استاد کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ جو ذریعۂ معاش ممکن ہو اس کو اختیار کرے۔ جو لوگ اپنے کو خدمتِ علم کے لئے وقف کر دیتے تھے، وہ یا تو خود خوشحال ہوتے تھے یا مربیانِ فن کی نگاہِ فیض ان پر ہوتی تھی، یا کوئی تجارت کرتے تھے، یا مفتی اور قاضی کے فرائض سر انجام دیتے تھے، آخر الذکر ذریعۂ معاش زیادہ تر وہ لوگ اختیار کرتے تھے جو علمِ فقہ کے معلم تھے۔ پندرہ سال تک امام شافعی نے درسِ فقہ کے ساتھ ساتھ بحیثیت مفتی کے کام کیا، اکثر اساتذہ مثلاً امام الحرمین وغیرہ ایک ہی وقت میں مختلف عہدوں پر مامور تھے۔ ان عہدوں کی آمدنی بعض اوقات بہت زیادہ ہوتی تھی، لیکن جو لوگ زیادہ محتاط اور متقی ہوتے تھے وہ اس قسم کے ذریعۂ معاش کو پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ امام ابو یوسف ایسے اربابِ کمال نے کبھی اس قسم کے عہدوں کی پروا نہیں کی، امام ابو حنیفہ نے عسرت اور تنگی میں زندگی بسر کی لیکن ان کی شانِ خودداری نے بغداد کے اعلیٰ ترین عہدۂ قضا کو قبول کرنا گوارا نہ کیا۔

ماہرینِ علم اللسان کی مالی حالت سب سے بدتر تھی، کیونکہ ان کو کسی سرکاری عہدے کے ملنے کی مشکل سے توقع ہو سکتی تھی، معدودے چند مستثنیات میں سب سے مشہور ابو تمام جامع حماسہ کی ذات تھی، جو موصل کا گورنر مقرر ہوا تھا، اس لئے جو لوگ علم اللسان اور علمِ ادب کی خدمت کرنا چاہتے تھے، ان کو اپنے کسبِ معاش کے لئے دیگر وسائل سے کام لینا پڑتا تھا، لیکن شاعری اور خصوصاً مدحیہ نظمیں کسبِ معاش کا بہترین ذریعہ تھیں، اسلامی فرمانرواؤں میں بہت کم ایسے تھے، جن کی سرپرستی میں کوئی شاعر نہ رہتا ہو، دسویں صدی تک خلفا کا دربار سخن گو ماہرینِ علم اللسان سے بھرا رہتا تھا، جو ہر طرح کے شاہانہ عنایات و انعامات سے فیض یاب ہوتے تھے، چونکہ ان لوگوں کا قیام بادشاہ کی

خوشی پر منحصر تھا جس کے لئے خوشامد و تملق اور مدح سرائی کی ضرورت تھی، اس لئے ان کی زندگی میں پستی اور ابتذال آگیا تھا، لیکن اس کا نتیجہ اتنا ضرور ہوا کہ افسانوں اور مختلف قسم کے شعرا کے کلام کے انتخابات کا ایک معتدبہ ذخیرہ عالم وجود میں آگیا۔

البتہ ان فقہائے علم اللسان کی حیثیت زیادہ معزز اور وقیع تھی جن کے سپرد شہزادوں کی تعلیم ہوتی تھی، جیسا کہ مشرق میں عباسیوں کے اور اندلس میں بنو امیہ کے درباروں میں عام دستور تھا، اس کے علاوہ ایک اور ذریعہ تھا، جس سے اساتذہ اور علمائے فن کو کسی حد تک مدد ملتی تھی، وزرا و حکومت کے قبضہ میں ایک مستقل سرمایہ رہتا تھا جس سے وہ ارباب علم و فن کی امداد کیا کرتے تھے، لیکن اس میں ذلت اور ابتذال کا شائبہ تھا اور جو کچھ ان علما کو ملتا تھا اس کی مقدار نہایت کم ہوتی تھی، چنانچہ مشہور مصنف ترمذی کو صرف چار درہم ماہوار ملتے تھے۔

استادوں کی یہ قلیل تنخواہ ان مدارس میں بھی قائم رہی جو گیارھویں صدی میں قائم ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ اکثر اساتذہ نے تقرر کے بعد فوراً ہی استعفا دے دیا اور جو لوگ رہ گئے تھے وہ کسی اور ذریعہ سے کسب معاش کرتے تھے، جس طرح ان مدارس نے نظام تعلیم کے عام اصول و آئین میں کوئی تغیر پیدا نہیں کیا، اسی طرح ان کی زندگی کی ابتدائی صدیوں میں اساتذہ کی تنخواہ کے متعلق کوئی معتدبہ مالی ترقی نہیں ہوئی۔

بہر حال ان مدارس کے وجود نے فقہائے علم اللسان کی مالی حالت کو کوئی ترقی نہیں دی، کیونکہ بڑے بڑے مدرسوں مثلاً نظامیہ بغداد میں بھی اس فن کے لئے صرف ایک جگہ تھی لیکن اس پر بھی قلت تنخواہ کی شکایت تھی۔

صرف ایک قسم کے اساتذہ کسب معاش کی فکر سے آزاد تھے یعنی وہ لوگ جو نوجوان طلبہ کو اپنے ساتھ رکھ کر پورے طور پر ان کی تعلیم کی نگرانی کرتے تھے، جو شخص اپنے بیٹے کو استاد کے سپرد کر دیتا تھا، وہ اس کے خور و نوش کا ذمہ دار ہوتا تھا، شاگرد استاد کی ہر طرح کی خدمت کرتا تھا، بازار سے ضروری چیزیں خرید کر لاتا تھا، یہاں تک کہ استاد کے لئے کھانا بھی پکاتا تھا، ان طلبہ میں سے جو سب سے زیادہ قابل ہوتا تھا، بعض اوقات استاد اس سے اپنی بیٹی کا عقد بھی کر دیتا تھا،

قدیم زمانہ میں طلبہ کی کفالت اور پرورش کا سامان نہایت کم تھا، عموماً اہل خاندان ان کے مصارف کے ذمہ دار ہوتے تھے، اس لئے اکثر طلبہ خوشحال اور دولتمند خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مدارس کے آغاز و قیام ہی کے زمانہ سے طلبہ کی اقامت کا سامان ہو گیا تھا، لیکن تیرہویں صدی کے بعد اس قسم کا انتظام یقینی طور پر موجود تھا، استادوں کی تنخواہ کی ترقی کے ساتھ طلبہ کے سامان قیام و طعام میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا، مغل اور ترکی نسل کے بادشاہوں نے علاوہ شاہی عطیات کے بہت سے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں مرنے کے بعد بھی خادمان علم و فن کے لئے ان کا سرچشمۂ فیض و کرم جاری رہا، کیونکہ سلاطین و وزرا کے مزاروں

پر قرآن خوانوں کے لئے گراں بہا جائدادیں وقف تھیں، جن کے محاصل سے نوجوان طلبہ اور اساتذہ بہت زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔

قدیم زمانہ میں اساتذہ کی غیر معمولی قدر و عزت تھی، لوگ عموماً جھک کر سلام کرتے تھے، اکثر ان کے جلو میں چلتے تھے، اور جب استاد خچر یا گھوڑے پر سوار ہوتا تھا تو اس کی رکاب تھام لیتے تھے، کوئی استاد مرجاتا تھا تو تمام شہر اس کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوتا تھا، چنانچہ جب ۴۷۸ھ میں نیشاپور میں امام الحرمین کا انتقال ہوا تو نہ صرف شعرا نے ان کی تعریف میں زمزمہ سنجیاں کیں، بلکہ تمام تاجروں نے اپنی دکانیں بند کر دیں، مسجد کا منبر ڈھا کر گرا دیا گیا اور شاگردوں نے اپنے قلم اور دواتیں توڑ ڈالیں۔

اس زمانہ کے اہل علم کا لباس بھی خاص ہوتا تھا، یہ ایجاد امام ابو یوسف نے کی تھی، رفتہ رفتہ ہر فن کے علما کا لباس علیحدہ ہوگیا، جس سے یہ پتہ چل جاتا تھا کہ فلاں شخص فلاں فن کا عالم ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ زمانہ مابعد میں ترکی حکومت کے حدود کے اندر علوم و فنون کو بہت کچھ ترقی ہوئی اور سلاطین نے ارباب علم و فن کی سرپرستی میں بہت زیادہ فیاضی اور دریا دلی سے کام لیا، لیکن باوجود اس شان و شوکت اور تزک و احتشام کے علم و تہذیب کی وہ بہار دوبارہ زندہ نہ ہوسکی، جس نے نویں، دسویں اور گیارھویں صدی میں دنیائے اسلام کو مختلف قسم کی رنگینوں سے معمور کر دیا تھا"

فردِ مستثنیٰ

مرزا احسان احمد بی اے ایل ایل بی

نظروں سے نہاں ہے سر سید
ہیں پیش نظر اکثر سید

زردار نہ تھا سر سید بھی ! رکھتے نہیں مال و زر سید
تھا شر سے جدا سر سید بھی کرتے نہیں شور و شر سید
تحقیق ہوئی سر سید سے سردار بنے کیونکر سید
تصدیق ہوئی سر سید سے کس طرح بنے رہبر سید
تھا جانِ وفا سر سید بھی ہوتے ہیں وفا پرور سید
تھا کانِ سخا سر سید بھی ہوتے ہیں کرم گستر سید

اس پر بھی جہاں میں ہر سید
کہلا نہیں سکتا سر سید

سید منظور علی
(حیدرآباد دکن)

کیفِ تصوّر

شبِ سیاہ کی مانند زندگانی ہے — مرے لبوں پہ محبّت کی اک کہانی ہے

تمہاری یاد مری رُوح کی ہے سرمستی — تمہارا ذکر مرے دل کی شادمانی ہے

یہ میرا سینۂ تاریک جگمگا اٹھا — تمہاری شمعِ محبت کی ضوفشانی ہے

تمہارا پیکرِ رنگیں ہے سامنے میرے — یہ میری چشمِ تصور کی کامرانی ہے

تمہارا جلوۂ سرشار ہے نشاط انگیز — مری رگوں میں رواں موجِ ارغوانی ہے

وہی تمہاری نگاہوں کی شرمگیں مستی — وہی تمہارے تبسّم کی گلفشانی ہے

وہی ہیں پیار کی رازونیاز کی باتیں — وہی تمہاری محبت بھری جوانی ہے

وہی ہیں زمزمہ ہائے ربابِ عیش ونشاط — وہی ریاضِ محبت کی گلفشانی ہے

وہی ہیں چاندنی راتیں وہی بہار کے دن — وہی شباب کی جادو بھری کہانی ہے

وہی ہے نغمۂ سازِ عبودیت تیرا — وہی نیاز وہی نازِ مدح خوانی ہے

طرب فروز ہے کیفِ تصوّرِ "راحت"

مرے لئے یہی فردوسِ جاودانی ہے

اثر صہبائی

تفسیرِ حقیقت

اور

کلامِ دردؔ

پھولے گی اس زبان میں گلزارِ معرفت　　یاں میں زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا　　دردؔ

قدیم اردو شاعری میں مثنوی اور غزل کے ذریعہ سے حقیقت و مجاز کی تفسیر بیان کی جاتی تھی اور مسائلِ اخلاق کی تعلیم عموماً رباعیوں کے ذریعہ سے ہوا کرتی تھی۔ قصیدہ لکھنے کی مشق شعرا مجبوراً کرتے تھے جیسے آج کل تعلیم یافتہ اصحاب عموماً قانون پڑھنے پر خواہ مخواہ مجبور رہتے ہیں۔ غزل ہر حالت میں پسند کی جاتی تھی۔ کیونکہ ہر قسم کے مضمون سے اس کا تعلق ممکن ہے۔ لیکن چونکہ غزلوں کے مجموعے یعنی "دیوان" میں سوائے ردیف و قافیہ کی ترتیب کے کسی قسم کی "انڈکس" ممکن نہیں ہو سکتی، جو مضمون کی امتیازی خصوصیتوں کو علیحدہ علیحدہ ظاہر کر سکے اس لئے عہدِ حال کے اہلِ علم کا یہ قول کہ "اردو شاعری میں بے ترتیبی بہت ہے" زیادتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ واقعی قدیم اردو شاعری میں اشعار کی حیثیت سطحِ قرطاس پر بکھرنے والی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے زیادہ نہیں البتہ جوہر شناسوں کو انہیں کنکریوں میں جواہر ریزے بھی مل سکتے ہیں بشرطیکہ تلاش اور چھان بین کی محنت برداشت کی جائے اور بعض شاعر تو ایسے بھی گزرے ہیں جن کے اشعار عموماً کسی خاص رنگ میں رنگے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو ایک قسم کا امتیاز حاصل ہے مثلاً میرؔ صاحب میں کیفِ حرمان ہے، غالبؔ میں اجتماعِ اضداد اور اکبرؔ میں تنقید، خواجہ میر دردؔ رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے ہی شعرا میں شمار کئے جا سکتے ہیں کیونکہ معرفت و حقیقت پر اشعار لکھنے والا اردو شعرا میں خواجہ صاحب سے بڑھ کر کوئی نظر نہیں آتا اگرچہ ان کا فلسفہ ایرانی فلسفۂ تصوف پر مبنی ہے، جس کا موضوع عموماً دو پہلوؤں میں منقسم ہے ایک "ہمہ اوست" دوسرے دنیا کی "بے ثباتی"۔ موخر الذکر پہلو کا موضوع ہنود کے مسئلۂ "مایا" سے بھی ملتا جلتا ہے۔

خواجہ میر دردؔ نے علاوہ فلسفہ کے "اخلاق" پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مگر انہوں نے "پندنامۂ سعدی" کا رنگ اختیار کرنے کے بجائے تنقیدی پہلو اختیار کیا ہے۔ تنقید بھی ایسی جس میں نصیحت آموز طنز شامل ہو جس کی مثال

خواجہ صاحب کا یہ شعر ہے ؎

گو بحث کرکے بات بٹھائی پہ کیا حصول　　دل سے اٹھا خلاف اگر تو اٹھا سکے

خواجہ صاحب کی شاعری کو تین پہلوؤں سے دیکھا جاسکتا ہے:۔

۱۔ بہ اعتبار معانی

۲۔ بہ اعتبار بیان

۳۔ بہ اعتبار زبان

ان تین پہلوؤں میں سے پہلا خواجہ صاحب کی شاعری میں زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اور درحقیقت معانی ہی کلام کی جان ہیں اور باقی سب آرائش۔ قدیم حکما کا بھی یہی قول ہے کہ ؎

ساغر زرّین ہو یا مٹی کا ہو اک ٹھیکرا　　تو نظر کر اُس پہ جو کچھ اُس کے اندر ہے بھرا

اس اصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے خواجہ میر دردؔ کے کلام کو پرانے لوگوں کی باتیں سمجھ کر ٹال دینا ایک بڑی ادبی غفلت ہوگی۔ اس غفلت سے احتراز کرنے کے لئے ذیل میں خواجہ صاحب کی غزل کے تینوں پہلوؤں پر ایک سرسری تبصرہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ یہ ظاہر ہوجائے کہ خواجہ صاحب اپنے معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ فلسفہ میں عموماً یہی تین مسئلے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں یعنی

۱۔ عالم کیا ہے؟

۲۔ انسان کیا ہے؟

۳۔ خدا کیا ہے؟

یہی تین سوالات ایسے ہیں جن کی تشریح میں فلسفیوں نے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے اور آخر میں میر صاحب کی زبان سے نیوٹن کے اس قول کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ ؎

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے　　سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

مگر جس طرح طولِ کلام سے طبیعت بہلتی ہے اور تشریح و تفسیر سے تسکین حاصل ہوتی ہے اسی طرح فلسفہ کی پیچیدگیوں میں پڑنے سے اگر کچھ نہیں تو ایک قسم کی دماغی ورزش ہی حاصل ہوتی ہے۔

فلاسفۂ قدیم کائنات و موجودات کو وقت، سبب، اور قیام و مقام کا ماخذ بتاتے ہیں جس پر فلاسفۂ ہنود کے مسئلۂ "مایا" کی بنیاد قائم ہے۔ اُن کے نزدیک دنیا کا وجود ہی نہیں یعنی اس کا کوئی ایسا وجود جس کا اطلاق خود اسی وجود پر ہوسکے نہیں ہے۔ موجودات کی نمود تو متعلق حیثیت رکھتی ہے نہ کہ مطلق۔ ہر شے جو نظر آتی ہے اس کی بنیاد دماغوں کی حالت پر مبنی ہے۔ اگر حواسِ خمسہ کی پانچ قوتوں کے علاوہ کوئی چھٹی قوت بھی

ہوتی تو شاید دنیا ہم کو کچھ اور ہی نظر آتی۔ اسی طرح ساتویں یا ایک اور قدم بڑھ کر آٹھویں قوت ہوتی تو نہیں معلوم دنیا ہمارے سامنے کیا ہوتی، علیٰ ہذا القیاس، اس سے ظاہر ہے کہ موجودات کی کوئی ذاتی حیثیت نہیں بجز اس کے کہ ہمارے خیال کی رنگینیاں "سرچ لائٹ" کا کام کر رہی ہیں۔ تاہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ موجودات کچھ نہیں۔ بقول سوامی رام تیرتھ "یا تو رسّی سانپ ہے یا سانپ رسّی ہے"۔ کچھ ہے ضرور اور یہی ہونا فلاسفہ ہنود کے نزدیک "مایا" کہا گیا ہے جس کی بنیاد وقت، سبب اور قیام و مقام پر ہے اور چونکہ ان کا وجود ہمارے دماغوں کی حالت سے متعلق ہے اس لئے ان کی الگ الگ تشریح کر دینا چاہتے۔

ان میں سے پہلے "وقت" کو لیجئے۔ وقت کا انحصار دماغی کیفیتوں پر ہے۔ خواب میں انسان برسوں گذار دیتا ہے لیکن بیداری پر اس کی حیثیت "سناشو" سے زیادہ نہیں رہتی۔ امتحان کے کمرے میں تین گھنٹے مشغولیت کی وجہ سے تین لمحے معلوم ہوتے ہیں۔ غرض وقت کا وجود بھی متعلق ہے مطلق نہیں۔ اس حقیقت کی نہایت ستھری تفسیر خواجہ میر درد نے کسی مغربی شاعر کی پوری کتاب سے بھی زیادہ عام فہم طریقہ سے صرف ایک شعر میں کس طرح کی ہے ؎

لے کر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے   گر درمیاں حساب نہ ہو ماہ و سال کا

یہ شعر محض شعر نہیں بلکہ فن ریاضی یعنی "الجبر و المقابلہ" میں مساوات کا ایک جواب ظاہر کرنے والا سوال یا "فارمولا" ہے جو الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔ اس سے بڑھ کر "وقت" کی تشریح نہیں ہو سکتی واقعی وقت محض ایک قسم کا "حساب" ہے۔ اس کی "تنگی" "فراخی" اس کی کمی و زیادتی صرف اس حساب کا کرشمہ ہے۔ اس کا بڑھنا گھٹنے کی دلیل ہے۔ اگر خیال کے ساتھ وقت کو نسبت نہ ہو تو دراصل وہ کوئی چیز نہیں۔ خیال کے ساتھ وقت کے تعلق کا ایک پہلو "بڑھنا" ہے اور دوسرا "گھٹنا" اور یہی وقت کا فلسفہ ہے، اس کے علاوہ جو کچھ اس کی نسبت لکھا گیا ہے محض توضیح و تشریح ہے۔ وقت کے اس فلسفہ کو خواجہ صاحب کیا ہی سلجھے ہوئے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

جتنی بڑھتی ہے اتنی گھٹتی ہے   زندگی آپ ہی آپ کٹتی ہے

غرض وقت کا وجود کسی واقعہ کی ابتدا و انتہا سے متعلق ہے۔ ابتدا و انتہا کو الگ کر کے بذات خود وقت کی کوئی تخیئل نہیں جس طرح پیدائش اور موت کو الگ کر کے زندگی یا عمر کو خیال میں نہیں لایا جا سکتا۔

اب عناصر خیال کی دوسری قسم یعنی "سبب" کو لیجئے۔ سبب کیا ہے؟ ایک قسم کا علم جس کے ذریعہ سے دوسرے اسباب کا سراغ ممکن ہو سکے۔ حوادث کی بنیاد سبب پر ہے۔ ہر وہ واقعہ جو کسی دوسرے واقعہ کو حادث کر سکے سبب ہے اس طرح سبب کا وجود بھی تعلق سے خالی نہیں کیونکہ قانون اسباب کی بنیاد بھی ادراک و فہم

ہی پر ہے اور چونکہ نتیجہ وسبب کا خیال کئے بغیر واقعات وحوادث کا خیال ممکن نہیں اور واقعات وحوادث کی مختلف صورتیں ادراک وفہم سے متعلق ہیں۔ اس لئے سبب کو بھی محض کرشمۂ خیال سمجھنا چاہئے۔ اسی کرشمۂ خیال یعنی ادراک وفہم پر خواجہ صاحب نے کیا ہی محققانہ انداز میں اظہار تعجب کیا ہے ؎

یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک وفہم یاں　　دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

یہ دوسری بات ہے کہ ایک فلسفی کا ادراک وفہم عوام الناس کے ادراک وفہم سے نسبتہً کہیں زیادہ ہو اور اس زیادتی کا راز صرف یہ ہے کہ عوام الناس نے فلسفیوں کی طرح دماغی ورزش نہیں کی اس لئے ان کا دماغ کمزور ہے۔

اسباب وحوادث سے متعلق خواجہ صاحب نے سب سے بڑی حقیقت یہ بیان کی ہے کہ ہمارا وجود ہی صرف ایسا ہے جو طلسم کائنات میں طلسم بند ہونے کے باوجود الگ بھی خیال میں آسکتا ہے اور علیحدگی کا یہ خیال ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ سنگلاخ میں ہماری ہستی کنکر پتھر نہیں بلکہ ایک "جوہر مخفی" کی طرح ہے۔ کیونکہ اگر ہم ہیں تو دنیا جہان سب کچھ ہے، ہم نہیں تو کچھ نہیں۔ اس لئے ہر وجود کا سبب اعلیٰ ہم ہی ہیں۔ بقول خواجہ صاحب ؎

عالم ہو قدیم یا کہ حادث　　جس دم نہیں ہم جہاں نہیں ہے

اور یہ سبب اعلیٰ یعنی تخیل "ما ومن" وصل جان وتن" کی صورت میں کچھ ایسی طرح محدود ہے کہ حدود کی طرف لوگوں کا خیال مائل ہی نہیں ہوتا نہ حدود کو نمایاں طور پر حدود سمجھا جاتا ہے۔ ہم مصائب عالم کا شکوہ کرتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ مصائب کیوں ہیں۔ ہم قید ہیں لیکن "قید خانہ" کا خیال تک نہیں، ہم طوق وسلاسل میں جکڑے ہوئے ہیں لیکن زنجیروں کی آواز نہیں سنتے بقول خواجہ صاحب ؎

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز　　ہرچند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

اس وقت ہنود کی کتاب مہابھارت کا ایک چٹکلا یاد آیا۔ وہ یہ کہ یودھسٹر سے یکش دیوتا نے پوچھا کہ "راج کنور بھلا تم کو دنیا میں ایسی بات بھی معلوم ہوتی ہے جو بدرجۂ غایت حیرت انگیز ہو"؟ یودھسٹر نے کہا "بھگوان صرف ایک بات وہ یہ کہ روزانہ آدمی مرتے جاتے ہیں مگر موت کا یقین کسی کو نہیں"۔ "عالم میں ہونے اور "عالم سے جدا ہونے" کی تفسیر اس حکایت سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ وجود وجو "واقعات وحوادث" کی ایک شکل ہے نتیجہ وسبب اور آغاز وانجام کا ایک درمیانی طلسم ہے اور یہ طلسم بھی محض ایک کرشمۂ خیال ہے اور چونکہ خیال کا وجود کسی بڑے سبب کا ایک ادنیٰ اظہار کمال ہے۔ اس لئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ ؎

نہ ہم غافل ہی رہتے ہیں نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں　　انہیں طرحوں میں ہم ہر دم فنا فی اللہ ہوتے ہیں

تقید گاہ امکان میں ہے وہ کچھ بخشش مطلق　　کہ ہر واحد کو لاکھوں وام یاں تنخواہ ہوتے ہیں

"اور تقیدگاہِ امکان" میں "بخششِ مطلق" پر بھروسا کرکے انسان کو شکوہ وشکایت کی گنجائش ہی نہیں
اس لئے لازم ہے کہ ؎

پرکھا درد کچھ مت رکھ ترقی اور تنزل کا — کہ اپنے ذہن میں تو یاں گدا بھی شاہ ہوتے ہیں

طلسمِ عالم کی تیسری بنیاد یعنی "قیام ومقام" پر قدیم فلاسفہ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو چیزیں ہم کو نظر آتی ہیں محض ہمارے خیال کی رنگینیوں کا مظہر ہیں مگر ان کی حیثیت بالکل "وہمی" نہیں ہر چیز کا قیام ومقام حتیٰ کہ اس کا نام ایک قسم کی مرکزی حیثیت رکھتا ہے جو بغیر کسی "حد" یا بغیر ابتدا و انتہا یا شروع اور اخیر کے خیال میں نہیں آسکتی۔ "ناک" کا تصور ہمیشہ دو کانوں اور دو آنکھوں کے بیچ میں منہ سے اوپر ہی ممکن ہوسکے گا پس پشت یا بالائے سر اس کا خیال ہی نہیں ہوسکتا۔ غرض مسئلۂ تناسب وتعلق کو ہر بات میں دخل ہے لیکن چونکہ یہ مسئلہ بھی خیال سے متعلق ہے اس لئے قیام ومقام کا امتیاز بھی محض ایک صوری امتیاز ہے معنوی اہمیت اس کو بالکل نہیں۔ نہ اس کا اطلاق حدود سے پرے ہوسکتا ہے۔ حدود کی نسبت سے نام وقیام کا وجود ہے اور رہوتا رہے گا۔ اس کی تمثیل سمندر کی موج سے بخوبی ہوسکتی ہے۔ موج کیا ہے؟ محض سمندر کی تبدیل شدہ صورت یعنی سمندر اور موج میں جو امتیاز ہے۔ اس کا راز صرف نام وقیام کی تشکیل پر مبنی ہے۔ اگر موج غائب ہوجائے تو تشکیل باقی نہیں رہتی۔ مگر "موج" تھی کوئی چیز ضرور۔ محض "چھلاوا" یا "وہم" نہ تھی۔ اس سے لمبائی چوڑائی غرض ایک قسم کی تشکیل نمایاں تھی اور یہی شکل قیام ومقام کی دلیل ہے۔ اور چونکہ وجود انسانی پابندِ قیام ومقام ہے اس لئے خواجہ صاحب کا یہ قول بھی اظہارِ حقیقت سمجھنا چاہئے کہ ؎

ہستی ہے جب تلک ہم ہیں اسی اضطراب میں — جوں موج آپھنسے ہیں عجب پیچ وتاب میں

اور اسی خیال کو خواجہ صاحب مصائبِ عالم کا شکوہ کرتے ہوئے نہایت عام شاعرانہ انداز میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

کیوں نہ ڈوبے رہیں یہ دیدۂ تر پانی میں — ہے بنا مثلِ حباب اپنا تو گھر پانی میں

متذکرۂ بالا حقائق یعنی وقت، سبب، اور قیام ومقام یا بالفاظِ دیگر وجودِ عالم کا راز "پردہ ہائے تعینات" پر مبنی ہے اور تماشا گاہِ عالم میں خیالات کی رنگ آمیزیوں نے ان پردوں کو اور بھی رنگ برنگ نوعیتوں میں پیش کیا ہے۔ ان سب باتوں کا خلاصہ خواجہ صاحب اپنی ایک غزل میں اس طرح بیان فرماتے ہیں [1]

ہستی ہے سفر، عدم وطن ہے — دل خلوت وچشم انجمن ہے

---

[1] اکثر قدیم اساتذہ "تا" کا ادغام جائز سمجھتے تھے۔

دیکھا تو یہ شورشِ من و ما | ہنگامۂ وصلِ جان و تن ہے
مت جا تر و تازگی پہ اس کی | عالم تو خیال کا چمن ہے

اب فلسفۂ تصوف کے دوسرے سوال پر غور کرنا چاہیئے جو انسان سے متعلق ہے۔ انسان کیا ہے؟ سمندر کی ابھری ہوئی موج یا سازِ انا البحر پر نغمہ نواز ہونے والا ایک قطرہ۔ لیکن کُل کے مقابلہ میں اس جزو کی کوئی امتیازی حیثیت بھی ہے یا نہیں۔ جان و تن یا بالفاظِ دیگر روح و جسم اس کی امتیازی حیثیتیں ہیں اگرچہ روح بذاتِ خود کسی قسم کی تفریق ظاہر نہیں کرتی جب تک کہ جسم کے ساتھ اس کے تعلق کا خیال نہ کیا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ جسم اپنی ظاہری حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نہ اس کو خود اپنا علم ہے نہ اپنے مکین کا۔ رہا دماغ و خیال کا درمیانی تعلق تو دماغ و خیال کو جسم و جان کے درمیان وہی حیثیت حاصل ہے جو آنکھ اور نگاہ کے درمیان عینک کو ہے۔ نیند میں ہم اس عینک کو اتار ڈالتے ہیں۔ مرنے کے بعد شائد اس عینک کی بالکل ضرورت ہی نہ ہوتی ہو۔ غرض جو کچھ ہے روح ہے۔ بقولِ مشرقی فقیہہ سری شنکراچاریہ کے "روح کا کوئی وجود نہیں بلکہ وہ خود وجود ہے، روح کو کوئی علم نہیں بلکہ وہ خود علم ہے"۔ وہ ہر قسم کے تعینات سے پرے ہے۔ تعینات کی حیثیت اس کے سامنے عینک وغیرہ سے زیادہ نہیں۔ اور یہیں سے انسان کی حقیقی انسانیت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی بنا پر خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ ؎

میں گو نہیں ازل سے پر تا ابد ہوں باقی | میرا حدوث آخر جا ہی پڑا قدم سے

اس اعتبار سے دنیا میں جو کچھ ہے وہ یہی حقیقی انسانیت ہے جو وجودِ مطلق سے وابستہ ہے۔ اس لئے خواجہ صاحب نہایت انبساط و مسرت کے ساتھ لکھتے ہیں ؎

باغِ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں | گر یار ہیں تو ہم ہیں اغیار ہیں تو ہم ہیں
دریائے معرفت کے دیکھا تو ہم ہیں ساحل | گر وار ہیں تو ہم ہیں اور پار ہیں تو ہم ہیں
وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر ہے و گر قدر | مجبور ہیں تو ہم ہیں مختار ہیں تو ہم ہیں
الفاظِ خلق ہم بِن سب مہملات سے تھے | معنی کی طرح ربطِ گفتار ہیں تو ہم ہیں

اِن اشعار کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ تعینات میں ظاہر و پنہاں ہم ہی ہیں۔ یہیں سے فلسفہ کا تیسرا سوال جو خدا سے متعلق ہے حل ہو جاتا ہے۔ خدا کیا ہے؟ یکتائے مطلق یا "مسبب کل" جس نے لفظِ کن سے نظمِ "فیکون" کو قائم ہے۔ وہ برتر از قیاس و گمان و خیال ہے۔ خواجہ صاحب نے بالکل سچ کہا ہے ؎

وہ مرتبہ ہے اور ہی فہمید سے پرے | ہم جس کو پوجتے ہیں وہ اللہ ہی نہیں

یوں لکھنے کو بھی خواجہ صاحب نے اور شاعروں کی طرح ہمہ اوست کا دم بھرتے ہوئے لکھا ہے کہ ؎

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھا دیئے　　پردے تعینات کے جو تھے اٹھا دیئے

نیز یہ کہ ؎

جوں نورِ نظر ترا تصور　　تھا پیشِ نظر جدھر گئے ہم

اور یہ کہ ؎

جگ میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اس لئے اربابِ توحید کا یہ کہنا بھی حقیقت سے خالی نہیں کہ ؎

رکھ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ کو یاد　　جب تلک اے درد دَم میں دَم رہے

بہ اعتبارِ معانی ہم خواجہ صاحب کے کلام پر تبصرہ کر چکے اب دیکھنا چاہئے کہ

بہ اعتبارِ بیان اپنے ہمعصروں میں خواجہ صاحب کہاں تک نمایاں ہیں۔ اندازِ بیان کو دیکھتے ہوئے خواجہ صاحب کے کلام میں تین خصوصیتیں پائی جاتی ہیں:۔ کیفِ غم، کیفِ عشق اور زندہ دلی۔

اس میں شک نہیں کہ قدیم اردو شاعری میں یاس و حرماں کا بہت کچھ عنصر رہا اور یہیں سے کیفِ غم کی ابتدا ہوتی ہے مثلاً خواجہ صاحب کے یہ اشعار ؎

اگر یونہی یہ دل ستاتا رہے گا　　تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے　　مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

قفس میں کوئی تم سے اے ہمصفیرو　　خبر گُل کی ہم کو سناتا رہے گا

خفا ہو کے اے درد مر تو چلا تھا　　کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

لیکن ذیل کے اشعار سے بڑھ کر میر صاحب بھی کیفِ غم کی مثال بہم پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوئے ان اشعار کو پڑھنے سے خواجہ صاحب کے پر حرماں اور نازک شاعرانہ جذبات کا بہت اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے ؎

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا　　کہ نہ ہنسنے ہی رو دیا ہوگا

ان نے قصداً بھی میرے نالے کو　　نہ سُنا ہوگا گر سنا ہوگا

دل زمانہ کے ہاتھ سے سالم　　کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

حال مجھ غمزدے کا جس تس نے　　جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں　　کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا

یک بیک نام لے اٹھا میرا　　جی میں کیا اُس کے آگیا ہوگا

میرے نالوں پہ کوئی دنیا میں — ق — بے کئے آہ کم رہا ہوگا
لیکن اس کو اثر خدا جانے — نہ ہُوا ہوگا گر ہُوا ہوگا
قتل سے میرے وہ جو باز رہا — کسی بدخواہ نے کہا ہوگا
دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا — آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

مندرجۂ بالا غزل میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک شعر دل میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ ان اشعار سے بڑھ کر کیفِ غم کی مثال شاید ہی کہیں ملے اور جب زمانہ کے ہاتھوں سے تنگ آکر خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ :-
"ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے" تو مجسّم کیفِ غم معلوم ہوتے ہیں۔

اندازِ بیان کے دوسرے پہلو یعنی کیفِ عشق کو بھی مندرجۂ بالا خصوصیت کی ایک قسم سمجھنا چاہیئے صرف فرق اتنا ہے کہ اس میں حسن و عشق پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ؎

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے جز جفا — پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا
کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری — جی میں یہ کس کا تصوّر آگیا

لیکن شاید مندرجۂ ذیل اشعار سے بڑھ کر کیفِ عشق کی مثال ممکن نہ ہو سکے۔ دیکھیئے اندازِ بیان کیسا پیارا ہے ؎

دل مرا پھر دکھا دیا کس نے — سو گیا تھا جگا دیا کس نے
میں کہاں اور خیالِ بوسہ کہاں — مُنہ سے مُنہ یوں بھڑا دیا کس نے
وہ مرے چاہنے کو کیا جانے — یہ سندیسا سنا دیا کس نے
ہم بھی کچھ دیکھتے سمجھتے تھے — سب یکایک چھپا دیا کس نے

اور شاید کیفِ عشق میں شکوے کا پہلو لئے ہوئے مثالیں ان اشعار سے بڑھ کر مشکل سے ملیں ؎

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے — تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے — آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
ان دنوں کچھ عجب ہے حال مرا — دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

مگر چونکہ زندہ دلی لازمۂ شعر و شاعری ہے اس لئے خواجہ صاحب کے اکثر اشعار ایسے بھی ہیں جن کو پھڑکتے ہوئے اشعار کہہ سکتے ہیں اور ایک سالک سے زندہ دلی کا اظہار ہونا حیرت انگیز نہیں بلکہ لازمۂ معاشرت ہے۔ شعرائے ایران میں حافظ محض اپنی زندہ دلی کی وجہ سے مشہور ہیں اور یہ رنگ خواجہ صاحب میں بھی ہے مثلاً ؎

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رندِ شرابی کا — بھڑا دے مُنہ سے مُنہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

لیکن اس سے بڑھ کر زندہ دلی ذیل کے شعر سے ظاہر ہوگی یعنی ؎

کہا جب میں ترا بوسہ تو جیسے قند ہے پیارے — لگا تب کہنے پر قندِ مکرر ہو نہیں سکتا

لیکن اس شعر میں الفاظ "دیکھوں ہوں" نے خواجہ صاحب کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے ؎

کیونکہ گذرے گی بھلا دیکھوں ہوں — گر اسی طرح سے شرمایئے گا

اور ان اشعار میں شگفتگی کے علاوہ زبان کے کمال کو بھی ظاہر کیا ہے ؎

دو نگاہیں جو چار ہوتی ہیں — برچھیاں دل کے پار ہوتی ہیں

بے وفائی پہ اُس کی دل مت جا — ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

نیز یہ شعر ہے ؎

تمہارے وعدے بتاں خوب میں سمجھتا ہوں — رہا ہے ایسے ہی لوگوں سے کاروبار مجھے

خواجہ صاحب کے کلام کی تیسری خصوصیت زبان ہے۔ زبان سے یہاں مطلب خاص ان کے وقت کی زبان ہے کیونکہ خواجہ صاحب کے کلام میں برج بھاشا کے اکثر الفاظ ہو بہو پائے جاتے ہیں جو اس وقت زبان زدِ عام تھے مگر اب متروک ہیں۔ ذیل کے اشعار تو ٹھیٹھ ہندی میں ہیں ؎

کیسی تم کو بھاوت ہے اور کیسی تو سکھ پاوت ہو — یہ پھلواری درد نہیں کچھ اور سمو دکھلاوت ہو

کلیاں من میں سوچ رہت ہیں جو پھول کوئی کملاوت ہے — جو دن واکو بیت گیو ہے وا دن مونکو آوت ہے

ایسے اشعار جن سے خواجہ صاحب کے عہد کی اردو ظاہر ہوتی ہے ذیل میں لکھے جاتے ہیں ؎

وہ مرے چاہنے کو کیا جانے — یہ سخن سا سنا دیا کس نے

ترچھی نظروں سے دیکھنا ہر دم — یہ بھی اِک بانکپن کا بانا ہے

دل تجھے کیوں ہے بیکلی ایسی — کون دیکھی ہے اچپلی ایسی

آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاج دہر — میں گرچہ گرم و سردِ زمانہ سمو گیا

پر کھانت یہی رہتا ہے مجھ کو درد کیا کہیئے — کہ ایسی زندگی سی چیز یونہی مفت جاتی ہے

اسی طرح الفاظ سنکھ، ایدھر، جیدھر، کبھو، ٹک، ہنت وغیرہ قدیم اردو زبان کا آئینہ ہیں جو میر صاحب اور خواجہ صاحب کے کلام میں کثرت سے ملتے ہیں، خواجہ صاحب کے کلام کی تینوں خصوصیتوں پر اظہارِ خیال کرنے کے بعد ذیل میں اُن کے چند منتخب اشعار بلا تبصرہ کئے لکھے جاتے ہیں تاکہ میر و مرزا کے اشعار کی طرح یہ بھی ادبی فارمولا ہو سکیں ؎

اے درد منبسط ہے ہر سو کمال اُس کا — نقصان گر تو دیکھے تو ہے قصور تیرا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہُوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اکسیر پر ہوس اتنا نہ ناز کرنا　　بہتر ہے کیمیا سے دل کو گداز کرنا

اندازہ وہی سمجھے مرے دل کی آہ کا　　زخمی جو ہو چکا ہو کسی کی نگاہ کا

زلف میں دل کو تو اُلجھاتے ہو　　پھر اسے آپ ہی سلجھائیے گا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا　　بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے　　اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

اے گُل تو رخت باندھ اُٹھاؤں میں آشیاں　　گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے

اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں　　اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

اِن لبوں نے کی نہ مسیحائی　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

گل و گلزار خوش نہیں آتا　　باغ بے یار خوش نہیں آتا ❊ اے جنوں جیب میں ترے ہاتھوں　　ایک بھی تار خوش نہیں آتا

کیا جفا کے سوا تجھے کچھ اور　　اے ستم گار خوش نہیں آتا ❊ درد ہم کو یہ رات دن تیرا　　نالۂ زار خوش نہیں آتا

آخر میں اخلاق سے متعلق چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں شکوہ و شکایت کے ذریعہ سے خواجہ صاحب نے موعظت کی خشکی کو بہت کچھ معتدل کر دیا ہے مثلاً یہ شعر ؎

اے درد کہوں کس سے بتا رازِ محبّت　　عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

شاید اہلِ دنیا کے اخلاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہی خواجہ صاحب نے یہ شعر لکھا تھا ؎

واقف نہ یاں کسو سے ہم ہیں نہ کوئی ہم سے　　یعنی کہ آگئے ہیں بہکے ہوئے عدم سے

ذیل کے دو اشعار کو خواہ معیارِ اخلاق سے دیکھا جائے خواہ محض حسنِ عشق سمجھا جائے ان کا لطف صاحبِ کیف ہی کو حاصل ہو سکتا ہے

جو ملنا ہو مِل پھر کہاں زندگانی　　کہاں میں کہاں تو کہاں نوجوانی
عجب خواب در پیش ہے پھر تو سب کو　　سنا لو تک اب اپنی اپنی کہانی

خواجہ صاحب کا کلام قدیم خط و خال کی یا کہانی سنانے والے شعرا کے کلام سے صرف اس بات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس سے بجائے عشوہ و شوخی بجائے یاس و حرماں، اور اربابِ شریعت کی تنقید کے ایک قسم کی تقدیس ظاہر ہے یعنی طرزِ بیان کی خوبی کے ساتھ ساتھ ہر شعر سے اس حیرت ہستی کے دل کی محبت، اس کے اخلاص، طلب، در پیرایۂ شکوہ و شکایت کا اظہار ہوتا ہے بقولِ جناب شرانی خواجہ صاحب اپنے عہد کے اولیائے کبار میں سے تھے اپنی شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود میر صاحب نے لکھا ہے کہ "واللہ بذاتِ ہمیں بزرگ است" اور شاید یہ حضرتِ امام عسکری اور حضرتِ غوث الصمدانی رضی اللہ عنہم ہی کے فیض کا اثر تھا کہ خواجہ صاحب اردو زبان پر اتنا بڑا احسان کر گئے کہ ان کا ایک دریا امنڈتا ہوا نظر آتا ہے۔

سید مقبول حسین (احمد پوری)

محبّت کی فتح

یہ افسانہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ سات بھائیوں اور ان کے عجیب وغریب بہنوئی کا واقعہ سچا ہے اور میں نے کسی اخبار میں دیکھا تھا چنانچہ اس واقعہ کے پیش نظر یہ افسانہ میں نے غازی عبدالکریم کی جنگ سے متاثر ہو کر لکھا۔ افسانہ کا آخری پیراگراف خیالی ہے۔

سمندر کے کنارے دور تک فوجی کیمپ چلا گیا تھا۔ جگہ جگہ پختہ بارکیں اور عمارتیں بنی ہوئی تھیں اور پھر موقع بہ موقع خیمے بھی نصب تھے۔ کچھ فاصلے پر ہسپانیہ کے چند جنگی جہاز لنگر انداز تھے اور سمندر کے کنارے کی چہل پہل بتا رہی تھی کہ عنقریب سرزمین مراقش میں کیا کچھ ہونے والا ہے ——— وہی کچھ جو ہم سب نے آخر دیکھ لیا اور سن لیا کہ کس طرح غازی عبدالکریم نے ہسپانیہ کے بہادروں کو اپنے مٹھی بھر جانبازوں کی امداد سے پے در پے شکستیں دیں۔

جنگ و جدال کا ایک طرح کوئی احتمال نہ تھا کیونکہ اس کے لئے بظاہر کوئی وجہ نہ تھی لیکن پردے ہی پردے میں ہسپانیہ کی خودسرانہ حکمتِ عملی سے رعایا تنگ آ چکی تھی اور کوئی گل کھلا چاہتا تھا۔ چنانچہ چند ہی سال بعد جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔

(۱)

عبداللہ بن علی ریف کا ایک غریب مزدور تھا جو سمندر کے کنارے کی بستیوں میں محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالنے آیا تھا۔ اُس نے اس سے قبل ہسپانوی سپاہیوں کا نام تو سنا تھا مگر انہیں دیکھا نہ تھا۔ وہ اب تک اُن آداب سے ناواقف تھا جو ریف کے ایک معمولی باشندے کو ہسپانیہ کے سپاہیوں اور افسروں کے ساتھ ملحوظ رکھنے چاہئیں تھے۔ اگر وہ ایک غریب مگر مضبوط اور طاقت ور پہاڑی تھا تو ساتھ ہی اپنے سینہ میں ایک مضبوط دل بھی رکھتا تھا۔ اس کا قوی دل اور اُس کی ہمّت دراصل غرناطہ کے سورماؤں کی یادگار تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ ڈیوک آف میڈینا سڈونیا کی فوج اور افسر سمندر کے کنارے پر اترے ہوئے ہیں۔ اور نہ اسے یہ معلوم تھا کہ یہ اُسی میڈینا سڈونیا کے ڈیوک ہیں جس میڈینا سڈونیا کے میدانِ جنگ پر اُس کے آبا و اجداد نے ڈیوک موصوف کے آبا و اجداد کو شکست دے کر قدیم ہسپانیہ کی عظمت کو مٹی میں ملا دیا تھا۔

عبداللہ کو ساحل کی چھاؤنیوں کی بستیاں بھی پیرس و لندن سے کم نہ معلوم ہوتی تھیں کیونکہ یہاں کی تمام چیزیں اس کے لئے نئی تھیں۔ اس قسم کے مقام پر تمام گرد و پیش کی چیزیں عموماً ایک اجنبی پر رعب طاری کر دیتی ہیں مگر شاید یہ معلوم کر کے ناظرین کو تعجب ہو کہ ریف والوں کے پہلو میں اور قسم کا دل ہوتا ہے۔

عبداللہ ایک مختصر سے بازار میں کھڑا تھا جب اُس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک فوجی افسر پورے طمطراق کے ساتھ آرہا ہے۔ اس کی جلو میں بہت سے آدمی تھے اور آگے آگے فوجی چپراسی تھے۔ اُس کو معلوم بھی نہ تھا کہ ایسے موقع پر ایک ریفی کا فرض یہ ہے کہ وہ سامنے سے ہٹ جائے اور سڑک کے کنارے مودّب کھڑا رہے۔

وہ اس افسر اور اس کے ساتھیوں کو حقارت آمیز تعجّب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑا رہا حتیٰ کہ فوجی چپراسی اس کے قریب آگئے۔ فوجی چپراسی نے عبداللہ کی گستاخی پر برافروختہ ہو کر نہایت ہی بدتمیزی سے اس کو دھکا دیا۔ عبداللہ کو طیش آگیا اور اس نے چپراسی پر حملہ کرنا چاہا کہ اچانک اس کی پشت پر ایک رائفل کا کندا پڑا۔ بل کھا کر اُس نے مڑ کر دیکھا کہ ایک یورپین سپاہی نے اس کو مارا ہے۔ طیش میں آکر اُس نے صاحب بہادر کی کنپٹی پر اس زور سے مُکا مارا کہ وہ زمین پر دراز ہو گئے۔ قبل اس کے کہ وہ بھاگ سکے چار پانچ آدمیوں نے جھپٹ کر اُس کو دبا لیا اور لاتیں اور ٹھوکریں اور رائفل کے کندے مار مار کر اُس کو بے حال کر دیا۔

دنیا کے قوانین جُدا ہیں اور وہ قوانین جدا ہیں جن کا اجرا ہسپانوی فوج غریب ریف والوں پر کرتی ہے اگر کوئی ریف والا ہسپانوی فوجی سپاہی یا افسر کی توہین کرے تو کم از کم سزا جو دی جا سکتی ہے وہ سزائے موت ہے

عبداللہ کو جب فوجی حوالات سے نکالا گیا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ عمارت سے باہر سنتری کے ساتھ آرہا تھا کہ اس کے کانوں تک کچھ خوفناک الفاظ پہنچے۔ اس نے پورا جملہ نہ سُنا مگر لفظ "قتل" صاف سُنا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے اور ایک دم سے حقیقت اس کو معلوم ہو گئی۔ . . . . . .

وہ قتل کرنے کے لئے اس کو کہیں لے جا رہے تھے! بجائے ناامید اور مایوس ہونے کے اُس کو سخت غصہ آیا۔ اُس کی آنکھیں غیض و غضب کے مارے سُرخ ہو گئیں اور وہ سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ جیسے ہی وہ پھاٹک کے باہر نکلا اس نے ایک ہسپانوی سوار کو پہرہ پر متعین پایا۔ چشم زدن میں اس نے کچھ طے کر لیا۔ بڑھ کر اُس نے ایک دوہتڑ ہسپانوی کے سر پر دیا جو اس کو گویا کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ اس سنتری کے سر پر دونوں ہتھکڑیاں پوری طاقت سے ایسی پڑیں کہ وہ گر پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھل سکے اُس نے لپک کر ہسپانوی پہرہ دار سوار کو ٹانگ سے پکڑ کر گھوڑے پر سے لوٹ دیا۔ گھوڑے کی زین پکڑ کر ایک زقند مار کر سوار ہو جانا ایک چشم زدن کا کام تھا۔ وہی ہتھکڑی کا ایک ہاتھ اُس نے گھوڑے پر مارا اور گھوڑا بے تحاشا لے کر اُس کو بھاگا۔

فوجی بارکوں سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ مگر جس کو اللہ رکھے اُس کو کون چکھے۔ گھوڑے کا رُخ اُس نے

پہاڑوں کی طرف کر دیا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ سیاہی اُجالے پر غالب آتی جاتی تھی اور جس وقت فوجی رسالے کے جوان پہاڑیوں کے دامن میں پہونچے سورج ڈوب چکا تھا اور عبداللہ کا پتہ تک نہ چلتا تھا

(۲)

عبداللہ جب پہاڑیوں کا پہلا سلسلہ پار کر گیا تو اس کو اطمینان ہوا۔ ہتھکڑی توڑنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ رات بھر چلتا رہا کہ مبادا کوئی دشمن آ پہونچے۔ صبح ہوتے ہوتے وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں اس کو معلوم تھا کہ کوئی دور اندیش شخص فوجی دستہ نہیں لائے گا۔ یہاں پہنچ کر خود بخود اس کی زبان سے اپنی فرضی محبوبہ (جس کا کہیں کے دل تک میں بھی وجود نہ تھا) کی شان میں اشعار نکلنے لگے۔

اس نے آبادی میں پہنچ کر ایک لوہار سے اپنی ہتھکڑیاں کٹوائیں۔ اب جو اُس نے غور کیا تو مارے خوشی کے اُس کا کلیجہ کھنچا جا رہا تھا۔ کیا وہ بہترین سودا کر کے نہیں آ رہا تھا؟ تھوڑی بہت مار کے عوض میں ایک قیمتی گھوڑا مع زین اور دیگر سامان کے . . . . وہ اب ایک طرح سے رئیس آدمی تھا۔

دو پہاڑوں کے بیچ میں اونچی نیچی زمین پر دو چار جھونپڑیاں تھیں اور یہی کل آبادی تھی جہاں وہ آیا تھا۔ سامنے اُس نے دیکھا کہ ایک پہاڑ کی ٹیکری پر عمدہ سا مکان ہے جس کے ارد گرد نشیب میں دو تنگ کھیت چلے گئے ہیں وہ آگے بڑھا اور اس نے دیکھا کہ آدمی غلہ کاٹ کر جمع کر رہے ہیں۔ وہ تیزی سے اُسی طرف بڑھا کیونکہ لوہار نے تو جواب دے ہی دیا تھا کہ میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں اور اس کو امید اب اسی طرف سے تھی۔ وہ بہت بھوکا تھا اور پہلا آدمی جو اسے ملا اس سے اس نے کہا "میں بھوکا ہوں" اس نے جواب میں کچھ فاصلہ پر ایک شخص کی طرف انگلی اٹھا دی۔ یہ شخص ایک درخت کے سایہ میں زمین پر چٹائی بچھائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس اس کی رائفل رکھی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کھیتوں کا مالک یہی ہے۔ عبداللہ نے اس کے پاس پہنچ کر سلام کے بعد اپنا سوال دُہرایا۔

اس نے جواب دیا "اترو اور اطمینان سے بیٹھو۔" عبداللہ یہ کہتا ہوا کہ میں بہت بھوکا ہوں گھوڑے پر سے اُترا اور اُس کو درخت سے باندھ دیا۔ اس شخص نے زور سے آواز دی "صالحہ۔ صالحہ" اور سامنے کی بلندی پر مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ آواز سن کر عبداللہ نے دیکھا کہ ایک حسین اور نوجوان لڑکی دوڑی آ رہی ہے۔ وہ بلندی سے پتھریلے اور اونچے نیچے راستہ پر سے ایسی تیزی سے اتر رہی تھی کہ جیسے کوئی ہموار راستہ پر سے آ رہا ہو۔ یہ اُس شخص کی بہن تھی اس نے عبداللہ کی طرف اشارہ کر کے اُس کے لئے کچھ کھانا لانے کو کہا۔ اُس نے عبداللہ کی طرف غور سے دیکھا اور اسی مکان کی طرف چلی گئی۔

عبداللہ کا بھوک کے مارے بُرا حال تھا تمام رات اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر گذاری تھی۔ کھانا نہ ہوتا تو ممکن ہے وہ اپنی بے تابی ظاہر نہ ہونے دیتا۔ مگر کھانے کی موجودگی اور پھر دیر! . . . . . . یہ اُسے مارے ڈال رہی تھی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ کسی جگہ آگ لگی تھی۔ وہاں اور لوگوں کے علاوہ کوئی بھوکے صاحب بھی تھے مضمون یہ ہُوا

کہ ع ے رکابی یہ دوڑے کھانے کو اور دوڑے اُسے بجھانے کو

قصہ مختصر لڑکی کو جب غیر معمولی دیر ہوئی اور تین چار تقاضے بھوک کے اور عبداللہ نے کرلئے اور لڑکی پھر بھی نہ آئی تو اُس شخص نے مسکرا کر کہا "جاؤ گھر پر ہی کھا آؤ"

عبداللہ اصلی بھوکے کی طرح گھر پر پہنچا۔ لڑکی کھانا لے کر نکل ہی رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر رُک گئی اور مُسکرا کر بولی "تو بہت بھوکا معلوم ہوتا ہے۔ عبداللہ نے کھانے کی صورت دیکھ کر بے تاب ہو کر کہا "بہت بھوکا ہوں"

جَو کی روٹیاں تھیں۔ تھوڑا سا پنیر تھا اور پیاز۔ عبداللہ اس کھانے پر بدحواس ہو کر گرا۔ وہ کھانا کھانے میں اس طرح مشغول تھا کہ اُس کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی بدحواسی کو لڑکی دلچسپی سے دیکھ رہی ہے۔ جب کھانا ختم ہونے لگا تو عبداللہ نے نظر اُٹھا کر دیکھا اور لڑکی سے پوچھا "تو کیوں ہنستی ہے؟"

لڑکی نے کہا "میں نے اتنا بھوکا آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ شاید تو اور کھانا کھائے گا"

عبداللہ نے آخری لقمہ سنبھالتے ہوئے کہا "ہاں۔ اور لا"

لڑکی اٹھی اور اس نے اتنی ہی مقدار کھانے کی عبداللہ کے سامنے اور لا کر رکھ دی۔ عبداللہ کی بدحواسی کچھ دور ہو گئی تھی اور اب وہ باتیں کرتا جاتا تھا اور کھاتا جاتا تھا۔

اس کو معلوم ہُوا کہ اس گھر کے مالک سات بھائی ہیں جن کی یہ اکیلی بہن ہے۔ وہ شخص جو درخت کے نیچے بیٹھا تھا سب سے بڑا بھائی تھا۔ دوسرے بھائی آس پاس کے کھیتوں میں کام دیکھ رہے تھے اور خود بھی کر رہے تھے۔ باقی مزدور تھے۔ مزدوروں کی اکثر ضرورت رہتی ہے۔ وہ سب بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ شاید عبداللہ کو بھی مزدوری مل سکتی تھی۔

عبداللہ نے اپنا قصہ بھی شروع سے اخیر تک تفصیل کے ساتھ سنایا۔ لڑکی کو سخت تعجب ہُوا اور اُس نے عبداللہ کو تعریف کی نظر سے دیکھا۔ قصہ بیان کرنے میں عبداللہ کا سینہ دب دب کر اُبھر رہا تھا کیونکہ دورانِ گفتگو میں اپنے دشمنوں کے ذکر کے ساتھ اس کو غصہ بھی آتا تھا۔

یہ لڑکی عبداللہ کو بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے اُس سے پہلے سیکڑوں لڑکیاں دیکھی تھیں۔ اور اس سے کہیں زیادہ روپیہ پیسہ والی اور شکل صورت والی مگر اس نظر سے اُس نے کبھی کسی کو نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی اس سے پیشتر کوئی لڑکی اس کو ایسی اچھی معلوم ہوتی جیسی یہ۔ لہذا جب لڑکی نے اس کا قصہ سننے کے بعد کہا "تو بڑا بہادر اور ہمت والا ہے" تو لڑکھڑاتی زبان سے رُک رُک کر عبداللہ نے بھی کہہ دیا "تو بڑی اچھی لڑکی ہے"۔ لڑکی نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں اور عبداللہ نے اپنے کو کچھ بے چین سا پایا۔

عبداللہ کو وہ گھر ہی پر چھوڑ کر اپنے بھائیوں کے پاس چلی گئی کیونکہ عبداللہ کو بے حد نیند آرہی تھی۔ وہ ایسا بے خبر سویا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

دوپہر ہونے آئی اور لڑکی اس دوران میں دو مرتبہ اس کو دیکھنے آئی کیونکہ بھائی نے بار بار بھیجا کہ دیکھ آ کہ سوتا ہے کہ جاگتا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ عبداللہ رات بھر کا جاگا ہے اور اس نے بھائی سے کہا نہ تھا۔ وہ ایک مرتبہ آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ عبداللہ چت لیٹا ہے۔ ایک ہاتھ اس کا اس کے سینہ پر ہے اور وہ سوتے میں کچھ لفظ چبا چبا کر بول رہا ہے۔ اس کو کچھ شبہ سا ہوا اور وہ قریب آئی تاکہ سن سکے۔ اس کا شبہ یقین کو پہنچ گیا کیونکہ اس نے سن لیا عبداللہ کہہ رہا تھا "یا صالحہ۔ صالحہ۔ یا صالحہ" وہ چپ ہو جاتا تھا اور پھر اسی طرح کہتا تھا اور دوران خاموشی میں جو اس کے چہرہ کی حالت تھی وہ نہ معلوم کیا تھی مگر ایسی تھی کہ سادہ لوح صالحہ بھی شاید سمجھ گئی کہ اس کے بے خبر سونے والے کے چوڑے چکلے سینہ میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ وہ واپس جانے والی ہی تھی۔ کہ صالحہ۔ صالحہ کہتے کہتے وہ ایک دم سے "یا صالحہ" زور سے کہہ کر چونک پڑا۔ اس کی آنکھیں صالحہ پر جو پڑیں وہ اچھل پڑا۔ گھبرا کر وہ آنکھیں ملنے لگا۔ صالحہ شرمندہ ہو کر یہ کہہ کر چلی گئی کہ بھائی نے بلایا ہے۔

(۳)

عبداللہ محنتی ہی نہیں تھا بلکہ کام کرنے میں گویا جن تھا۔ اُسے کام بتا دینا کافی تھا اور وہ یہ نہیں دیکھتا تھا کہ کام کا وقت گذر گیا اور اب اگر وہ کام کرے گا تو اس کی مزدوری کسی طرف بھی شمار نہ ہوگی۔ وہ کام کام کے لئے کرتا تھا نہ کہ دام کے واسطے۔ حالانکہ اُس کو کام کرتے پندرہ بیس ہی دن ہوئے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سات بھائی نہیں ہیں بلکہ آٹھواں عبداللہ بھی ہے۔

اس تن دہی سے کام کرنے کے ساتھ ہی ساتھ عبداللہ کی طبیعت کا میلان صالحہ کی طرف بھی بڑھتا جاتا تھا۔ وہ جانتا بھی نہ تھا کہ عشق یا محبت کیا چیز ہے اور یہی حال صالحہ کا تھا مگر عبداللہ خواہ مخواہ اپنے کو صالحہ سے کام کی ہی باتوں میں دلچسپی لیتے پاتا تھا۔ ایک روز اُس نے بغیر تمہید یا تکلف کے صالحہ سے کہہ دیا کہ میں تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں اس کے علاوہ سوائے کام کی باتوں کے کبھی اس نے صالحہ سے کوئی بات ہی نہ کی تھی۔ مگر پھر رجحان طبع ایسی چیز نہیں کہ چھپائے سے چھپ سکے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ صالحہ کے بھائیوں نے تاڑ لیا۔ چونکہ عبداللہ اپنی عسرت کی وجہ سے اُن کو نامناسب معلوم ہوتا تھا اور وہ عبداللہ سے خوش تھے اور اس کی دل شکنی بھی نہ کرنا چاہتے تھے لہذا انہوں نے بہتر خیال کیا کہ اس معاملہ کو یہیں کا یہیں روک دینا مناسب ہے۔ بڑے بھائی نے پہلے تو صالحہ کو بلایا اور حال دریافت کیا جن کے دل صاف ہیں اور ٹھیک ہیں ان کے دل میں کوئی وجہ نہیں کہ چور ہو۔ چنانچہ صالحہ نے بھائیوں سے صاف کہہ دیا کہ مجھ سے ایک مرتبہ عبداللہ نے نکاح کے لئے کہا تھا جس کا میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ علاوہ اس کے اُس نے کبھی مجھ سے کوئی غیر معمولی بات بھی

نہیں کی بڑے بھائی نے بہن کو گلے سے لگا کر کہا "اب تم عبداللہ سے بات نہ کرنا۔ وہ اچھا آدمی ہے مگر مزدور اور مفلس ہے"۔ صالحہ کے دل میں بھائی کی زبان سے عبداللہ کے بارے میں لفظ "اچھا" جو نکلا وہ گڑ گڑ کر رہ گیا۔ نہ معلوم کیوں یہ قدرتی امر ہے کہ اگر کسی کے بارے میں میرا خیال ہو جائے کہ اچھا آدمی ہے اور کوئی اس کی تصدیق کرے تو طبیعت کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہی حال صالحہ کا تھا؟ . . . . . شاید اس کے بعد اُس نے عبداللہ کو بلا کر علیحدہ منع کر دیا کہ صالحہ کے عقد کا خیال چھوڑ دے۔ یلغستان ہندوستان نہیں ہے اور وہاں جھوٹے بھی کم ہوتے ہیں۔ عبداللہ چونکہ اس خیال کو چھوڑنے والا نہ تھا۔ اس لئے کوئی وجہ اس کو نہ معلوم ہوئی کہ خواہ مخواہ وہ اس کا خیال چھوڑ دینے کا اقرار کرے۔ وہ مناسب پیرایہ میں حجت اور بحث کرنے لگا۔ تنگ آ کر بڑے بھائی نے تیز ہو کر عبداللہ سے پوچھا "تو عقد کیسے کرنا چاہتا ہے۔ کیا تیرے پاس مکان ہے؟"

"عبداللہ نے کہا نہیں"؟

"مویشی ہیں"؟

"ایک گھوڑا ہے جو میں مہ جبین کے مہر میں دوں گا"

طعنہ دے کر "وہ بھی چرایا ہوا"

عبداللہ تن کر بولا "بندے ہاتھوں سے چوری نہیں ہوتی۔ میں اپنے زور بازو سے لایا ہوں"۔

"علاوہ گھوڑے کے کچھ زمین تیرے پاس ہے یا نہیں؟"

"نہیں"

"علاوہ تن پر کے کپڑوں کے اور بھی نہیں؟"

"نہیں"۔

بھائی نے جل کر کہا "تو پھر آخر تیرے پاس ہے کیا؟ جو تو میری خوبصورت بہن کی قسمت پھوڑنا چاہتا ہے تیرے پاس رائفل تک نہیں ہے"

عبداللہ نے کہا "اس سے تمہیں کیا مطلب وہ قطعی مجھ سے راضی ہے اور میں اس کو آرام سے رکھوں گا"

"وہ نادان ہے" بھائی نے کہا "وہ ابھی کم عمر ہے" اپنا بھلا برا نہیں جانتی۔ یا تو تُو وعدہ کر کہ اب اس سے بات نہ کرے گا اور عقد کے خیال کو چھوڑ دے گا ورنہ یہاں سے دور ہو"

میں جاتا ہوں۔ مگر اچھی طرح سمجھ لو کہ میں عقد کے خیال کو ترک نہیں کر سکتا" یہ عبداللہ کا قطعی جواب تھا بھائی نے ایک طنزیہ "ہوں" سے کام لیا۔ عبداللہ نے اپنی بقایا مزدوری بھی نہ مانگی۔ اور وہاں سے چل دیا۔

عبداللہ کو مفت میں گھوڑا کیا ملا کہ شیر کے منہ کو خون لگ گیا۔[۴] اسے اپنی فلاح اسی میں معلوم ہوئی کہ یہاں یوں

کو مارو اور لوٹو۔ یہ دشمنِ دین ہیں اور ان کا مال حلال ہے۔ دو چار ہم خیال بہت ہی جلد مل گئے اور ہسپانی کیمپ میں شبخون مارنا ان کا معزز پیشہ ہوگیا۔ بہت جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہ بڑی عمدہ تجارت ہے۔ کچھ اور ساتھی مل گئے اور تھوڑے ہی دنوں میں خدا نے انہیں سب کچھ دے دیا۔ عمدہ عمدہ رائفلیں کارتوس سامانِ حرب عمدہ عمدہ کپڑے اور روپیہ پیسہ سب ہی کچھ ہوگیا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں ایک باحیثیت سردار ہوں تو وہ نہایت ہی شان سے صالحہ کے بھائیوں کے یہاں پہنچا۔ مگر بھائیوں نے پھر بھی انکار کر دیا اور کہا کہ ہم صالحہ کی شادی ایک رئیس شیخ سے طے کر رہے ہیں۔ عبداللہ بھائیوں کے لئے کچھ تحفے لایا تھا جو انہوں نے قبول نہ کئے مگر انہوں نے کہا کہ کم از کم کھانا کھا کر جانا۔ عبداللہ شام تک وہاں رہا۔ اور اس اثنا میں خوش قسمتی سے اس کو صالحہ سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ عبداللہ نے صرف اس سے اتنا پوچھا "شیخ اچھا ہے یا میں"؟ صالحہ نے کہا "تو اچھا ہے"۔

یہ الفاظ بمشکل صالحہ کے زبان سے نکلے تھے کہ منجھلا بھائی رائفل لے کر غلے کے انبار کے پیچھے سے نکلا۔ اس نے عبداللہ کو ڈانٹا تو عبداللہ نے بھی تیز ہو کر کہا "مجھ سے زیادہ اچھی طرح تیری بہن کو دنیا میں کوئی نہیں رکھ سکتا" اس کا جواب بھائی نے کچھ نہ دیا۔ صالحہ کا ہاتھ پکڑ کر اس نے گھسیٹا اور بڑے بھائی کے پاس لے گیا۔ صالحہ کو بڑے بھائی نے بھی ڈانٹا اور بطور سزا یا حفاظت کے اس کو غلہ کی ایک چوڑی مگر گہری کھتی میں قید کر دیا جو کھیتوں میں ایک اونچے مقام پر تھی اس کے بعد عبداللہ سے بھائیوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ "تم اب یہاں سے قطعی چلے جاؤ ورنہ وعدہ کرو کہ صالحہ سے عقد کا خیال چھوڑ دو گے" عبداللہ نے کہا "یہ ناممکن ہے"۔ تو انہوں نے کہا "تو پھر چلے جاؤ ورنہ اگر کھیتوں کے آس پاس ہم نے دیکھ پایا تو گولی مار دیں گے"۔ عبداللہ چلا گیا۔

وہاں سے تو وہ چلا گیا مگر اب اُس کے پاس روپیہ تھا اور اس نے بآسانی ایک مزدور سے معلوم کر لیا کہ صالحہ صبح سے شام تک دو چار روز کے لئے اُسی غلہ کی کھتی میں قید رہے گی کیونکہ انہیں احتمال تھا کہ شاید عبداللہ آس پاس ہو۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کھتی پر کوئی ڈھکنا نہیں۔ مگر نیچی ہونے کی وجہ سے صالحہ بغیر سیڑھی کے اوپر نہ آسکتی تھی۔ اتنا پتہ کافی تھا۔

عبداللہ تاک میں تھا دو تین روز بعد موقع پا کر جھٹپٹے شام کے وقت جب تمام مزدور وغیرہ بھائیوں سے مزدوری لینے میں مصروف تھے وہ اس کھتی پر پہنچا۔ رسی ڈال کر اس نے صالحہ سے پکڑنے کو کہا۔ صالحہ نے تامل کیا اور رسی کی طرف توجہ نہ کی تو اس نے رائفل نکال کر کہا کہ "تیرے گولی مار کر ابھی اپنے بھی مار لوں گا"۔ صالحہ کو کسی طرح منظور نہ تھا کہ اپنے بھائیوں کی مرضی کے خلاف جائے اور اس نے اس دھمکی کی پروا نہ کی تو عبداللہ نے سچ مچ رائفل مارنے کے لئے سیدھی کی۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اُس نے رسی پکڑ لی نہ اس وجہ سے کہ اس کو اپنی جان پیاری تھی بلکہ اسے عبداللہ کی جان کا بھی خیال تھا جس کو وہ اپنی وجہ سے خودکشی کرانا ہرگز نہ چاہتی تھی۔

صالحہ کو عبداللہ نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے چشم زدن میں اوپر لے لیا کیونکہ کھتنی زیادہ گہری نہ تھی۔ اس کو گھوڑے پر بٹھا کر اس نے سیدھا ان پہاڑوں کی طرف رُخ کیا جن کا سلسلہ دور سمندر کے کنارے تک چلا گیا تھا۔

عبداللہ کو زیادہ وقفہ نہ مل سکا۔ بھائیوں کو معلوم ہوگیا۔ پہاڑوں کے رہنے والے وہ خوب جانتے تھے کہ عبداللہ کس طرف جا سکتا ہے۔ بھائیوں نے اپنے تیز گھوڑے دوڑا دئے اور عبداللہ کو اندھیرے ہی میں پہاڑ کے دامن میں جا لیا۔ فوراً گولی چلنے لگی۔ اندھیرا بالکل نہ ہوا تھا اور عبداللہ نے اپنے دشمنوں کو دیکھا۔ وہ رُکا اور جو سب سے آگے تھا اُس کی طرف رائفل اٹھا کر فیر کیا۔ صالحہ سے اس نے کہا تھا کہ گولی گھوڑے کے ماروں گا۔ اور گھوڑے ہی کے لگی۔ مگر وہاں تو اب بھی آدمی درجن تھے۔ چشم زدن میں عبداللہ نے دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں میں گھرا جا رہا ہوں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ اتنے میں ایک گولی اس کے گھوڑے کے لگی اور وہ مع صالحہ کے گرا۔ مزدور آدمی تھا صالحہ کو بوجھ کی طرح اُس نے اپنے طاقتور ہاتھوں سے سنبھالا اور گھوڑا چھوڑ پہاڑ کی طرف بھاگا۔ اب اندھیرا ہوگیا تھا جس سے اُس نے فائدہ اٹھایا اور ٹوٹی پھوٹی سنگلاخ زمین میں جو پہاڑیوں تک چلی گئی تھی صالحہ کو لے کر ایسا غائب ہوا کہ بھائیوں نے بہت کچھ ڈھونڈا مگر نشان تک نہ پایا۔ صالحہ کی حالت عجیب تھی وہ ایک مردہ کی طرح تھی۔ صالحہ کے بھائی اپنی بہن کو ایسے بھلا کاہے کو چھوڑ دیتے وہ تلاش میں مشغول ہوگئے۔ اب وہ بھی پیدل تھے۔ وہ بھائی جس کا گھوڑا مارا گیا تھا گھوڑوں کو ایک جگہ لے کر بیٹھ گیا اور بقیہ نے پہاڑ کی گھاٹیاں اور جھاڑیاں دیکھنا شروع کیں۔

(۵)

عبداللہ صالحہ کو لئے ہوئے ایک ٹیکری پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایسی ایسی سینکڑوں ہی ٹیکریاں تھیں۔ تارے نکلے ہوئے تھے اور ایک سناٹے کا عالم تھا۔ عبداللہ کے ہاتھ میں رائفل تھی اور وہ چاروں طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ فاصلہ پر دھندلے میں اس کو کچھ نظر آیا تو اُس نے فوراً رائفل اٹھایا۔ "مت مارو" بدقسمت بہن نے گڑگڑا کر کہا "مت مارو" اور عبداللہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عبداللہ نے اس کو بچوں کی طرح لٹا کر خاموش کر دیا۔ رائفل کی آواز پہاڑوں میں گونجتی ہوئی سمندر تک چلی گئی اور عبداللہ کے منہ سے نکلا "وہ مارا" صالحہ پیشتر ہی سے ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رائفل کی آواز پر بقیہ بھائی آئیں گے لہذا فوراً اس نے صالحہ کو ساتھ لیا اور تیزی سے ٹیکری پر سے اتر کر پہاڑیوں کا دوسرا سلسلہ پکڑ لیا اسے بھی اس نے پار کیا اور نکل کر صاف میدان میں پہنچا۔ اس نے تیزی سے یہ حصہ پار کیا اور پہاڑیوں کا تیسرا سلسلہ پکڑ لیا جن کو اُس نے بڑی دشواری مگر تیزی سے پار کیا۔ لیکن صالحہ کے بھائی عبداللہ سے بھی چالاک نکلے۔ بجائے اس کے کہ وہ رائفل کی آواز پر جاتے وہ جان گئے کہ وہاں سے عبداللہ سرک گیا ہوگا۔ کہاں جائے گا؟ یہ وہ خوب جانتے تھے کیونکہ آگے کے دونوں پہاڑی سلسلے چھپنے کے کام کے ہی نہ تھے۔ فوراً انہوں نے تیزی سے راستہ کاٹ کر ایسا رُخ کیا کہ عبداللہ پہاڑی پار نہ کرنے پائے۔ عبداللہ نے مشکل سے دم لیا تھا کہ اس نے فاصلہ پر آسمان کی صاف و شفاف نیلگوں سطح میں متحرک چیزیں دیکھیں

جو ایک پہاڑ کی چوٹی پر تھیں۔ وہ بھائیوں کی تیزی اور چالاکی کا قائل ہوگیا کیونکہ وہ اب تیزی سے اتر کر نیچے سامنے سے اُسے گھیرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ وہ تیزی سے صالحہ کو لے کر نیچے اترا تو اس نے ایک بڑی سرنگ کا دہانہ دیکھا۔ یہ راستہ ہسپانوی گورنمنٹ پہاڑ کاٹ کر نکال رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس میں گھس کر پار نکل جاؤں کیونکہ اس کے سوا کوئی مفر ہی نہ تھا۔ اُس نے یہی کیا اور تیزی سے اُس پار نکل گیا۔ کچھ فاصلہ پر سمندر کی جانب اس کو روشنی نظر پڑی۔ جس کو وہ خود بچانا چاہتا تھا۔ وہ بائیں طرف مڑا اور تیزی سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ چار پانچ آدمیوں نے بے خبری میں اس کو اس طرح پیچھے سے آ لیا کہ وہ گرفتار ہوگیا۔ یہ لوگ ہسپانی تھے اور مزدور معلوم ہوتے تھے۔ شائد سرنگ پر کام کرنے والے تھے عبداللہ کو تن بہ تقدیر ان کے اشارے پر چلنا پڑا کیونکہ اس کی گردن پر ایک پستول کی نالی رکھی ہوئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ انگلی کے ایک اشارے سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

عبداللہ اور صالحہ کو یہ لوگ اسی روشنی کی طرف لے گئے۔ ایک سیاہ دروازہ کے مکان میں عبداللہ کو ایک آدمی کے سامنے پیش کیا گیا جو کرسی پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا گو عبداللہ کے ہاتھ پیر آزاد تھے لیکن دونوں بازو دونوں آدمی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ ہسپانوی زبان میں ان لوگوں نے کچھ باتیں کیں جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ صالحہ کو کسی دوسری جگہ علیحدہ لے جانے لگے۔ صالحہ نے زور لگایا اور اس طرح اپنے کو بچانے کی کوشش کی کہ تین آدمی اس کو کھینچ گھسیٹ کر بمشکل تمام لے جاسکے وہ عبداللہ کو مدد کے لئے پکار رہی تھی مگر عبداللہ جانتا تھا کہ ایسے موقع پر امداد کی کوشش کرنا دراصل ہمیشہ کے لئے امداد کی توقع کھونا ہے لہذا وہ چپ رہا گو وہ اسی طرح کھڑا تھا لیکن اب اس کی حالت ہی دوسری تھی۔ یکایک اُس کو خیال آیا کہ صالحہ مجھ پر بھروسا کر کے آئی تھی اور ان ناشائستہ لوگوں کے سامنے وہ فریاد کر رہی تھی اور مجھ سے مدد مانگ رہی تھی وہ خوب جانتا تھا کہ صالحہ کو کیوں وہ علیحدہ لے گئے ہیں۔ اس کے دل میں ایک چوٹ سی لگی تھی اور معاً خیال گذرا کہ کہیں میری امداد بے وقت ہو کر بیکار نہ جائے۔ وقت تھا تو یہی تھا۔ وقت پر مدد نہ کی تو بیکار ہے اور وقت پر مدد کرنے کے لئے اگر جان دے دی تو صالحہ کو لاکر ظالموں کے پنجوں میں پھنسا دینے کا کفارہ۔ یا اب یا کبھی نہیں۔ یہ سوچ کر اس نے دیکھا تو یہاں اب صرف تین آدمی تھے دو تو اس کو پکڑے تھے اور ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے دل میں کہا دو کے لئے تو میں کافی ہوں کہ اتنے میں اُس کو بھی کہیں لے جانے کے لئے موڑنے لگے۔ چشم زدن میں اس نے جھٹکا دے کر غوطہ مارا۔ پستول کے فائر کی آواز ہوئی۔ گولی اس کے گلے کو چاٹتی ہوئی چلی گئی اور قسمت کی خوبی کہ سامنے کرسی والے آدمی کے لگی جو وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اُٹھتے اُٹھتے عبداللہ نے دشمن کا پستول والا ہاتھ پکڑ لیا اور پستول چھین کر بجائے اس کے کہ استعمال کرتا اس نے جیب میں رکھ لیا کیونکہ وہ فیر کر کے دوسروں کو اس طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا قبل اس کے کہ اس کے دشمن کوئی کارروائی کرسکیں عبداللہ نے دونوں کو گرا کر دبا لیا اور دونوں کے سر لڑا لڑا دئے اور ایک خنجر سے جو اُس کے پاس تھا دونوں کو ذبح کر کے رکھ دیا۔

یہ لوگ جو صالحہ کو پکڑ کر دوسری جگہ لے گئے تھے ہسپانی مزدور تھے آوارہ بدچلن اور بزدل جس نیت سے صالحہ کو

علیحدہ رہ گئے تھے وہ خوب جانتی تھی۔ فی الحال انہوں نے صالحہ کو بالکل ایک ویسی ہی کھتی میں ڈال دیا جیسی کہ اُس کے کھیت پر تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ چوکور اور پختہ تھی اور اس کے اوپر لکڑی کا ایک بھاری تختہ رکھا تھا یہ تینوں شیطان کسی دوسری جگہ سے شراب پینے گئے تھے۔

صالحہ نے جب اندر اپنے کو مقید پایا تو ادھر ادھر دیکھا ایک لمبی سی بنچ اور ایک میز رکھی ہوئی پائی۔ فوراً اس کی سمجھ میں ایک تدبیر آگئی۔ میز پر اُس نے بنچ رکھی اور اس طرح بنچ کی اُس نے ایک خطرناک سیڑھی بنائی۔ اس پر چڑھنا کچھ آسان نہ تھا مگر وہ کامیابی سے ڈگمگاتی ہوئی اوپر تک پہنچ گئی۔ اوپر کے کنارے کو ہاتھوں سے پکڑ کر اس نے پیٹھ کا زور لگا کر تختہ کو اٹھا کر سر باہر نکالا اور رینگ کر باہر نکل آئی۔ چاروں طرف سناٹا تھا وہ ادھر ادھر گھومی۔ جس دروازے سے وہ لائی گئی تھی اس طرف تو وہ جانا نہ چاہتی تھی۔ دوسرے راستے کو تلاش کرنے لگی۔ ایک دوسرا دروازہ اسے نظر آیا اس نے کھولا۔ سامنے صاف کھلا میدان تھا وہ بے تحاشا سر پر پیر رکھ کر بھاگی۔

(۶)

عبداللہ دونوں مردوں کو ٹھنڈا کر کے منتظر تھا کہ اب کوئی اور آتا ہوگا لیکن اس کو چاروں طرف سناٹا معلوم ہوا۔ اس نے اپنے دل میں کہا کوئی نہیں ہے اور پھر صالحہ کو ڈھونڈنے کے لئے روانہ ہوگیا اتنے میں اس نے پیر کی آہٹ سنی اور وہ ایک جگہ چھپ گیا۔ وہ اس جگہ پہنچا جہاں صالحہ مقید تھی۔ اس نے روشنی میں دیکھا کہ ایک شخص نے قید خانہ کا تختہ اٹھایا اور حیران سا ہو کر ہسپانوی زبان میں تعجب کے لہجہ میں چلایا۔ وہ سیدھا دروازے کی طرف بھاگا۔ ادھر وہ گیا اور ادھر عبداللہ نے تختہ اٹھا کر اندر جھانکا اور حقیقت معلوم کر لی کہ صالحہ بھاگ چکی ہے۔ اتنے میں اس کمرے سے ایک ہولناک چیخ آئی جہاں تین لاشے پڑے ہوئے تھے۔ عبداللہ نے موقع کو غنیمت خیال کیا اُس نے وہ دروازہ کھلا پایا جس سے صالحہ گئی تھی اور وہ بھی نکل بھاگا۔ اب اس کے پاس اپنی رائفل اور خنجر تھا اور وہ کھلی ہوا میں آزادی کا سانس لے رہا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا کہ اس نے فاصلہ پر دیکھا کہ اندھیرے میں کوئی جا رہا ہے۔ یہ صالحہ تھی اور تیزی سے بڑھ کر اُس نے اندھیرے میں سلام کیا۔ صالحہ دوڑ کر اُس کے پاس آگئی۔ تفصیل بتانے کا وقت نہ تھا۔ عبداللہ صالحہ کو لے کر تیزی سے پہاڑوں میں گھس گیا۔

بہت دیر کی دیکھ بھال کے بعد عبداللہ ایک عافیت کے مقام پر پہنچا۔ یہ ایک اونچی ٹیکری تھی اور اس میں ایک غار نما کھوہ تھی۔ یہاں اس نے صالحہ کو بٹھا دیا اور دیر تک ارد گرد دیکھتا رہا مگر سناٹا رہا۔ جب اس کا اطمینان ہوگیا تو وہ غار میں آیا اور اس نے اپنا توشہ دان اور پانی کی بوتل نکالی۔ خود کھایا اور صالحہ کو کھلایا۔ وہ بالکل تھکا ہوا تھا اور صالحہ بھی تھک کر چور ہو رہی تھی سردی اپنا زور باندھ رہی تھی۔ عبداللہ دیوار سے تکیہ لگا کر اس طرح بیٹھ گیا کہ سامنے باہر کا منظر تھا۔ صالحہ کو اس نے اپنے زانو کا تکیہ لگا کر سلا دیا۔ رائفل ہاتھ میں لے کر دیوار سے سر ٹکا کر گویا سونے کا پورا انتظام کر کے

وہ جاگتے رہنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں نیند نے غلبہ کیا اور دنیا ومافیہا کی خبر نہ رہی۔
صبح عبداللہ کی آنکھ جو کھلی تو سورج نکل چکا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا تو صالحہ کو روتے پایا۔ اس نے کوئی خواب دیکھا تھا اور وہ رو رہی تھی۔ وہ باہر نکل کر بلندی پر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ صالحہ غار میں رو رو کر نماز پڑھ کر دعائیں مانگ رہی تھی۔ اُس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے صالحہ سے کہا "آج رات کو ہم اپنے گاؤں میں پہنچ جائیں گے" وہ چپہ چپہ سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ میں اس وقت کہاں کھڑا ہوں۔ دراصل یہاں سے بمشکل دن بھر کا راستہ تھا۔ مگر چونکہ صالحہ ساتھ تھی لہٰذا اس کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدھی رات تک پہنچ جائے گا۔ وہ صالحہ کو بلا کر اترنے ہی کو تھا کہ ایک گولی سناتی ہوئی اس کے سر پر سے نکل گئی اور رائفل کی آواز پہاڑوں میں دور تک گونجتی ہوئی چلی گئی۔ اُس نے گھبرا کر دیکھا۔ فاصلہ پر صالحہ کے بھائی تھے قبل اس کے کہ وہ گردن پھیرے دو گولیاں اور آئیں اور وہ زمین پر لیٹ گیا۔ صالحہ بھی لیٹ گئی۔ سرکتے سرکتے صالحہ کو لئے ہوئے وہ تیزی سے نیچے اترا۔ وہ چپہ چپہ سے واقف تھا۔ وہ لوگ پیدل تھے اور وہ جانتا تھا کہ ان پہاڑیوں میں داخل ہونے کے لئے انہوں نے اپنے گھوڑے کہاں چھوڑے ہوں گے۔ وہ صالحہ کو لے کر تیزی سے الٹا لوٹا۔ پہاڑوں کی سنگلاخ زمین پر آدھ گھنٹے کی دوش کے بعد وہ ایک جگہ پہنچا۔ یہاں اس نے صالحہ کو بٹھا دیا اور کہا تیار رہنا۔ دبے پاؤں وہ جھکا جھکا جا رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر اس نے ایک پتھر کی آڑ سے دیکھا کہ ایک آدمی محفوظ جگہ بیٹھا ہے اور سامنے اُس کے چھ گھوڑے کھڑے ہیں ایک دوسرا آدمی ایک خون آلود چادر اوڑھے یا تو سو رہا تھا یا مردہ تھا۔ وہ جان گیا کہ یہ اس بھائی کا لاشہ ہے جس کو اس نے کل گولی سے مارا تھا۔ اس نے رائفل اٹھائی اور نشانہ باندھ کر فائر کر دیا۔ لپک کر پہنچا اور ایک اور بھائی کو خون میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپتا چھوڑا۔ سب سے اچھا گھوڑا اُس نے لیا اور چڑھ کر سیدھا صالحہ کی طرف بھاگا۔ اس نے مڑ کر تعجب سے دیکھا کہ وہ بھائی جو خونیں چادر اوڑھے پڑا تھا مردہ نہ تھا بلکہ زندہ تھا۔ صالحہ سو رہی تھی۔ عبداللہ نے اس سے کچھ نہ کہا صرف چمکار کر تسلی دی اور گھوڑے پر جلدی سے بٹھا کر خود بھی سوار ہو گیا۔ یہ جا وہ جا

(۷)

لیکن صالحہ کے بھائی بھی آخر انہی پہاڑیوں کے رہنے والے تھے۔ فائر کی آواز پر دوڑے ہوئے آئے اور ایک اور بھائی کو خون میں تڑپتا پایا۔ اس کو تو وہیں چھوڑا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر پانچوں کے پانچوں عبداللہ کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

عبداللہ کا گھوڑا سب سے بہتر تھا اور اس کو موقعہ بھی مل گیا تھا مگر اس پر ایک کے بجائے دو سوار تھے۔ بار بار وہ مڑ کر دیکھتا تھا اور سوائے دشت وجبل کے کچھ اس کو دکھائی نہ دیتا تھا۔ گھوڑا صالحہ کی آواز "باخی" پر طرارہ مار مار کر زمین سے نکلا جاتا تھا۔ اس کے سات بھائی تھے اور سات گھوڑے تھے۔ سب بھائی گھوڑوں کو "اخی" کہتے تھے اور یہ بھی "اخی" کہتی تھی تاکہ گھوڑا جان جائے کہ کون سوار ہے۔ عبداللہ کو خیال تھا کہ اب اس

کی گرد کو بھی صالحہ کے بھائی نہیں پا سکتے اور اس نے دیر سے مڑکر بھی نہ دیکھا تھا اور گھوڑا اڑائے چلا جا رہا تھا کہ گولی کی آواز آئی جو سنسناتی ہوئی اس کے سر پر سے نکل گئی۔ عبداللہ نے مڑکر دیکھا اور غصہ میں آکر گھوڑا مقابلہ کے لئے پھیرا نشانہ باندھ کر تین فائر کئے جو سب خالی گئے اور وہ دیکھ رہا تھا کہ پانچوں بھائی گھوڑے جھونکے چلے آ رہے ہیں۔

صالحہ اپنے ہاتھوں سے آنکھیں بند کئے ہوئے رو رہی تھی۔ عبداللہ کے سر پر سے گولیاں اُڑی چلی جا رہی تھیں کیونکہ پانچوں بھائی بے محابا فیر کرتے چڑھتے چلے آ رہے تھے۔ عبداللہ نے سانس روک کر ہاتھ سادھ کر پھر نشانہ باندھا اور فیر کر دیا۔ اس کے منہ سے نکلا وہ مارا۔ صالحہ نے ہاتھ ہٹا کر فاصلہ پر ایک اور بھائی کو گرتے دیکھا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ عبداللہ بھاگا۔ "یا اخی" کہہ کر اس نے جنگی گیت گانا شروع کر دیا۔ واہ کیا سماں تھا! گولیاں اس کے سر پر سے گیت گاتی سنسناتی چلی جا رہی تھیں اور اس کے راگ کے ساتھ مل کر پہاڑ کی صدائے بازگشت کیا ہی مستانہ آوازوں کا سلسلہ پیدا کر رہی تھی۔ گاتے گاتے وہ مڑکر دیکھتا اور "یا اخی" کا نعرہ سن کر فرس طرارے بھرنے لگتا۔ وہ جھومتا گیت گاتا اور گولیوں کا راگ سنتا اڑا جا رہا تھا کہ ایک گولی اس کی ران میں لگی جو پار ہو کر صالحہ کی پنڈلی کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے بدن میں ایک برقی جھٹکا سا محسوس ہوا اور بس! پھر ایک سنسنی خیز لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اگر صالحہ نہ چیختی تو شاید اس کو علم بھی نہ ہوتا کہ میرے گولی لگی ہے۔ یہ گولی بس تازیانہ کا کام کر گئی۔ ٹانگ کو اس نے جھٹکا دے کر کہا "شکر ہے کہ ہڈی بچ گئی"۔ گھوما اور نشانہ باندھ کر متواتر چار فیر کئے اور ایک بھائی اور کم ہوا۔ "یا اخی" کہہ کر گھوڑا پھیر کر پھر اسی طرح اپنے قبیلے کے جنگی گیت گاتا اور گولیوں کے شیریں راگ سنتا اڑا چلا جا رہا تھا۔

دراصل صالحہ کے بھائی بیوقوف تھے جو بھاگتے ہی میں فیر کرتے تھے۔ عبداللہ اپنے کو خطرے میں ڈال کر گھوڑا روک کر فیر کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب صرف تین بھائی رہ گئے تھے۔

عبداللہ کو اگر خیال تھا تو صالحہ کا کہ وہ زخمی ہو گئی ہے۔ گو زخم بہت معمولی تھا۔ وہ اسی طرح گولیوں کے سائے میں اڑا چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک گولی اس کے بائیں بازو پر پڑی۔ خوش قسمتی سے وہ بھی پار نکل گئی مگر اس کا ہاتھ جھول گیا۔ غصہ کے مارے اس کے دل کا خون پیشانی پر پہنچا۔ خشمگین ہو کر اس نے گھوڑا پھیرا۔ صالحہ سر جھکائے عبداللہ کی گود میں ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ بیکار تھا لہٰذا اس نے صالحہ کے کندھے پر رائفل ٹکا کر تین فیر کئے "وہ مارا"۔ اب صرف دو بھائی رہ گئے۔ وہ عنقریب ختم ہونے والی جنگ کی فتح کے خیال سے خوش ہو رہا تھا اور گھوڑے کو "یا اخی" "یا اخی" کہہ کر صاف نکال لے جانا چاہتا تھا کہ اتنے میں اُس کے ساتھ ہی ساتھ دو گولیاں لگیں۔ ایک بایاں شانہ توڑتی ہوئی نکل گئی اور دوسری نے بائیں پیر کی پنڈلی کا قیمہ کر دیا۔ وہ جل کر پھر گھوما۔ اُس کا ہاتھ کام نہ کرتا تھا۔ مگر صالحہ کا کندھا اس کے بھائیوں کے قتل کے لئے موجود تھا۔ اُس نے اُس پر رائفل ٹکا کر لگاتار چار فیر کئے اور اب صرف ایک بھائی رہ گیا۔ اس نے پھر گھوڑا دوڑایا اور بھاگا۔

اب عبداللہ کی حالت خراب تھی۔ چار گولیاں کھا چکا تھا۔ اور خون کے فوارے بدن سے چھوٹ رہے تھے۔ پیاس کی شدت سے الگ بے تاب تھا مگر وہاں بھلا پانی پینے کی مہلت کہاں۔ وہ غیر معمولی طاقت کا جوان پٹھا تھا ورنہ اس کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو گھوڑے سے گر جاتا۔ لیکن اس کو اب ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں گر رہا ہوں اور اس نے صالحہ سے کہا کہ مجھے سنبھالے رہنا۔ گھوڑا "یا اخی" کی آواز پر طرارے بھرتا چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک گولی اس کے پٹھے پر پڑی۔ گھوڑا بدک کر دولتیاں مار کر بری طرح بھاگا اور "یا اخی" کے لفظ نے اور بھی تازیانہ کا کام کیا۔ گولیاں بدستور اپنا خوشگوار راگ سنا رہی تھیں گو کم تھیں۔ لنے میں گھوڑے میں جو غیر معمولی تیزی گولی کھا کر آگئی تھی وہ کم ہوتی معلوم ہوئی اور عبداللہ نے گھوڑے کو جھڑکی دی کہ "او نامرد ایک گولی میں تیرا یہ حال ہے" مگر وہاں گھوڑے کی حالت ہی خراب تھی۔ اب موت عبداللہ کے سامنے تھی۔ اس نے اپنا آخری کارتوس بہت نشانہ سادھ کر استعمال کیا۔ یہ اس کا آخری کارتوس اور آخری فیر تھا۔ رائفل اب گویا لٹھ تھی جس کو اس نے پھینک دیا بجائے سیدھے راستے کے اس نے گھوڑے کو اب ایک طرف کر دیا۔ گولیاں چلنا بند ہو گئیں۔ "کیا صالحہ کے بھائی کے پاس بھی کارتوس ختم ہو گئے" عبداللہ نے دل میں سوچا مگر پھر دل ہی نے جواب دے دیا کہ اب صالحہ کے بھائی کو اپنے کارتوس خراب کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ وہ اس کا نہ تو کچھ بگاڑ سکتا تھا اور نہ بھاگ کر جا سکتا تھا۔ گھوڑا ہلکا مگر تیز قدم چال جا رہا تھا اور عبداللہ کو تکلیف سی ہو رہی تھی کہ ایک دم سے گھوڑے نے گردن ڈال کر پھریری سی لی اور صالحہ اور عبداللہ کو لے کر منہ کے بل گرا۔ عبداللہ نے سنبھلنا چاہا مگر اپنے کو قطعی بیکار پایا۔ اس نے بمشکل گھٹنوں کے بل رینگ کر گھوڑے کے ماتھے پر شکریہ کا بوسہ دیا جو اب دم توڑ رہا تھا۔"

صالحہ کا بھائی اب قریب آ گیا تھا۔ عبداللہ نے صالحہ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا جو اپنا منہ ہاتھوں میں چھپائے ہوئے رو رہی تھی۔ عبداللہ نے صالحہ کے بھائی کو قریب آتا دیکھ کر اپنا خنجر نکال لیا۔ وہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا جھوم رہا تھا۔ بھائی نے دس پندرہ قدم کے فاصلہ پر پہنچ کر گھوڑا روک لیا۔ وہ اس عبرتناک منظر کو بھلا کن نظروں سے دیکھ رہا ہوگا۔ بدقسمت بھائی! قبل اس کے کہ وہ کچھ بولے عبداللہ بولا "بخدا جب تک میں زندہ ہوں اور میرے بدن میں ایک رمق جان بھی باقی ہے تو اپنی بہن کو مجھ سے نہیں لے سکتا۔ گولی میرے سینہ میں مارنا ورنہ تجھے بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔"

صالحہ نے اپنے روتے ہوئے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر عبداللہ کی بغل میں سے جھانک کر دیکھا کہ بھائی نے کندھے پر رائفل لگا لیا ہے اور فائر کرنا ہی چاہتا ہے۔ وہ کھڑی ہو گئی اور بھائی کو رائفل ہٹانا پڑا کہ کہیں صالحہ کے نہ لگ جائے کیونکہ عبداللہ جھوم رہا تھا اور بل کھا رہا تھا۔ عبداللہ نے مڑ کر صالحہ کو بٹھا دیا اور پھر بھائی کی طرف مخاطب ہو کر کہا "میں کہہ چکا کہ جب تک زندہ ہوں میں تیری بہن کو نہ چھوڑوں گا۔ میں نے کل سے اس وقت تک" عبداللہ نے اپنا خشک حلق تھوک سے تر کرتے ہوئے کہا "آٹھ قتل اس کی خاطر کئے ہیں جن میں سے چھ تیرے بھائی ہیں"

"وہ دو اَور کون ہیں"؟ یہ کہتا ہُوا صالحہ کا بھائی گھوڑے پر سے اتر پڑا۔

عبداللہ نے صالحہ کو اس طرح بغل میں دبا کر قابو میں کیا کہ گویا مالِ عرب پیشِ عرب" گویا صالحہ کا بھائی اسے چھیننے آرہا ہے۔ وہ بولا "جب تک میری جان میں جان ہے کہیں صالحہ کو واپس لینے کا خیال بھی دل میں نہ لانا" یہ کہہ کر اُس نے خنجر کو چمکایا لیکن بھائی رک گیا اور اس نے پھر پوچھا تو عبداللہ نے ان دونوں ہسپانوی مزدوروں کے قتل کا قصّہ سنایا۔

صالحہ کا بھائی کچھ فاصلہ پر بیٹھ کر اس دردناک منظر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے نہ معلوم کس سوچ میں پڑا تھا۔ عبداللہ پر کمزوری غالب آرہی تھی اور اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں میں بیہوش نہ ہو جاؤں اور صالحہ کا بھائی موت سے پہلے گویا زندگی ہی میں صالحہ کو نہ لے لے۔ اس نے کمزور مگر بلند آواز میں کہا "اگر تو مرد ہے تو مجھے جلدی مار دے اور میرے بیہوش ہونے کا مت انتظار کر"۔

بھائی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا بلکہ اپنی بہن کو پکارا "صالحہ۔ صالحہ۔ میرے ساتھ چلتی ہے"؟

عبداللہ نے نہ معلوم کس انداز سے صالحہ کی طرف دیکھ کر کہا "تیرا جی چاہتا ہے تو جا" کہ صالحہ بیقرار سی ہوگئی اور اس نے بجائے جانے یا جواب دینے کے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا کر رونا شروع کیا۔ صالحہ کا بھائی ایک عجیب پریشانی کے عالم میں تھا اور یہ سین اس کو بے تاب کئے ہوئے تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے کہا "صالحہ۔ صالحہ میرے ساتھ چل" عبداللہ نے کہا "بخدا اگر وہ جائے تو میں نہ روکوں گا"۔ صالحہ اسی طرح سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ عبداللہ نے پھر صالحہ کے بھائی سے بطور آخری اپیل کے کہا "مجھے مارنا ہے تو جلد مار کہ مجھ پر بیہوشی کا غلبہ ہو رہا ہے"۔ عبداللہ صالحہ کے بھائی کی طرف دیکھ رہا تھا جو سر جھکائے خدا جانے کیا سوچ رہا تھا کہ اس نے عبداللہ کے بار بار کے تقاضے پر عبداللہ کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور ایک عجیب لہجہ میں کہا "عبداللہ . . . . . . میں تجھ کو نہیں مار سکتا"

عبداللہ نے نا امید اور متعجب ہو کر پوچھا "کیوں"؟

صالحہ کے بھائی نے کہا "اس لئے . . . . اس لئے کہ مجھے تیرا وہ جملہ یاد آرہا ہے"۔

"کون سا جملہ"؟

"وہ جو تو نے اس روز مجھ سے کہا تھا جب میں نے تجھے اور صالحہ کو جھڑکا تھا"۔

عبداللہ پر کمزوری کے غلبہ کی وجہ سے بیہوشی طاری ہُوا چاہتی تھی مگر معلوم نہیں وہ کس طرح اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کا دماغ کام نہ کرتا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کا دماغ بیکار سا ہو رہا تھا۔ اس کو یہ بھی یاد آیا کہ اس نے کب جھڑکا تھا۔ اس نے کہا "وہ کیا جملہ تھا مجھے نہیں معلوم"

صالحہ کے بھائی نے کہا "تو نے کہا تھا . . . . . سچ کہا تھا . . . . . . اُس نے رُک رُک کر کہا "تو نے مجھ سے کہا تھا کہ تیری بہن کو مجھ سے زیادہ کوئی آرام سے نہیں رکھ سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ تو نے سچ کہا تھا اور میں مان گیا کہ

تجھ سے زیادہ کوئی دوسرا میری بہن کی قدر نہیں کر سکتا۔"

یہ وہی بھائی تھا جس سے عبداللہ نے یہ الفاظ کہے تھے اور اب اس نے خود دیکھ لیا کہ عبداللہ اُس کی بہن کے لئے کیا کچھ نہ کر چکا تھا اور کیا کچھ نہ کرنے کو تیار تھا۔

عبداللہ نے خنجر پھینک کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور صالحہ کے بھائی نے رائفل پھینک کر دوڑ کر اپنے زخمی بہنوئی کو گلے سے لگا لیا۔ بیہوش ہو کر گرتے گرتے عبداللہ نے صالحہ کے بھائی کی پیشانی چوم لی۔ صالحہ کا بھائی رو رہا تھا اور بوتل سے پانی لے کر عبداللہ کے گلے میں ٹپکا کر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

(۸)

اس واقعہ کے تین سال بعد کا قصہ ہے کہ حج کے موقعہ پر آٹھ آدمی ایک عورت اور ایک بچہ مکہ معظمہ میں میں نے دیکھے۔ اِدھر اُدھر کی چہل پہل میں دیکھا تو عجیب دلکش نظارہ تھا۔ دو برس کے بچہ پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آٹھوں فدا تھے۔ دورانِ طواف میں بچہ کبھی ایک کے کاندھے پر تھا تو کبھی دوسرے کے کاندھے پر۔ ان میں سے دو لنگڑے تھے۔ معلوم ہؤا کہ یہ مغرب الاقصیٰ کے باشندے ہیں۔ ان کے چہرے کس قدر اچھے تھے اور کس قدر جاذبِ نگاہ تھے۔ اس گروہ کے گروہ میں ایک عجیب کشش تھی۔ اگر ان میں سے کوئی بھی ذرا سا بچھڑ جاتا تھا تو دوسرے پریشان سے ہو جاتے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی گوارا نہ تھا کہ ایک دوسرے کی نظروں سے لمحہ بھر کے لئے بھی اوجھل ہو جائے۔ عورت عربی یا بالفاظِ دیگر مغربی حسن کی تصویر تھی۔ اس کا چہرہ خاموش اور سنجیدہ تھا مگر اس وقت اس کا خاموش اور متین چہرہ بھی اندرونی جذبات کو چھپا نہ سکتا تھا جب اس کا تندرست اور خوبصورت بچہ اس کندھے سے اُس کندھے پر جاتا تھا اور پیارے بوسوں سے اس کا معصوم چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ طرز و انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک کشیدہ قامت جوان جو اپنے ساتھ والوں سے ذرا مختلف ہے اس خاتون کا شوہر ہے۔

اس کے بعد میں نے مدینہ میں اس ٹولی کو گنبدِ خضرا کی چوکھٹ پر عقیدت کے پھول چڑھاتے دیکھا اور وہاں کا منظر ایسا تھا جو میں کبھی نہ بھولوں گا۔ مجبوراً میں نے اپنے گائڈ کی امداد سے ان اچھے لوگوں سے تعارف حاصل کیا اور پھر شام کو ان کی جائے قیام پر جا کر یہ قصہ جو بیان کیا گیا ہے سب کی زبانی سُنا۔ ایک ہی وقت میں بعض اوقات دو تین بھائی بولنے لگتے تھے اور کبھی کوئی واقعہ رہ جاتا تو دوسرا بتا دیتا۔

سب کچھ میری سمجھ میں آگیا مگر نہ سمجھ میں آیا تو یہ کہ آخر اتنی گولیاں چلیں اور کوئی نہ مرا۔ گولیوں کے نشان دیکھے جن میں سے دو کے داہنے سینہ کو توڑ کر عبداللہ کی گولی نکل گئی تھی۔ کسی کے شانہ میں لگ کر پشت کو توڑ کر نکل گئی تھی۔ ایک کے داہنی جانب پسلیوں کے نیچے عین کھال کی سطح پر گولی ایسی رکھی ہوئی تھی کہ ہاتھ سے پکڑ لو۔ میں دل میں کہہ رہا تھا کہ کاش یہ میرے پڑوسی ہوتے۔ وہ سب ایک ہی جگہ رہتے تھے اور بہت خوش تھے۔

جب ریف کی جنگ مجاہدِ اعظم عبدالکریم نے شروع کی تو بار بار مجھے ان بھائیوں کا اور عبداللہ کا خیال آتا تھا اور لوگ ہسپانوی شکست پر تعجب کرتے تھے اور میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے جنگ ہوئی تھی اور ختم بھی ہو گئی لیکن پھر بھی یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ کس طرح اتنی گولیاں چلیں اور ایسی ایسی جگہ لگیں لیکن کوئی نہ مرا۔

خوش قسمتی سے یہ معمہ بھی حل ہو گیا۔ ہسپانوی اور فرانسیسی طبی کمیشن کی رپورٹ کا حسبِ ذیل اقتباس قابلِ غور ہے جو ہسپانوی نمائندے نے فرانسیسی جرنیل سے جنگی مشاورت کے دوران میں کیا تھا اور جو اس کمیشن کے روبرو بطور شہادت کے پیش کیا گیا:-

"......... عموماً ریفی ایک گولی سے نہیں مرتے تاوقتیکہ وہ پھٹ جانے والی نہ ہو۔ ستر فی صدی ریف کے پہاڑی لوگ سینہ پر گولی کھا کر بھی بچ جاتے ہیں۔ بشرطیکہ دل محفوظ رہے۔ لیکن فرانسیسی یا ہسپانوی زخمیوں میں سے ستر فیصدی اس قسم کے زخمی ضرور مر جاتے ہیں۔"

عظیم بیگ چغتائی

فرشتے

مریض کے افسردہ بالیں کے قریب فرشتے استادہ ہیں کس قدر شیریں اور نرم ہے انکا لہجہ اور کتنے بےآواز ہیں انکے قدم اور وہ اُس مقدس جگہ کو اپنی آمد کا شرف بخش رہے ہیں جہاں ٹوٹے ہوئے دل بید مجنوں کی طرح سرنگوں ہیں وہ کھڑے ہیں مردوں اور زندوں کے درمیان! فرشتے اپنی سیمیں آرامگاہوں کو چھوڑ کر ہماری امداد کو آ موجود ہوتے ہیں ہم کو بر وقت امداد کے طالب ہیں وہ اپنے زریں پروں سے برق رو قاصد کی مانند افلاک دوّار کی دور دراز کی مسافت طے کرتے ہوئے ہمیں خبیث ارواح کی شیطنت سے بچاتے ہیں وہ ہمیں مامون و مصون رکھنے کیلئے مشغولِ جنگ ہوتے ہیں وقتِ معین تک ہماری حفاظت کرتے ہیں اور ان کی فوج کا کثیر حصہ پہرہ دیتا ہے تاکہ ہم بلاؤں سے محفوظ رہیں! یہ سب کچھ محبت کے صدقے میں سرانجام ہوتا ہے انعام کے لالچ سے نہیں:

مالکِ ارض و سما اپنے ارضی بیٹوں کی کس قدر توقیر کرتا ہے۔

خدائے قدوس نے ہر ایک جسمِ خاکی میں نورانی جسمِ فرشتہ ودیعت کر رکھا ہے جب تم برائی پر آمادہ ہو اور گناہ کے ارتکاب کا خیال ہو تو تم اسکے سیمیں پروں کی ریشمیں محبت سے معمور پھڑپھڑاہٹ کی آواز سے لذت یاب ہو گے، اگر تم نے التفات نہ کیا تو تمہاری خواہشاتِ نفسانی اس فرشتے کے لئے مدفن تعمیر کریں گی اور وہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کی گہری نیند سو جائے گا۔ مگر اس کی روحِ پاک عرش کی طرف پرواز کرتی ہوئی خلاقِ دو عالم کی گود میں جا بیٹھے گی جو ہی خلاقِ دو عالم جس نے اُس پاکیزہ ودیعت سے تمہیں موقر کیا تھا! (ترجمہ)

عبدالرحیم

محفلِ ادب

اللہ

نزولِ قرآن سے پہلے عربی میں اللہ کا لفظ خدا کے لئے بطور اسمِ ذات کے مستعمل تھا جیسا کہ شعرائے جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے. یعنی خدا کی تمام صفتیں اس کی طرف منسوب کی جاتی تھیں. یہ کسی خاص صفت کے لئے نہیں بولا جاتا تھا. قرآن نے بھی یہی لفظ بطور اسمِ ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا (۷ : ۱۷۹) اور اللہ کے لئے حسن وخوبی کے نام ہیں (یعنی صفتیں ہیں) پس چاہئے کہ ان صفتوں کے ساتھ اُسے پکارو.

کیا قرآن نے یہ لفظ محض اس لئے اختیار کیا کہ لغت کی مطابقت کا مقتضا یہی تھا یا اس سے بھی زیادہ کوئی معنوی موزونیت اس میں پوشیدہ ہے؟

جب ہم اس لفظ کی معنوی دلالۃ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس غرض کے لئے سب سے زیادہ موزون لفظ یہی تھا.

نوعِ انسانی کے دینی تصورات کا سب سے زیادہ قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے. مظاہرِ فطرت کی پرستش کا عہد ہے. اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی. اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لئے پیدا ہو گئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا. لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی کہ ایک ایسی ہستی کے تصور سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کی پیدا کرنے والی ہستی ہے. اس لئے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمران ہستی کا تصور بھی کم وبیش ہمیشہ موجود رہا اور اس لئے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور ان کی معبودانہ صفتوں کے لئے پیدا ہو گئے وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے سے اُس ان دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا.

چنانچہ سامی زبانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیت

کے معنی میں مستعمل رہی ہے اور عبرانی، سریانی، حمیری، عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا یہ لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف لام اور ہ کا مادہ ہے اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے کلدانی و سریانی کا "الاھیا" عبرانی کا "الوۃ" اور عربی کا "الہ" اسی سے ہے اور بلاشبہ یہی "الہ" ہے جو حرف تعریف کے اضافہ کے بعد "اللہ" ہو گیا ہے اور تعریف نے اسے صرف خالق کائنات کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

لیکن اگر "اللہ" "الہ" سے ہے تو "الہ" کے معنی کیا ہیں؟ علماء لغت و اشتقاق کے مختلف اقوال ہیں مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل "الہ" ہے اور "الہ" کے معنی تحیر اور درماندگی کے ہیں بعضوں نے اسے "ولہ" سے ماخوذ بتلایا ہے اور اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ پس خالق کائنات کے لئے یہ لفظ اس لئے اسم قرار پایا کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جانتا اور جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور ادراک کی درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے وہ جس قدر بھی اس ذات مطلق کی ہستی میں غور و خوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی یہاں تک کہ وہ معلوم کرے گا کہ اس راہ کی ابتدا بھی عجز و حیرت سے ہوتی ہے و انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے

اے بروں از وہم و قال و قیل من　　　خاک بر فرق من و تمثیل من

اب غور کرو خدا کی ذات کے لئے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے لفظوں میں اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کونسا ہو سکتا ہے؟ اگر خدا کو اس کی صفتوں میں پکارتا ہے تو بلاشبہ اس کی صفتیں بیشمار ہیں لیکن اگر صفات سے الگ ہو کر اسکی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے تو وہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ایک متحیر کر دینے والی ذات ہے اور جو کچھ اسکی نسبت کہا جا سکتا ہے وہ عجز و درماندگی کے سوا کچھ نہیں ہے فرض کرو نوع انسانی نے اسوقت تک خدا کی ہستی یا خلقت کائنات کی اصلیت کے بارے میں جو کچھ سوچا اور سمجھا ہے وہ سب کچھ سامنے رکھ کر ہم ایک موزوں سے موزوں لفظ تجویز کرنا چاہیں تو وہ کیا ہوگا؟ کیا اس سے زیادہ اور اس سے بہتر کوئی بات کہی جا سکتی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس راہ میں عرفان و بصیرت کی کوئی بڑی سے بڑی بات کہی گئی تو وہ یہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خود درماندگیوں کا اعتراف کیا گیا اور ادراک کا منتہی مرتبہ ہمیشہ یہی قرار پایا کہ ادراک کی نارسائی کا ادراک حاصل ہو جائے۔ عرفاء کے دل و زبان کی صدا ہمیشہ یہی رہی، کہ "رَبِّ زِدْنِي فِيكَ تَحَيُّرًا" ترونی بفرط الحب فیک تحیرا　وارحم حشا بلظی ھواک تسعرا

اور حکماء کی حکمت و دانش کا بھی فیصلہ ہمیشہ یہی ہوا۔　معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!

چونکہ یہ اسم خدا کے لئے بطور اسم ذات کے استعمال میں آیا اس لئے قدرتی طور پر ان تمام معنوں پر حاوی ہو گیا جن کا خدا کی ذات کے لئے تصور کیا جا سکتا ہے اگر ہم خدا کا تصور اسکی کسی صفت کے ساتھ کریں مثلاً الرب یا الرحیم کہیں تو یہ تصور صرف ایک خاص صفت ہی میں محدود ہوگا یعنی ہمارے ذہن میں ایک ہستی کا تصور پیدا ہو جائے گا جس میں ربوبیت یا رحمت ہے لیکن جب ہم "اللہ" کا لفظ بولتے ہیں تو فوراً ہمارا ذہن ایک ایسی ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اُن تمام صفات حسن و کمال سے متصف ہے جو اس کی نسبت بیان کئے گئے ہیں اور جو اس میں ہونے چاہئیں۔

یہ مضمون مولینا ابوالکلام کے ترجمان القرآن سے ماخوذ ہے۔　　　(نظام المشائخ)

فہرستِ مضامین ہمایوں





بابت ماہِ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء

تصویر۔ ملک الشعرا المانیہ

جہاں نُما

مشاہیر کے ارادے

جارج برنارڈ شا :-

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ارادہ نہیں کیا۔ نہ کبھی کسی سے میرا مقابلہ ہوا اور نہ کبھی کسی سے میں نے اپنی زندگی کے متعلق رائے لی جب کوئی موقع آیا میں نے اپنی فطرت کے تقاضے کے مطابق اس کا استعمال کیا میرے اعمال و اقوال کا مقصد کسی خاص قسم کی کامیابی حاصل کرنا نہ تھا ہیملیٹ کی طرح میرے دل میں ترقی کی ہوس کا جذبہ مفقود ہے میں غیر ارادی طور پر یہ کوشش کرتا ہوں کہ دنیا کو اپنی فطرت کا ہم آہنگ بنالوں میں اس حقیقت کا اظہار اس لئے کر رہا ہوں کہ میں نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ مشاہدہ ایسا ہی ہے جیسے میں آئینے میں اپنے بالوں کا رنگ دیکھتا ہوں دراں حالیکہ میرے دل میں مستقل طور پر اس کے متعلق کوئی احساس موجود نہیں ہوتا"

جان گالزوردی :-

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں نے کبھی عمداً کوئی خاص ہیجان انگیز فیصلہ یا ارادہ کیا ہو۔ مجھے یہ سب بالکل قدرتی اور میری طبیعت ہی کے اقتضا کا نتیجہ معلوم ہوتے رہے ہیں۔

برٹرینڈ رسل :-

میری زندگی فاوسٹ کی زندگی کی طرح نمایاں طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک زندگی اگست ۱۹۱۴ء سے پہلے کی اور دوسری اس کے بعد کی۔ زندگی کے پہلے حصے کے لئے میں اُس وقت ایک فیصلے پر پہنچا جب میں نے اقلیدس کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ اس نے اپنی ہر بات کی صداقت کے ثبوت پیش کئے ہیں لیکن اس انکشاف کے بعد میں سخت مایوس ہوا کہ اُس نے اپنے پیش کردہ حقائق کے ثبوت میں بعض ایسے مفروضات سے ابتدا کی ہے جن کی صداقت کی کوئی دلیل اس کے پاس موجود نہیں۔ چنانچہ میں نے اِس بات کی تحقیق کرنے کا اُس وقت فیصلہ کر لیا کہ ریاضی کی صداقت کو مسلّم سمجھنے کی کوئی وجہ بھی ہے یا نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے آئندہ ستائیس سال اسی کوشش کی نذر کئے۔ بالآخر مجھے احساس ہوا کہ اس باب میں جو کچھ میں کر سکتا تھا وہ میں کر چکا ہوں۔

میری زندگی کا دوسرا اہم ارادہ جنگِ عظیم کے ابتدائی دنوں سے تعلق رکھتا ہے جب میں نے تمام دلِ سے مجھے

کے طرزِ عمل پر کھلے طور سے غیر جانبدارانہ تنقید کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں میں نے جنگ کے سیاسی، اقتصادی اور نفسیاتی اسباب کی تحقیق کی، اور آخر مسئلۂ تعلیم سے دلچسپی لینی شروع کی۔

میرے پہلے ارادے کی محرک میری یہ زبردست خواہش تھی کہ مجھ پر کسی ایسے علم کا انکشاف ہو جس کی صداقت یقینی طور پر غیر مشتبہ ثابت ہو جائے۔

میرا یہ خیال نہیں کہ مادی ترقی یا اخلاقیات کا خیال میرے ان مقاصد کی تخلیق کا باعث ہوا تھا۔

دوسرے فیصلے میں ایک طرف تو میں تحقیقِ حق کے جذبے سے متاثر ہوا کیونکہ تمام حکومتوں کا پروپیگنڈا زیادہ تر دروغگوئیوں پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ میں رنج و غم کے اُس احساس سے متاثر ہوا جو میرے دل میں اُن نوجوانوں کے خیال سے پیدا ہوا تھا جن کی محض بے بنیاد وجوہ کے لئے قربانی دی جانے والی تھی"

رابندر ناتھ ٹیگور:-

"جو باتیں میرے اقوال و اعمال کی محرک ہوئیں ان میں سے اہم ترین باتیں یا تو بالکل غیر متوقع طور پر میرے دل میں پیدا ہوئیں یا اُن کی تخلیق ایسی کوششوں کے دوران میں ہوئی جو ہمیشہ طبیعت کی چھپی ہوئی طاقتوں کے انکشاف کا باعث ہوتی رہی ہیں"۔

دروغ گوئی میں عورتوں کی فوقیت

کولمبیا یونیورسٹی کی تجربہ گاہ کے پروفیسر میلر نے ثابت کیا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں جھوٹ بولنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ پروفیسر میلر پیشین گوئی کرتے ہیں کہ عورتوں کی آئندہ نسلیں بھی بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں اسی طرح بددیانت رہیں گی جس طرح کہ آج کل کی بڑی بوڑھیاں یا نوجوان عورتیں یا چھوٹی بچیاں ہیں۔

یہ عموماً زمانہ شناس اور چالاک بننے کے لئے یا کسی دوسرے شخص کے جذبات کی پاسداری کے لئے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بلا تکلف سفید جھوٹ بولتی ہیں۔ عورتوں کا یہ طرزِ عمل اُن کے نسوانی جذبات اور ان جذبات کے ردِ عمل سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

پروفیسر میلر نے بیان کیا ہے کہ وہ ان نتائج پر اُس وقت پہنچے جب انہوں نے پانچ سو سترہ گریجوایٹ طلبہ کی ایک مخلوط جماعت کے سامنے تیرہ مختلف مسائل پیش کئے۔ ان مسئلوں کے وہ حل جو مرد طلبہ نے پیش کئے بالکل ناکارہ ہونے پر بھی زیادہ دیانت دارانہ معلوم ہوتے تھے۔ لیکن وہ حل جو لڑکیوں نے پیش کئے تقریباً ان تمام میں چالاکی اور غیر دیانت دارانہ غور و فکر کا شائبہ موجود تھا۔

ڈاکٹر میلر کے قول کے مطابق عورتیں ایسا جواب دینے کو ترجیح دیتی ہیں جس میں حقیقت کو کُلی یا جُزوی طور پر دبانے کی کوشش کی گئی ہو۔

مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا رجحان اس قسم کے پُرفن جواب دینے کی طرف زیادہ ہے جن کا مقصد کسی دوسرے شخص کے جذبات کی پاسداری ہو۔

تصویروں سے عشق

جین ویلزل نے جو قطبِ جنوبی کا ایک سیّاح ہے اپنی کتاب "قطبِ جنوبی کی سی سالہ زندگی" میں بعض اس قسم کی حکایات درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قطبوں کے تنہا آباد کار اور تاجر بعض اوقات عورتوں کی تصویروں کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک آباد کار نے اپنے جھونپڑے کی دیوار پر ایک خوبصورت امریکن لڑکی کی تصویر لٹکا رکھی تھی، اور وہ اس پر اپنی پر اشتیاق نگاہیں جمائے ہوئے جھونپڑے میں مضطربانہ انداز سے ٹہلا کرتا تھا، پھر وہ بے اختیار اس تصویر کے ساتھ چمٹ جاتا، اسے بوسے دیتا، سسکیاں بھرتا اور کہتا "میری جان، میری پیاری!"

مصنف کہتا ہے کہ میں وہاں کھڑے ہوئے اُس کی یہ حرکات دیکھتا رہتا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اس دوران میں بڈھا آدمی برابر چیختا چلاتا اور واویلا کرتا رہتا۔ اس کے بعد وہ آہیں بھرتے ہوئے آگ کے نزدیک بیٹھ جاتا اور اپنا کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتا۔

مصنف لکھتا ہے کہ قطبِ شمالی کے بعض "راہب" کسی خیالی عورت کے متعلق خود بخود اپنے دل سے باتیں کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ وہ اس عورت کی طرف محبت بھرے خط بھی لکھتے تھے۔ بعض اور لوگ مختلف قسم کی عورتوں کو محبت آمیز خط لکھتے رہتے تھے۔ لیکن ان عورتوں کا فی الحقیقت کوئی وجود نہ تھا۔ یہ ان غریب الوطنوں کے اپنے ہی دماغی تصوّرات کا نتیجہ تھیں۔

امریکا کی نئی بائیبل

امریکا میں کتابِ مقدس کا ایک مستند نسخہ ۱۹۴۱ء میں چھپے گا۔ ڈین لوتھر اے ویگل جو امریکن سٹینڈرڈ بائیبل کمیٹی کے صدر ہیں کہتے ہیں کہ نیویارک میں کمیٹی کے ایک اجلاس میں نظرِ ثانی کی غرض سے کتابِ مقدس کے دہ سالہ مطالعے کا فیصلہ ہوا۔

ڈین ویگل نے بتایا کہ ۱۸۷۰ء میں ۲۷ انگریز فضلائے نے چونتیس امریکن فضلا کی شرکت سے کنگ جیمز بائیبل پر نظرِ ثانی کی۔ ان لوگوں نے نئے عہد نامے کی نظرِ ثانی پر تقریباً گیارہ برس اور پرانے عہد نامے پر چودہ برس

صرف کیئے۔

اس بات پر اتفاق کیا گیا تھا کہ متن کے متعلق اختلافات کی صورت میں انگریزی کمیٹی کا فیصلہ ناطق سمجھا جائے گا، لیکن چودہ سال کے بعد امریکن کمیٹی اس بات کی مجاز قرار دے دی گئی کہ وہ متن کے متعلق اپنی ترجیحات کے مطابق کتاب مقدس کا ایک نسخہ شائع کرلے چنانچہ امریکا کے مستند صحیح شدہ نسخے کا جو ۱۹۲۱ء میں چھپا متن وہی ہے۔

ڈین وِیگل کے قول کے مطابق انگریزی محاورے کے تغیر اور مذہبی مسائل کی جدید تحقیق نے مزید نظرِ ثانی کی ضرورت پیدا کردی ہے۔ انگریزی کمیٹی کی کوشش محض یہ تھی کہ لغت اور محاورے کو بدلے بغیر کنگ جیمز بائبل کے متن کو انگریزی زبان کی موجودہ حالت کے مطابق کردیا جائے۔

تصویری زبان کی نشأۃ الثانیہ

یہ عجیب بات ہے کہ ترقی کے اس زمانے میں ہم قدیم ترین دنیا کی بعض باتوں کی طرف واپس جارہے ہیں۔ ریلوے کی بین الاقوامی انجمن نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ تصویری نشانات استعمال میں لائے جائیں۔ یہ فیصلہ ہزارہا سال کی ایک پرانی رسم کی طرف لوٹنا ہے کیونکہ تحریر کی ابتدا حروف کے بجائے تصویری علامات سے ہوئی تھی۔ بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنوں پر غیر ملکی مسافروں کو عموماً جو دقتیں پیش آتی ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ٹکٹ گھر، کھانے کا کمرہ اور باہر نکلنے کا راستہ انہیں آسانی سے نہیں مل سکتا۔ لنڈن کے اُن اسٹیشنوں پر جہاں "بوٹ ٹرین" چلتی ہے انگریزی، فرانسیسی اور بعض اوقات جرمن اور ولندیزی زبان میں اعلانات لگے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن اس کے باوجود زیک اور پول مسافر "جو گم شدہ اسباب کا دفتر" وغیرہ "تلاش کرنا چاہتے ہیں پریشان نظر آتے ہیں۔ جب تصویری نشانات کا استعمال عام ہوجائے گا تو اس قسم کے مسافر بھی پریشان نظر نہ آئیں گے وہ نظر اُٹھا کر دیکھیں گے، یہاں تک کہ انہیں کسی دروازہ پر چھتری اور چھڑی کی ایک چلیپا نما شکل دکھائی دے گی۔ یہ گم شدہ مال کے دفتر کا دروازہ ہوگا۔ ٹکٹ گھر پر ایک بڑے ریلوے ٹکٹ کی تصویر لگی ہوگی اور باہر کا راستہ کھلے دروازے کی تصویر سے ظاہر ہوگا۔ اسی طرح کھانے کے کمرے پر ایک گرانڈیل چھری کانٹے کی صورت نظر آئے گی۔

"پھندستان"

کیا واقعی کوئی دنیا ایسی ہوسکتی ہے کہ بیوی ہے تو میاں پر نثار ہے، لیڈر ہے تو ملک کی بھینٹ ہے۔ بیٹا ہے تو باپ کا فرماں بردار، خدا ہے تو بندے کا غمگسار۔ اگر ہوسکتی ہے تو دنیا کیا ہو گی، اچھی خاصی قتل گاہ ہو گی۔ جہاں ہر کس و ناکس کا صبح و شام کا شغل یہ ہو گا کہ اور کچھ ہو نہ ہو اپنے آپ کو قتل ضرور کرلیں عجب نفسا نفسی کی دنیا ہو گی۔ ہر شخص اس ذلیل خود غرضی میں گرفتار ہو گا کہ سوائے اپنے اور سب کے کام آجائے حالانکہ ع بہت مشکل ہے مشکل میں کسی کا کام آجانا

ــــــــــ

ان خیالات کی اُدھیڑ بُن میں تھا اور سیر کرتے کرتے ایک کھیت کے قریب پہنچ چکا تھا کہ کچھ شور سنائی دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مضبوط مگر ننگا جنگلی سا انسان اچک کر ایکھ کے کھیت میں گھس گیا اور نہایت وحشیانہ طریقے سے ایکھ کو چبانے لگ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کھیت کی مالکہ جو کہ ایک معزز گائے تھی آنکلی۔ گائے نے آتے ہی اس جنگلی کو دبوچا۔ قریب تھا کہ جنگلی بھاگ نکلے مگر ساتھ کے کھیت سے جو ایک اونٹ کی ملکیت تھا اونٹ صاحب نمودار ہوئے۔ دونوں نے مارتے مارتے پہلے تو اس جنگلی کو ادھ موا سا کر دیا اور پھر رسّا باندھ اپنی آبادی کی طرف اس جنگلی کو لے چلے۔ محوِ حیرت میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا کہ اس تمام ماجرے کا انجام تو دیکھوں۔

گاؤں میں وہ جنگلی ایک پنچایت کے روبرو پیش کیا گیا۔ پنچایت ایک کافی بڑی پنچایت تھی۔ گھوڑے، بیل، کتے، مُرغے سؤر ہر جماعت کے نمائندے اس پنچایت میں شامل تھے۔ پہلے گائے نے اپنا قصہ بیان کیا۔ پھر اونٹ نے شہادت دی اور پھر پنچایت نے ایک دوسرے سے مشورہ شروع کیا۔

سؤر "بزرگوں سے سُنا ہے کہ یہ جنگلی کسی زمانے میں اس سرزمین میں بہت ظلم کیا کرتے تھے۔ میری رائے میں اس جنگلی کی سزا موت ہے ہمیں دریافت کرنا چاہیئے کہ کیا اس جنگلی کی لاش کسی کام آسکتی ہے یہ تو مجھے پتہ ہے کہ اس جنگلی کے بودار گوشت کو غذا کے کام میں لانا قطعی نامناسب ہے"۔

گھوڑا "نہایت ادب سے پنچایت سے التماس ہے کہ حسبِ ضابطہ سزا دی جائے۔ ہمارے بزرگ فیصلہ کر چکے ہیں کہ سخت سے سخت جرم کی پاداش میں بھی ظلم ناجائز ہے ہم اس جنگلی کے بزرگوں کی طرح خونخوار نہیں"۔

مُرغا "سچا، درست۔ مگر کب تک ہمارے خوبصورت کھیت ان وحشیوں کی دستبرد سے محفوظ نہ ہونگے؟"
آہو "میری رائے یہ ہے کہ اس جنگلی کو پھاڑ کر دیکھا جائے کہ ان کے جسم کے کس حصہ میں مادۂ شرارت ہے اگر ہو سکے تو ہمیں عملِ جراحی سے اس تمام جماعت کو اس نافہ سے محروم کر دینا چاہیئے۔
بندر "جو سزا بزرگوں نے تجویز کی ہے اس میں رد و بدل قطعی لازمی ہے۔ بندر قوم قدرے ضعیف ہو رہی ہے کیا وجہ ہے کہ ان جنگلی لوگوں کے دماغ سے بندروں کے دماغ میں پیوند نہ لگایا جائے۔
صدر پنچایت (شیر) "ہماری قوم نے اپنے زمانۂ جہالت میں اس جنگلی کے چند بزرگوں کو چکھا تھا میری رائے بطور ماہر یہ ہے کہ اس جنگلی کا ہر قسم کا استعمال غیر مناسب ہے۔ یہ جنگلی فطرت کی غلطی مجسم ہے اس لئے حکم ہے کہ وہی پرانی سزا اسے دی جائے یعنی نہایت گہرے سمندر میں ہر قسم کی خشکی سے دس میل دور اس جنگلی کو چھوڑ دیا جائے۔ پنچایت برخاست۔
پنچایت والے ادھر ادھر جو چلنے لگے تو محض اتفاق سے میں کتے اور بیل کے پیچھے پیچھے ہو لیا خیال یہ تھا کہ سنوں یہ لوگ کیا باتیں کرتے ہیں۔
کُتا۔ "جب اس قسم کے جنگلی کا مقدمہ پیش ہو تو مجھے ضرور رنج ہوتا ہے"۔
بیل "کیوں"؟
کُتا "بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارے ایامِ جاہلیت میں ان جنگلیوں کا کتوں سے سلوک اچھا تھا"۔
بیل "بالکل غلط۔ محض ان جنگلیوں کی بدولت کتوں اور بیلوں میں بے انتہا مخاصمت تھی۔ تمہیں تاریخ سے مس نہیں ورنہ تمہیں ضرور پتہ ہوتا کہ محض ان جنگلیوں کے ظلم سے مجبور ہو کر شریف ترین کتے بھی ہرن اور گیدڑ کا شکار کرنے لگ گئے تھے۔ یہ جنگلی درندے نہ صرف خود خونخوار تھے بلکہ باقی جانداروں کو بھی ذلیل عادات پر مجبور کرتے تھے"۔
کُتا "میری لاعلمی واقعی قابلِ رحم ہے مگر اس بات میں تو آپ مجھ سے ضرور متفق ہوں گے کہ ہماری پنچایت میں جب کبھی سوئر تقریر کرتا ہے تو نہایت ہی بے معنی تقریر کرتا ہے"۔
بیل "ہاں مگر اس کا قصور نہیں۔ اس سوئر کا مورثِ اعلیٰ ہندوستان کا رہنے والا تھا۔

لاحول ولاقوۃ۔ بھلی اچھی نیند نہ ہو تو کس کس قسم کے خواب آتے ہیں۔ ہندوستان! ہندوستان! ہندوستان!!! شکر ہے ہماری دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں۔

فلک پیما

رُباعیات

(۱)

فطرت کا سخن ہے ہمہ تن گوش رہو
گر ذوقِ حقیقت ہے تو بے ہوش رہو
مطرب ہے خدا ارگ ہے اُس کی دنیا
یہ ارگ جو سننا ہے تو خاموش رہو

(۲)

یکتا بھی نہ کہو کہ یہ ہی لاثانی ہے
یہ بھی نہ کہو کہ وہ ہی ربانی ہے
حیرت کدہ دیر میں دل والوں کو
ہر بات یہ حیرانی ہی حیرانی ہے

(۳)

یارانِ کرم دل پہ برس جانے دو
اس دشت میں ایثار کو بس جانے دو
اشیا کے تصرف میں کرو سب کو شریک
اپنا ہی بنانے کی ہوس جانے دو

(۴)

اے زینتِ اشعاعِ آسمانی ہے تو
فانی بھی ہے پھر بھی جاودانی ہے تو
جس نے کیا ظلماتِ جہاں کو روشن
انوارِ خدا کی وہ نشانی ہے تو

ب ۔ ا

قِصّہ نویسی و قِصّہ خوانی

ہر انسان کے دل میں قصے کا فطری شوق پایا جاتا ہے۔ مرد ہو یا عورت بچہ ہو یا بوڑھا عالم ہو یا جاہل وحشی ہو یا مہذب جسے دیکھو قصہ کا گرویدہ نظر آتا ہے۔ قصہ کا طلسمی اثر مکان وزمان کی قید سے آزاد ہے۔ اس کی سحر کاری کبھی ہمیں مختلف اقطاع عالم کی سیر کراتی ہے اور کبھی مختلف زمانوں سے گذار کر زمانۂ ماقبل تاریخ کے کُہر میں گم کر دیتی ہے بعض خشک مزاج لوگ قصہ خوانی کو تضیع اوقات کا موجب خیال کرتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھو تو قصے کی جگہ اور کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی۔ اعلیٰ درجہ کے قصے علمی و ادبی و تمدنی و معاشرتی اور اخلاقی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہ صرف بے انتہا بصیرت افروز ہوتے ہیں بلکہ جو کام باتوں ہی باتوں میں ان سے لیا جاسکتا ہے وہ ادب کے کسی اور شعبے سے نہیں لیا جاسکتا۔ یہاں یہ لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اچھے قصے اچھا اثر پیدا کرنے پر قادر ہیں وہاں بُرے قصوں کے اثرات بھی بعض اوقات نہایت مہلک ثابت ہو سکتے ہیں۔

قصہ کی عالمگیر دلچسپی کے مختلف اسباب ہیں۔ بچوں کو قصہ اس لئے مرغوب ہے کہ وہ اس میں اپنے جذبۂ عجوبہ پسندی کی آسودگی کے لئے وافر سامان موجود پاتے ہیں۔ قصہ سے نوجوانوں کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سنسنی پیدا کرنے والے واقعات اور پُر خطر مہمات کا بیان ان کی جوشیلی طبیعت میں ولولہ و ہیجان پیدا کرتا ہے معمر کاروباری لوگ قصوں کا مطالعہ اس غرض سے کرتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے اُن کو دنیاوی مخمصوں اور بکھیڑوں سے نجات ملے اور وہ کچھ دیر کے لئے کاروباری پریشانیوں کو بھول جائیں۔ بہر کیف جو چیز ان میں بطور قدر مشترک شامل ہے وہ یہ ہے کہ قصہ خوانی سے زندگی کے چند لمحے بفکری اور خوشی و خرمی کے ساتھ گذر جاتے ہیں۔ اسی غرض کی تکمیل کے لئے قدیم مشرقی درباروں میں داستان گو مقرر کئے جاتے تھے۔ قصہ کا یہ عام تفریحی مقصد اگرچہ بُرا نہیں کہلا سکتا تاہم اس کے ادنیٰ اور پست ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ جو قصہ تفنن طبع کا سامان فراہم کرنے کے علاوہ اور کوئی اعلیٰ مقصد پیش نظر نہیں رکھتا اس کی حیثیت گنجفہ و شطرنج یا دوسرے تفریحی مشاغل سے کسی طرح بڑھ کر نہیں ہو سکتی لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہر زمانے میں قصوں سے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام انجام پاتا رہا ہے۔ قصہ گوئی سب سے قدیم صنف ادب ہے۔ جس کا دامن ابتدائے تمدن کے ساتھ وابستہ ہے۔ شاعری کی طرح قصہ گوئی بھی اسی وقت معرض وجود میں آئی تھی، جبکہ انسان طرز تحریر سے بالکل ناآشنا تھا۔ لیکن قدیم زمانے میں بھی قصہ کے دو مقصد تھے ایک ادنیٰ دوسرا اعلیٰ۔

محض لطف و دلچسپی کا سامان فراہم کرنا اس کا ادنیٰ مقصد تھا اور اخلاق کی درستی اور معاشرت کی اصلاح کا زبردست آلہ بننا اس کا اعلیٰ مقصد تھا۔

تہذیب و تمدن کے ابتدائی دور میں تین قسم کے قصے رائج تھے۔ اول وہ قصے جن میں قومی بہادروں اور قبائلی سورماؤں کے کارنامے نہایت مبالغے کے ساتھ بیان کئے جاتے تھے۔ ان قصوں سے فرزندانِ قوم کو اپنے نامور اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے اور میدانِ جنگ میں جوانمردی اور شجاعت کے جوہر دکھانے کی ترغیب ہوتی تھی دوسرے وہ قصے جن میں بزرگانِ دین اور شہیدانِ ملت کی مقدس زندگی کے واقعات بیان کئے جاتے تھے تاکہ سننے والے کے مذہبی جذبات میں گرمی و اشتغال اور ان کے ایمان و یقین میں جوش و استواری پیدا ہو۔ تیسرے وہ قصے جو حسن و عشق کی دلچسپ داستان پر مشتمل ہوتے تھے۔ وحشی سے وحشی انسان کے دل میں بھی عشق و محبت کی گرمی پائی جاتی ہے اس لئے ہر زمانہ میں عشقیہ قصے قلوبِ انسانی کو تڑپاتے رہے ہیں۔ یہی قصے سب سے زیادہ پُرلطف اور دلچسپ ہوتے ہیں۔

لیکن تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قصے کے مقاصد میں بھی وسعت اور بلندی پیدا ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ قصہ اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا ایک زبردست آلہ بن گیا۔ اس میں حکمت و فلسفہ، الٰہیات و مذہب، مدن و سیاست اور دوسرے علوم و فنون کے نکات بھی بیان کئے جانے لگے۔ یہاں تک کہ قصے انسان کو رنج و غم میں تسلی دینے، اس کے اعتقاد و ایمان کو تقویت پہنچانے اور اس کی ہمدردی و شرافت کے جذبات کو اُبھارنے کا کام بھی انجام دینے لگے۔ آج کل کوئی بلند پایہ ادیب صرف لطف و دلچسپی پیدا کرنے کے لئے قصے تصنیف نہیں کرتا بلکہ چند اعلیٰ مقاصد بھی پیش نظر رکھتا ہے۔

سر والٹر ریلے کا بیان ہے کہ عہد الزبتھ کے لوگوں کو جدال و قتال کے واقعات سے بڑی دلچسپی تھی لیکن شیکسپیئر نے ان کی تشفی کے لئے ان کے آگے "ہیملٹ" پیش کیا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ "ہیملٹ" کا ڈراما صرف کشت و خون کے واقعات ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں سبق آموزی و عبرت انگیزی کے سامان بھی موجود ہیں۔ شیکسپیئر نے حیاتِ انسانی کے بہت سے رموز و اسرار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ غرض کہ وہی قصہ نویس صاحبِ کمال کہلانے کا مستحق ہے جس کی پیش کش لوگوں کی توقعات و مطالبات سے بڑھ کر ہو سکتی وہ۔ ہے جس کی بخشش کا باردستِ سوال سے اُٹھ نہ سکے اور قصہ نویس وہ ہے جس کے فسانوی چمن کے گلوں کی فراوانی قاری کی گلچینی سے درازدامنی کا مطالبہ کرے۔

جو پرانے قصے اور افسانے زمانے کا سرد و گرم دیکھنے کے بعد باقی رہ گئے ہیں ان میں سامانِ دلچسپی کے علاوہ بعض ایسی اعلیٰ خصوصیتیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں جو ان کی بقاو ثبات کا موجب ہیں۔ ہر بلند پایہ افسانوی تصنیف پڑھنے والے کی نظر میں وسعت اور معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے وافر مواد اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس میں مشاغلی اور افادت دونوں مضمر ہوتی ہیں۔ چنانچہ الف لیلہ، داستانِ امیر حمزہ، طلسمِ ہوش ربا وغیرہ بھی جن میں زیادہ تر خلافِ عادت و فوق الفطرت واقعات بیان کئے گئے ہیں سبق آموزی و بصیرت افروزی کے عناصر سے خالی نہیں ہیں

کیا یہ غیر فانی افسانے صرف ہمارے جذباتِ عجائب پسندی کے محرک یا مسکن ہیں؟ کیا ان کے مطالعہ سے بجز تفریح وتفنن کے اور کوئی مفید مطلب پورا نہیں ہوتا؟ کیا وہ زندگی کے مختلف شعبوں پر روشنی نہیں ڈالتے؟ کیا ان سے حیاتِ انسانی کے گوناگوں معاملات کی تشریح نہیں ہوتی؟ اگر ان کی دوسری اہم خصوصیتوں سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تو ایک یہی خصوصیت کیا کم ہے کہ وہ اپنے زمانۂ تصنیف کی اخلاقی ومعاشری کیفیتوں کی نہایت تفصیل کے ساتھ آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے قدما کے اخلاق و عادات، معتقدات ومزعومات، خیالات وتوہمات رسم ورواج۔ لباس وپوشاک، آدابِ مجلس، اصولِ معیشت، طرزِ معاشرت وغیرہ کی ایسی واضح وروشن تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے جو تاریخ کے صفحات میں کبھی نظر نہیں آسکتی۔ "الف لیلہ میں جنون، دیوؤں، پریوں اور ساحروں کا ذکر اس کثرت سے آتا ہے کہ بعض سطح آشنا نقاد ان قصوں کو محض طفلانہ دلچسپی کا سامان تصور کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت "الف لیلہ" کا باکمال مصنف قصہ نویسی کے اعلیٰ مقاصد سے بے خبر نہ تھا چنانچہ وہ اپنی عجیب وغریب تصنیف کے دیباچہ یا تمہید میں حمد ونعت کے بعد رقمطراز ہے کہ "اسلاف کے روشن کارنامے اور قدما کے سوانح حیات اخلاف کے لئے سراجِ منہاج ثابت ہوتے ہیں۔ مللِ سابقہ کی تاریخ اربابِ نظر کو فروغِ بینائی عطا کرتی ہے انسان کو چاہیئے کہ دوسروں کے واقعاتِ زندگی پر غور کرکے ان سے عبرت وبصیرت حاصل کرے۔ حمد وستائش کے لائق ہے وہ بزرگ وبرتر ہستی جس نے اپنی حکمتِ کاملہ سے اساطیر الاولین کو آنے والی نسلوں کے لئے شمعِ ہدایت بنایا۔ "الف لیلہ" بھی اخلاقی تعلیم کا بہترین مکتب ہے۔ اس کے ہر قصے میں حقیقت نگر آنکھوں کے لئے عبرت کا درس اور معرفت کا سبق موجود ہے"۔ اسی طرح وہ تمام قدیم افسانے جن کی بقائے دوام کی مہر جریدۂ عالم پر ثبت ہوچکی ہے۔ سبق آموزی کا وافر سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص محض دلچسپی اور وقت گذاری کے لئے قصے پڑھے اور کسی بلند تر چیز کی تلاش نہ کرے تو اس میں مصنف کا کیا قصور؟ تمام مشہور قصوں اور افسانوں میں کچھ نہ کچھ مفید باتیں ضرور ہوتی ہیں لیکن جب قاری کی سہل انگاری اور بے پروائی ان کی تلاش سے قاصر رہتی ہے تو وہ اپنے نقصِ بصر کا اعتراف کرنے کے بجائے مصنف کی کم لیاقتی کی شکایت کرنے لگتا ہے۔ اگر قصہ نویس مسلمہ قابلیت کا مایہ دار ہو اور ہیئتِ اجتماعیہ سے اپنے کمال کا لوہا منوا چکا ہو لیکن قاری کی کوتاہ نظر اس کی تصنیف کے نازک پہلوؤں اور باریک نکتوں تک نہ پہنچ سکے تو اسے اپنے ذہن کی نارسائی اور ذوقِ جستجو کے فقدان پر ماتم کرنا چاہیئے لیکن یہاں بھی پڑھنے والے کا غرورِ ہمہ دانی اپنے ضعف وعجز کا اقرار نہیں کرتا بلکہ مصنف ہی کے سر مشکل گوئی و تعقیدِ معنوی کا الزام تھوپ دیتا ہے۔ قاری میں اس قسم کی کمزوریاں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ افسانہ نگار کو تو اپنے فن کا ماہر ہونا ہی چاہیئے۔ لیکن ادبیات کے مطالعہ کے لئے بھی قواعد وضوابط مقرر ہیں جن سے ہر قاری کو واقف ہونا ضروری ہے۔ تفریح وتفنن کا شوق بری چیز نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنی تمام تگ ودو محض تفریحی مقصد کی

تکمیل کے لئے وقف کر دے اور مفید باتوں کی تلاش سے جی چرائے تو ارباب بصیرت کے نزدیک وہ کور مذاق سمجھا جائے گا۔ افسانوی ادبیات سے لذت اندوز ہونے اور اس سے کماحقہٗ استفادہ کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی تربیت اور اصلاح مذاق درکار ہے۔ ایک مغربی نقاد کا قول ہے کہ ہمیں کسی بلند پایہ افسانہ کا کم از کم دس بار مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ عجائب پسندی کے جذبات کی کامل سیر پذیری اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کے اشتیاق کی قطعی آسودگی کے بعد ہمیں قصہ کی گہرائیوں میں غوطے لگا کر حکمت و فلسفہ اور علم و اخلاق کے آبدار موتی نکالنے کا کافی موقع اور وقت ملے۔

ارباب نظر کا خیال ہے کہ فنون لطیفہ کی ہر پیداوار میں قصے کا عنصر مضمر ہوتا ہے۔ ہم کسی اختراع فنی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکتے جب تک ہمیں ان قصوں کا کامل ادراک و احساس نہ ہو جو اس کے اجزائے ترکیبی میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ ارسطو کا بیان ہے کہ تمام فنون لطیفہ کی بنیاد محاکات پر قائم ہے۔ محاکات صرف عالم خارجی کی مادی و مقرون اشیاء کے استقصا تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ قلبی وارداتوں اور ذہنی کیفیتوں کی مصوری بھی محاکات میں شامل ہے۔ قصہ کے عام و محدود مفہوم سے تو ہر شخص واقف ہے لیکن وسیع معنوں میں اس کا اطلاق ان نقوش تاثر پر بھی ہوتا ہے جو انسان کے آئینۂ قلب یا لوح دماغ پر مرتسم ہوتے ہیں۔ قصہ کا خاص موضوع انسانی زندگی کے واقعات و معاملات ہیں لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ احساسات و تاثرات بھی حیات بشری کا اہم جزو ہیں۔ اس لئے ان کا استقصا بھی قصہ گوئی کے دائرہ میں شامل ہے۔ البتہ جو قصہ جذبات کی گہرائیوں میں پوشیدہ رہتا ہے اس پر ہر کس و ناکس کی نظر نہیں پڑ سکتی بلکہ اس کی تلاش و دریافت کے لئے ژرف نگاہی کی ضرورت ہے۔ ہر انسان میں لٹریچر اور آرٹ یعنی ادب و فن کاری کی قدر شناسی کا مادہ اس کی ذاتی لیاقت و صلاحیت کے متناسب ہوتا ہے کسی شخص کی معلومات جتنی وسیع اور ذہنی تربیت جس قدر اعلیٰ ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ فنون لطیفہ سے محظوظ و متاثر ہوگا بہترین فنون لطیفہ میں معماری۔ سنگ تراشی۔ نقاشی۔ موسیقی اور شاعری کا شمار ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک فن کو قصہ سے خاص لگاؤ ہے۔ مثلاً مانڈو کی عالیشان عمارتوں کے کھنڈر زبان حال سے مالوہ کی قدیم عظمت و شوکت کی داستان سناتے ہیں۔ باز بہادر خاں اور روپ متی کے سرفروشانہ و جاں نثارانہ عشق و محبت کی یاد ان کھنڈروں میں رومانی اور ڈرامائی دلچسپی پیدا کر دیتی ہے جس سے دیکھنے والا محو حیرت بن جاتا ہے۔ کیا غار ہائے ایلورا کی بت تراشیوں اور کندہ کاریوں میں برہمنی۔ بودھی اور جینی دیومالا کے قصے خوابیدہ نہیں ہیں؟ کیا اجنٹا کے مغاری منادر کے در و دیوار جن تصاویر سے بسے ہوئے ہیں وہ بودھی جاتک کے قصوں کی ترجمانی نہیں کرتیں؟ ان نادر یادگاروں کی آفاق گیر شہرت و مقبولیت کا راز ان کے ضمنیاتی قصوں ہی میں تو مضمر ہے ورنہ ایک عامی شخص کے لئے جس کی علمی کم مائگی ان معنی خیز قصوں کی تعبیر و تشریح سے قاصر ہو قدیم صناعی و فن کاری کے یہ نادر نمونے کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اس کی

قدرناشناس آنکھوں کو مانڈو کے عمارتی کھنڈر سے قصبہ کا مسافرخانہ زیادہ بارونق ایلورا کے مغاری مندر سے گاؤں کا دیبی استھان زیادہ آباد اور اجنٹا کی نقاشیوں سے کپڑے کے تھان پر کی تصویریں زیادہ بھڑکیلی نظر آتی ہیں۔

موسیقی بھی خوابیدہ قصّوں کو بیدار کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اگر ایک طرف مطرب کی نواپیرائیاں فرحت و انبساط کے گذرے لمحوں کی یاد تازہ کرتی ہیں تو دوسری طرف مغنّی آتش نفس کی درد سرائیوں سے غم والم کے بیسیوں گزشتہ واقعات پیش نظر ہوجاتے ہیں۔ اب ذرا شاعری پر غور کیجئے۔ رزمیہ اور بزمیہ مثنویوں میں جنگ وجدال اور حسن وعشق کے قصے تو بیان ہوتے ہی ہیں لیکن داخلی شاعری بھی جس کی بہترین نمائندہ غزل ہے قصّوی عنصر سے خالی نہیں ہوتی۔ غزل کے اشعار میں دردِ دل کی کہانی کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے؟ شاعر کا گوشِ شنوا نہ صرف بزم طرب کی ہنگامہ آرائیوں، عنادل کی نغمہ پیرائیوں اور گلی کوچوں کے شور وغل میں بلکہ رات کی خاموشی، قبر کے سناٹے اور صحرا کی سکوں پرور فضا میں بھی حسن و عشق کی حکایتیں سنتا ہے اگر اس کے تخیّل کی پرواز ذرا اور بلند ہوئی تو اسے عالمِ ہُو میں بھی کسی کا فسانۂ دل سنائی دیتا ہے جس کا ذکر وہ اس طرح کرتا ہے۔

عالمِ ہُو میں کچھ آواز سنی جاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

لیکن ایسے قصے اور افسانے جسمانی کان سے نہیں سنے جا سکتے بلکہ ان کے لئے گوشِ حقیقت نیوش کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں قدیم زمانے سے یہ مقولہ چلا آرہا ہے کہ شعر فہمی شعر گوئی سے زیادہ مشکل ہے۔ کوئی شخص نکاتِ شعری کا اداشناس نہیں بن سکتا جب تک اُسے خداداد صلاحیت، مذاقِ سلیم اور گہری تنقیدی نظر حاصل نہ ہو۔ کچھ اشعار ہی پر موقوف نہیں بلکہ ہر اختراعِ فنّی کی قدرشناسی ان قصوں اور روایتوں کے علم وادراک کی رہینِ منت ہوتی ہے جو اس کی تہ میں پائی جاتی ہے۔ ایک عامی شخص کے لئے بھی کوئی خوبصورت تصویر یا مجسّمہ جنّتِ نگاہ اور کوئی دلپذیر نغمہ یا شعر فردوسِ گوش بن سکتا ہے لیکن جن روایات وتلمیحات کے وہ حامل ہوتے ہیں۔ ان کو پوری طرح سمجھے بغیر قلب میں اہتزازی وارتعاشی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ بغیر کسی اہتمام وتیاری کے ادبی کتابوں کو پڑھ لینا اور بات ہے لیکن ان سے کماحقہٗ حظ اندوز ومستفید ہونے کے لئے خاص قسم کی ذہنی تربیت اور اصلاحِ مذاق کی ضرورت ہے۔ اگر مصنف بننا ٹیڑھی کھیر ہے تو متعلم بننا بھی بڑا کٹھن کام ہے۔ اسی طرح قصہ خوانی بھی قصہ نویسی سے کم دشوار نہیں ہے۔ ممالکِ متمدنہ میں مطالعۂ ادبیات اور فنِ تنقید پر سیکڑوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ قاری کو اصولِ مطالعہ سے اچھی طرح واقف ہونا چاہئے۔

منظوم قصوں اور حکایتوں سے تو ہر شخص واقف ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ غزل کے متفرق اشعار کو جن میں وارداتِ قلبیہ وامورِ ذہنیہ کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ قصوں اور افسانوں سے کیا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے

کہ ہر قسم کی داخلی وخارجی شاعری میں قصوی عنصر شامل رہتا ہے جس کا انکشاف شعر کی اثر آفرینی کو المضاعف اور اس کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے بعض اشعار کے تو صرف مضامین ہی نہیں بلکہ الفاظ اور فقرے بھی مختلف روایات تلمیحات، حکایات یا تاریخی واقعات کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر سامع کا ذہن ان کی طرف منتقل نہ ہو تو اشعار کا گہرا اثر اس کے دل پر نقش نہ ہوگا۔ مثلاً مرزا غالب کا ایک شعر ہے کہ

ڈھونڈے ہے اس مُغنیِّ آتش نفس کو جی

جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

اس کا ظاہرا مفہوم تو صرف اس قدر ہے کہ شاعر ایک ایسے خوشنوا مغنّی کی تلاش میں ہے جس کی شیریں آواز اس کے لئے پیامِ موت ثابت ہو۔ لیکن صرف اتنا مطلب جان لینے سے کوئی شخص اس شعر کا پورا لطف اُٹھا نہیں سکتا نکتہ فہمی وبلاغت شناسی کا تقاضا ہے کہ ان قصوں اور روایتوں پر بھی عبور حاصل کیا جائے جن کی طرف اس شعر کے الفاظ جو فی الحقیقت "گنجینۂ معنی کا طلسم" ہیں اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں غور طلب امور یہ ہیں کہ مغنی کو آتش نفس کیوں کہا گیا ہے؟ موسیقی کو آگ یا گرمی سے کیا مناسبت ہے؟ طرب کی آگ کیونکر پیامِ مرگ بن سکتی ہے؟ روایت ہے کہ موسیقی کی ابتدا ققنس یا موسیقار نامی ایک عجیب الخلقت پرندے کی نوا سنجی سے ہوئی ہے۔ اس کی چونچ میں تین سو ساٹھ سوراخ ہوتے ہیں۔ جب یہ پرندہ ہوا کے رُخ پر بیٹھتا ہے تو اس کی چونچ کے ہر سُوراخ سے ہوا کے داخل اور خارج ہونے کے وقت نیا نیا راگ نکلتا ہے۔ جب پرندے کی عمر ایک ہزار سال کی ہو جاتی ہے تو وہ بہت سے تنکے اور لکڑیاں جمع کرتا ہے اور اُن پر بیٹھ کر گانے لگتا ہے۔ جب اس کی چونچ سے سب سے زیادہ سُریلا نغمہ یعنی دیپک راگ نکلتا ہے تو اس کے اثر سے تنکوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ پرندہ جل کر خاکستر بن جاتا ہے۔ جب اس کی خاک پر پانی برستا ہے تو ایک نیا ققنس یا موسیقار پیدا ہوتا ہے۔ بعض قومیں سورج دیوتا کو موسیقی کا موجد خیال کرتی ہیں۔ آفتاب کو نور وحرارت سے جو تعلق ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ "جلوۂ برق فنا" سے گوش آشنا ہوتے ہی کوہِ طور پر تجلّیِ ربانی کے نمودار ہونے، پہاڑ کے جل جانے اور حضرتِ موسیٰ کے غش کھانے کے قصہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مغنّی کی صدا کے پیامِ اجل ثابت ہونے کے متعلق بھی بیسیوں قصے زبان زد خلائق ہیں۔ مجلسِ سماع میں بہت سے بزرگ قوال کے نغموں سے متاثر ہو کر جاں بحق تسلیم ہو چکے ہیں۔ ان بزرگوں کے حالات تاریخ وتذکرہ کی کتابوں میں درج ہیں۔ کیا ان تمام قصوں سے واقف ہونے پر مذکورۂ بالا شعر کی دلچسپی وتاثیر میں بیحد اضافہ نہیں ہو جاتا؟

اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ قصے کے نہایت وسیع مفہوم سے تعلق رکھتا ہے لیکن عام طور پر قصے کے متعارف اصناف افسانہ، داستان، اساطیر، ناول اور ڈراما وغیرہ ہیں۔ اربابِ ذوق کے نزدیک وہ قصہ بالکل لغو اور بیکار ہے جس میں سنسنی اور تعجب انگیزی کی قربان گاہ پر صداقت وحقیقت کا بھینٹ چڑھا دیا گیا ہو۔ بعض نا اہل افسانہ نگار سنسنی

پیدا کرنے کے لئے ہیرو یعنی باطل قصہ سے بڑی بڑی مہمات سر کراتے ہیں لیکن جب اس کا موقف نہایت کمزور ہو جاتا ہے اور وہ ہر طرف سے خطروں سے گھر جاتا ہے جن سے نکلنے کی کوئی معقول تدبیر نہیں سوجھتی تو خواہ مخواہ خواجہ خضر یا کرشن جی یا کسی اور دیبی یا دیوتا کو امداد کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔ دیوتاؤں سے استمداد و استعانت بُری چیز نہیں ہے لیکن غیر مرئی ہستیوں کو انسانی روپ دھارن کرا کے انہیں ہیرو کے محافظ دستہ کا سپاہی بنا دینا سخت مضحکہ خیز امر ہے بعض چالاک قصہ نویس ابتدا ہی میں ہیرو کو کسی ولی یا فقیر سے بال سیمرغ یا طلسمی تعویذ دلا دیتے ہیں کہ وقت ضرورت کام آئے اس کے بعد وہ اپنے اشہب قلم کو صحرائے طلسم میں ہر قسم کی جولانی دکھانے کے لئے بے لگام چھوڑ دیتے ہیں کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وزیر دارالسلطنت سرور نگر میں ہے اور بادشاہ سلامت ہزاروں میل کے فاصلہ پر سندر بن میں شکار کھیل رہے ہیں۔ شکارگاہ میں کوئی حادثہ پیش آتا ہے۔ معاً وزیر ایک دستہ فوج کے ساتھ ہزاروں میل کا فاصلہ آن کی آن میں طے کر کے موقع واردات پر آدھمکتا ہے۔ بعض وقت نوعمر و نازک شہزادہ ایسے پرخطر ہفت خوان طے کرتے نظر آتا ہے جو رستم اور ہرقل سے بھی طے نہ ہو سکے۔ کبھی مکالمہ میں ایک بھولی بھالی لڑکی کی زبان سے ایسے ادق فلسفیانہ نکتے بیان کرائے جاتے ہیں جنہیں سن کر ارسطو اور افلاطون کی روحیں بھی پھڑک اٹھیں۔ اسی قسم کے فوق الفطرت وخلاف عادت واقعات نے افسانہ کو اس قدر بدنام کر دیا کہ افسانہ کا لفظ ہی جھوٹ اور غلط بیانی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ جب قصے یا افسانے کا صحیح موضوع انسان اور اس کے اعمال و افعال ہیں تو قصہ میں جو واقعات بیان ہوں انہیں ضرور حقائق زندگی کے مطابق ہونا چاہیئے یعنی ان میں صداقت پائی جانی چاہیئے۔ لیکن صداقت کا ہرگز یہ اقتضا نہیں ہے کہ روزمرہ زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں انہیں من وعن بیان کر دیا جائے یا افسانہ نگار اپنی ساری تگ و دو صرف ذاتی تجربات و مشاہدات کے تنگ حلقہ میں محدود رکھے۔ اور تخیل سے کام نہ لے جیسا کہ آج کل ناول نویسوں کے ایک گروہ کا خیال ہے جو "حقیقیین" (ریلسٹ) کہلاتے ہیں۔ چنانچہ انگلستان کی مشہور مصنفہ جارج ایلیٹ کا قول ہے کہ "افسانہ نویس کو اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے آگے قدم بڑھانا نہیں چاہیئے۔ دیہات کی پلی ہوئی لڑکی کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ شہری زندگی و معاشرت کی تصویر کشی کی کوشش کرے اسی طرح صنف نازک سے تعلق رکھنے والی مصنفہ کو ایسے مکالمے درج کرنے سے اجتناب کرنا چاہیئے جو صرف مردوں کی سوسائٹی سے مخصوص ہوں" لیکن جارج ایلیٹ کا یہ قول انتہا درجہ کی تنگ خیالی پر مبنی ہے۔ یہ صداقت نہیں بلکہ صداقت کی توہین ہے۔ اس پر عمل کرنا گویا تخیل کے پرو بازو کو توڑ دینا ہے۔ اس قسم کی صداقت کی ضرورت تاریخ اور سائنس میں ہو تو ہو لیکن افسانہ میں اُس وسیع و عالمگیر صداقت کی ضرورت ہے۔ جسے ارسطو نے "شعری صداقت" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ شاعری، ادب اور افسانہ کی صداقت تاریخ فلسفہ اور سائنس کی صداقت سے کہیں بالاتر ہے۔ ہر جدید دریافت یا اکتشاف سائنس کے مسلمات پر ایک ضرب کاری لگاتا ہے۔ اس لئے فلسفہ اور سائنس کے اصول و نظریات آئے دن بدلتے رہتے

ہیں بلکہ تاریخ پر بھی نظرثانی کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ لیکن "صداقتِ شعری" ہیں جس کا تعلق انسان کے جذبات و احساسات، اس کے فطری رجحانات اور طبعی خصائص سے ہے کبھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ خارجی عالم میں بڑے بڑے انقلابات و تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں لیکن انسان کی جذباتی و روحانی دنیا کے اصول و قوانین کبھی نہیں بدلتے۔ افلاطون نے اپنی مثالی جمہوریت "(آئیڈیل ریپبلک) سے دروغ باف" شاعروں اور افسانہ نویسوں کو خارج کر دیا تھا لیکن آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ افلاطون کی مثالی جمہوریت باوجود اپنی بلند بانگ فلسفیانہ صداقتوں کے صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی لیکن ہومر کی "ایلیڈ" اور "اوڈیسی" اپنی لازوال "حقیقتِ شعری" کی بنا پر آج تک قلوبِ انسانی کو گرما رہی ہیں اور ان کا جوش و اثر ابد الآباد تک یونہی قائم رہے گا،

غرض کہ افسانہ نویس کو حسابی صداقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن اسے لازم ہے کہ "شعری صداقت" کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دے۔ زندگی کے واقعات فطری و فن کارانہ اصول کے مطابق بیان کرے اور اس امر کا خاص لحاظ رکھے کہ اشخاصِ قصہ کا کوئی قول و عمل یا کسی وقت کسی مقام پر ان کی موجودگی خلافِ عادت و غیر متوقع نہ معلوم ہو ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ تمام فنونِ لطیفہ کی رونق اور چہل پہل تخیل و مبالغہ کی کارفرمائی کی منت پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے افسانہ نویس کو بھی تخیل و مبالغہ سے کام لینے کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہیئے بشرطیکہ وہ حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔ پروفیسر رچارڈس کا خیال ہے کہ قصہ میں حقیقت و صداقت کی نمکینی کے ساتھ تخیل اور مبالغہ کی شیرینی بھی پائی جانی چاہیئے۔ جوش اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کے پہلو بہ پہلو ایسی سنجیدہ و پُرمغز باتیں بھی بیان ہونی چاہئیں جو قاری کو غور و خوض کی دعوت دیں۔ بعض چیزیں صرف جذبات کو برانگیختہ اور بعض خاموشی کے ساتھ تدبر و تفکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ان دونوں قسم کے عناصر کی یکجائی پر افسانہ کی عظمت کا انحصار ہے۔ جس طرح تماشا گاہ میں مثلاً ایکٹر خط پڑھنے کے معمولی کام کو اعضا و جوارح کی حرکت، چشم و ابرو کے اشارے اور لب و لہجہ کے مبالغہ آمیز تغیر سے نہایت دلچسپ اور ڈرامائی بنا دیتا ہے اسی طرح افسانہ نگار کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ واقعات کو تخیل و مبالغہ کی آمیزش سے تصوری و مثالی بنا دے اور اپنی جادو بیانی سے ان میں اور زور پیدا کر دے۔ یہ ضروری نہیں کہ قصہ میں جو واقعات بیان کئے جائیں وہ اصلی و حقیقی ہوں۔ قصے محض فرضی و خیالی بھی ہو سکتے ہیں۔ قصہ نویس کو اختیار ہے کہ شروع میں وہ جو کچھ چاہے فرض کرے ہمیں احتجاج کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن واقعات منتخب اور اصول مقرر کر لینے کے بعد وہ پابند ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر ہم اس سے یہ مطالبہ کرنے کے مجاز ہوں گے کہ وہ اپنے مقررہ حدود سے باہر قدم نہ رکھے نہ اپنے اصولِ موضوعہ کی خلاف ورزی کرے۔

قصہ میں تناسب و توازن کا قائم رکھنا ضروری امر ہے۔ واقعاتِ قصہ پر ان کی اہمیت و ضرورت کے لحاظ سے اجمالی یا تفصیلی بحث ہونی چاہیئے۔ انسان کی وہ تصویر کس قدر بدہیئت اور بدشکل ہو گی جس میں ایک ہاتھ

کا کان اور بالشت بھر کے پاؤں بنا دئے گئے ہوں۔ اہم عناصر پر پوری توجہ نہ دینے اور ضمنی و جزئی باتوں کو خوب پھیلا پھیلا کر بیان کرنے سے قصہ بھی ویسا ہی کریہہ المنظر بن جاتا ہے۔ بہت سے قصہ نویس تناسب و توازن کے مسئلہ کی اہمیت سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ سر والٹر اسکاٹ جیسے زبردست افسانہ نگار کا دامن بھی اس عیب سے پاک نہیں ہے۔ کسی منظر یا مقام کا بیان قصہ کی علتِ غائی نہیں بلکہ محض ضمنی شے ہے۔ اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسی تصویر میں "عقبی منظر" (بیک گراؤنڈ) کی ہوتی ہے۔ لیکن سر والٹر اسکاٹ بعض موقعوں پر کسی منظر یا مقام کی تصویر کشی کے لئے صفحے کے صفحے سیاہ کرتا چلا جاتا ہے جس سے قاری بیزاری اور تکان محسوس کرنے لگتا ہے اور کبھی تو قصہ کا سلسلہ ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ ترتیبِ واقعات میں موقع و محل کا بھی خاص لحاظ رکھنا چاہیئے ورنہ قصہ ایک ایسی تصویر کے مانند ہوگا جس میں منہ کی جگہ ناک اور آنکھ کی جگہ کان بنائے گئے ہوں۔ افسانہ نویس کو کوئی خاص پیمانہ اختیار کر لینا چاہیئے۔ ابتدا میں وہ جو پیمانہ چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن ایک بار پیمانہ انتخاب کر لینے کے بعد اخیر تک اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔

بلند پایہ افسانہ وہی ہے جس میں حیاتِ انسانی اور نظامِ دہر کے متعلق غور و فکر کے شواہد پائے جائیں۔ قصہ کا موضوع بحث انسان ہے۔ اس لئے افسانہ نویس کو لامحالہ انسان کے باہمی تعلقات، اس کے خیالات و جذبات، میلانات و رجحانات، عزائم و مقاصد، رنج و خوشی، کشمکشِ حیات، اس کی جدوجہد، کامیابیوں اور ناکامیوں سے بحث کرنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی باکمال ادیب زندگی کے واقعات و معاملات کے متعلق اپنے ذاتی خیالات اور نقطۂ نظر کا اظہار نہ کرے البتہ وہ براہِ راست اخلاقی مسائل، فلسفیانہ نظریات اور حکیمانہ نکات کی تشریح نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنا صناعی و حسن کاری کے اصول کے منافی ہے تاہم اشخاصِ قصہ کی سیرت پر روشنی ڈالنے اور ان کے افعال و اعمال بیان کرنے کے ضمن میں وہ ایسی باریک باتیں بھی کہتا جاتا ہے جن کی اخلاقی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان باریک باتوں اور نازک نکتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا اور انہیں ایک نظام کے تحت لانا قاری یا نقاد کا کام ہے۔ شکسپیر کو معلمِ اخلاق ہونے کا نہ کبھی دعوے تھا اور نہ اس نے کوئی اخلاقی اصول یا فلسفیانہ مسئلہ پیش نظر رکھ کر اپنے ڈرامے تصنیف کئے تھے۔ لیکن پروفیسر مولٹن کا ذوقِ تلاش قابلِ ستائش ہے کہ انہوں نے شکسپیر کے ضخیم کلیات کے گوشہ گوشہ سے حکمت و اخلاق کے منتشر موتی چن کر انہیں ایک سلک میں پرویا اور اپنی غیر معمولی کاوش و کاہش کے نتائج کو ایک مبسوط کتاب موسومہ "شکسپیر کا نظامِ اخلاق" کی شکل میں علمی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اسی طرح ہر بلند پایہ افسانے یا قصے میں اخلاقی تعلیم یا معاملاتِ حیات کے متعلق بصیرت افروز نکتے مضمر ہوتے ہیں جن کی تلاش و تفحص کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ہر عظیم الشان قصہ ہیجان خیز واقعات کے ذریعہ سے ہمارے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے علاوہ اپنے سینے میں حکمت و اخلاق کے انمول موتی بھی پوشیدہ

رکھتا ہے جو ہر وقت جوہریانِ سخن کو دریائے فکر میں غواصی کی دعوت دیتے رہتے ہیں لیکن قاریوں کی کثیر تعداد آرام طلبی وسہل انگاری کی عادی ہے۔ وہ بحرِ فکر کی تاریک گہرائیوں میں غوطے لگانے کی حامی نہیں بھرتے۔ وہ تو بندھا بندھایا لقمہ چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ خود قصہ نویس ہر شے کو واضح طور پر ان کے آگے پیش کر دیا کرے۔ وہ اپنے تخیل کی مدد سے کسی قسم کے محذوفات یا کھانچوں کو پُر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے حالانکہ تمام نقاد پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ قاری کی حیثیت محض انفعالی نہیں ہے بلکہ ہر ادبی مہم میں اسے فاعلی حصہ لینا چاہئے۔ قاری اور مصنف کے درمیان ایک قسم کا ذہنی اتحاد پایا جانا چاہئے تاکہ ایک کے کام یا خیال کی دوسرے کا ذہنی تجربہ آسانی سے تعبیر و تشریح کر سکے۔ البتہ اس کے لئے قاری میں ایک خاص دماغی قابلیت کی ضرورت ہے جو بالعموم مفقود ہوتی ہے۔ قاری کی یہی تعبیری صلاحیت تمام ادبی قدردانیوں اور نکتہ فہمیوں کی کنجی ہے۔ اسی قابلیت کی کمی بیشی سے ایک ہی فنی پیداوار مختلف قاریوں پر مختلف اثر پیدا کرتی ہے۔ ورڈس ورتھ جو ذہنیتِ عامہ کا زبردست نبض شناس تھا قاری سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

"اے عزیز قاری تم نے صبر کے ساتھ اتنی دیر تک انتظار کیا۔ اب تم شاید یہ توقع کرتے ہو گے کہ میں کوئی دلچسپ قصہ بیان کروں گا۔ لیکن کون سی بات قصہ سے خالی ہوتی ہے۔ اگر تمہارے دماغ میں ان قوتوں کا ذخیرہ جمع ہوتا جو خاموش غور و فکر سے پیدا ہوتی ہیں تو تم ہر چیز سے ایک دلچسپ وسبق آموز قصہ اخذ کر سکتے ہو۔ اب بہت ہی کم باتیں کہنے کی رہ گئی ہیں لیکن اگر تم سوچ بچار سے کام لو تو انہیں منتشر اور مختصر باتوں سے ایک باضابطہ اور سلسلہ وار قصہ مرتب ہو سکتا ہے۔"

مشرقی شعرا کا بھی یہی خیال ہے کہ مجمل اشاروں سے قصہ کی تفصیل تیار کرنا قاری کا کام ہے۔ ورڈس ورتھ نے اپنی طول طویل عبارت میں قاری کو جس امر کی ہدایت کی ہے اسے مشرق کا ایک باکمال شاعر صرف ایک مصرع میں یوں ادا کرتا ہے کہ

"تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل"

غرض کہ اصل قصہ کتاب کے صفحات میں نہیں بلکہ خود قاری کے دماغ میں موجود ہوتا ہے۔ کوئی بڑا ادیب یا شاعر صرف خام مواد فراہم کرتا ہے۔ اس مواد کے صحیح استعمال سے قصہ وجود پذیر ہوتا ہے۔ بہترین قصے وہی ہیں جنہیں خود قاری اپنے غور و فکر سے مرتب کرے۔ آج کل فنونِ لطیفہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ امور کی تشریح و توضیح کا کام قاری پر چھوڑ دینا چاہئے۔ صناع کا فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ اشارے اور کنائے بہم پہنچا کر قاری کی رہبری کرے۔

لیکن یہ باریک باتیں صرف اُن قصوں سے تعلق رکھتی ہیں جو فنونِ لطیفہ کی پیداوار اور خصوصاً شاعری میں مضمر رہتے ہیں لیکن افسانوں ناولوں اور ڈراموں میں جو قصے کی عام اور متعارف صورتیں ہیں خود مصنف تمام واقعات کو ایسی صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے کہ قاری کو مزید تفصیل و تطویل کی مطلق فکر نہیں کرنی پڑتی بلکہ اس کے برعکس وہ ایجاز و اختصار کا جویا ہوتا ہے۔ چنانچہ آج کل مغربی دنیا میں مشہور و معروف افسانوں اور ناولوں کے مختصر ایڈیشن آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بہت کم لوگ ضخیم افسانوی کتب کے مطالعہ کی زحمت برداشت کرتے ہیں عام طور پر مختصر ایڈیشن ہی شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور مدرسوں میں وہی شریکِ نصاب بھی ہوا کرتے ہیں۔ بہرکیف متعارف قصوں کے اہم عناصر "پلاٹ" (ڈھانچہ) اور "کردار" ہیں۔ پلاٹ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے تمام اجزا کی تنظیم و ترتیب میں تناسب و توازن پایا جائے۔ واقعات کی رفتار مسلسل ہو تاکہ بات سے بات پیدا ہوتی جائے۔ قصہ میں کہیں کھانچیں نظر نہ آئیں اور نہ کہیں متضاد باتیں بیان ہوئی ہوں۔ واقعات اگر فرضی و خیالی ہوں تو مضائقہ نہیں لیکن ان میں ربط ترتیب اور تسلسل کا پایا جانا ضروری امر ہے۔ پلاٹ کے ضمن میں سب سے مہتم بالشان مسئلہ انتخابِ واقعات کا ہے لیکن موجودہ افسانہ نویسوں کی ایک جماعت مسئلہ انتخاب کو لغو اور بے معنی قرار دیتی ہے۔ یہ جماعت "حقیقیین" (ریَلسٹ) کی ہے حقیقیین کا خیال ہے کہ چونکہ افسانہ یا قصہ حیاتِ انسانی کے کسی جُز کی محاکات ہے اس لئے چند واقعات کا انتخاب کرنا اور بقیہ کو غیر اہم و غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دینا مناسب نہیں ہے۔ قصہ میں کسی جزوِ زندگی کا ٹھیک اور صحیح چربہ اسی وقت اتارا جا سکتا ہے جب کہ اس جزو کے متعلق تمام واقعات مع تفصیلات و جزئیات کے بیان کئے جائیں۔ زندگی یا جزوِ زندگی کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی جب تک تمام جزئی اور ضمنی باتوں کا بھی استقصا نہ کیا جائے خواہ وہ کتنی ہی پیچیدہ و نازک کیوں نہ ہوں۔ اصولِ انتخاب پر عمل کرنے سے تصویر ناقص و ناتمام رہے گی لیکن "حقیقیین" کی یہ تجویز نہ صرف فن کارانہ نقطۂ نظر سے معیوب ہے بلکہ ناممکن العمل بھی ہے کیونکہ حقیقی زندگی ایک سرمدی سرچشمہ ہے جس کا پانی ہمیشہ بہتا رہتا ہے اور جس کی نہ کہیں ابتدا ہے نہ انتہا جس طرح دریا کا پانی الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح زندگی کے واقعات ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے زندگی کو اجزا میں تقسیم کرنا بھی ناممکن ہے کیونکہ ہر جز یا حصہ کے لئے ایک مقام سے شروع ہو کر دوسرے مقام پر ختم ہونا لازمی امر ہے لیکن واقعاتِ زندگی کا آغاز و انجام نامعلوم ہے۔ مثلاً امان اللہ خاں کی تخت سے معزولی ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن بچہ سقہ کی کامیاب بغاوت کو اس کا سبب اور نادر خاں کے برسرِ حکومت آنے کو اس کا نتیجہ قرار دینا محض طفلانہ خیال ہے۔ ایک ہوشیار مورخ اس واقعہ کو ہزاروں اسبابِ قریبہ و بعیدہ سے منسوب کرے گا۔ اسی طرح اسبابِ نظر کے نزدیک اس کے نتائج کی کثرت بھی محیر العقول ثابت ہوگی۔ مورخ جتنا زیادہ غور و فکر کرے گا اتنا ہی اس واقعہ کے علل و اسباب اور عواقب و نتائج کا سلسلہ دراز ہوتا جائے گا۔ یہی حال ہر قسم کے واقعاتِ زندگی کا ہے۔ سچ پوچھو تو ہم

محض اپنی کم عقلی و کوتہ فہمی کی بنا پر کسی واقعہ کے آغاز و انجام کی حدیں مقرر کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں زندگی کا ہر واقعہ اپنے اثر و تاثر اور عمل و تعامل کے لحاظ سے بے پایاں و لامحدود ہے۔ علاوہ بریں پارچۂ حیات میں واقعات کا تانا بانا اس قدر پیچیدہ ہے کہ کسی خاص واقعہ کے دھاگے کو الگ کرنا اور اس کے اور چھور کا پتہ لگانا سخت دشوار کام ہے۔ کامل زندگی تو درکنار کسی جزوِ زندگی کے واقعات بھی اپنی کثرت کے لحاظ سے احصاء و شمار کے باہر ہیں ان سب کا جائزہ لینا انسان کے بس کی چیز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی پیچیدہ گتھی کے سلجھانے سے بڑے بڑے مفکروں اور فلسفیوں کا ناخنِ تدبر بھی ہمیشہ قاصر رہا کیا ہے۔ بہرکیف انسانی زندگی کی ہوبہو محاکات کی جتنی دشواریاں اب تک بیان ہوئی ہیں وہ محض انفرادی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابھی اجتماعی زندگی کی مشکلات پر غور کرنا باقی ہے۔ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے وہ معاشرہ سے الگ رہ کر شائستہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ ہر شخص اپنے معاشری ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور زبردست شخصیتیں سوسائٹی پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں کسی شخص کے واقعاتِ زندگی بیان کرنے کے ضمن میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس نے کس حد تک سوسائٹی کے خیالات و جذبات اخذ کئے ہیں اور دوسروں پر اس کے قول و فعل کا کیا اثر پڑا ہے۔ مثلاً امان اللہ خاں کی معزولی کے اسباب و نتائج پر بحث کرتے وقت مورخ کو غور کرنا ہوگا کہ مختلف مشرقی و مغربی سوسائٹیوں کے خیالات و رسوم سے وہ کس حد تک متاثر ہوئے تھے اور خود ان کے رویہ اور کردار نے افغانستان کے عوام و خواص پر کیا موافق یا مخالف اثرات پیدا کئے۔ معاملاتِ حیات کی تصویر کشی کے ضمن میں بحث کا ایک اور اہم پہلو باقی ہے جو شخصی رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی واقعہ پر ہر شخص اپنے ذاتی مذاق و میلانِ طبع کے مطابق حکم لگاتا اور فیصلہ صادر کرتا ہے۔ مشاہدہ کرنے والوں کے نقطہ ہائے نظر جداگانہ اور ان کی رائیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک ہی واقعہ کو ایک فریق اچھا اور دوسرا برا خیال کرتا ہے۔ امان اللہ خاں کی معزولی پر باغی قبائل کو بے حد خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔ لیکن ہندوستان کے اکثر اخبار و جرائد خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ کیا "حقیقیین" بتا سکتے ہیں کہ جب کسی واقعہ کو ہر شخص اپنے مذاق و میلان کے رنگ میں دیکھتا ہے تو اس کا اصلی رنگ کیا ہوگا؟ علاوہ بریں انسان کا علم محدود اور زندگی کے مظاہر لامحدود ہیں۔ محدود سے لامحدود کا احاطہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایک مغربی نقاد کا قول ہے کہ جب انسان کی محدود نظر ایک مختصر سے کرے کی ساری کائنات کا بھی پورا جائزہ لینے سے قاصر رہتی ہے تو وہ حقائقِ زندگی کا مشاہدہ کیا خاک کر سکتی ہے۔ ان تمام امور کے پیشِ نظر "حقیقیین" کا بلند بانگ دعویٰ کہ وہ انسان کی زندگی یا کسی جزوِ زندگی کا ہوبہو چربہ اتار سکتے ہیں کس قدر لغو اور بے بنیاد معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ نویسوں اور سوانح نگاروں کے لئے مذکورۂ بالا مسائل نہایت مفید اور دلچسپ ثابت ہوں گے کیونکہ ان کو حقائقِ واقعہ کی تلاش رہتی ہے۔ لیکن اگر افسانہ نگاران میں الجھے تو کوئی عظیم الشان قصہ معرضِ وجود میں آ ہی

نہیں سکتا۔"حقیقیین"کے بالمقابل افسانہ نگاروں کا دوسرا گروہ "صنّاعین" کا ہے۔"صنّاعین" قصہ کو دوسرے فنّی اختراعات کی طرح تخیّل کی پیداوار خیال کرتے ہیں۔ وہ اُن تمام اصول وضوابط پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو فنونِ لطیفہ سے مخصوص ہیں۔ وہ زندگی یا جزوِ زندگی کی عکسی تصویر پیش کرنے کا دعوے نہیں کرتے بلکہ وہ چند امتیازی اور نمایاں واقعات لے کر ان کی معیّن ابتدا و انتہا اور قطعی سبب ونتیجہ فرض کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذہن میں قصہ کا خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔ وہ غیر ضروری تفصیلات وجزئیات کو جن سے پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ترک کر دیتے ہیں لیکن ضرورت کے وقت ربط وتسلسل کی خاطر اپنے دل سے نئے نئے واقعات گھڑ بھی لیتے ہیں۔ اس ترکیب سے پورا قصہ واضح، روشن اور سہل الفہم بن جاتا ہے۔ زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے وہ قصہ میں حرکت اور روانی دکھانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ حرکت اور زندگی لازم وملزوم ہیں حرکت ہی زندگی کی روح وروان ہے ورنہ سکون جمود وموت کا مترادف ہے۔ کوئی قصہ زندگی کی نمائندگی نہیں کر سکتا جب تک اس میں حرکت نہ پائی جائے۔ لیکن یہ حرکت پانی کے بہاؤ کی سی نہیں ہوتی۔ بہتے پانی کے سالمات یا اجزائے ترکیبی ایک دوسرے پر پھسلتے جاتے ہیں لیکن قصہ کے تمام واقعات باہم منسلک ومربوط ہوتے ہیں۔ گویا قصوں کے واقعات یکجا منجمد ہو کر برف کے مستقل تودے کی طرح زندگی کے بے پایاں سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں۔ بلکہ ان کی زیادہ صحیح مثال گراموفون (مغنوں) کے ریکارڈ سے دی سکتی ہے جسے ہم جب چاہیں مشین پر چڑھا کر اس کا نغمہ سن سکتے ہیں۔ انگلستان کے مشہور ادیب ونقاد چارلس لیمب کا قول ہے کہ "باکمال افسانہ نویس حیاتِ انسانی کے لامتناہی واقعات ومعاملات کے پیہم چکّر سے تنگ آکر اپنا زبردست ہاتھ زندگی کے متحرک چاک کے کسی ڈنڈے پر رکھ دیتا ہے، جس سے تھوڑی دیر کے لئے اس کی رفتار تھم جاتی ہے۔ تمام کاروبار رُک جاتے ہیں اور وہ اپنی ضرورت کے مطابق قصہ کا مواد وسامان جمع کر لیتا ہے"۔ یقیناً عظیم الشان چرخِ حیات کو انسانی ہاتھ روک نہیں سکتا۔ چارلس لیمب نے افسانہ نویس کے تخیّل کی کارفرمائی بیان کی ہے۔ البتہ تخیل کی زبردست قوت ہر شے پر غالب آسکتی ہے۔ جماعتِ "صنّاعین" سے تعلق رکھنے والا قصہ نویس زندگی یا جزو زندگی کی عکسی نہیں بلکہ مطمحی ومثالی (آئیڈیل) تصویر پیش کرتا ہے۔

محمد حسین ادیب

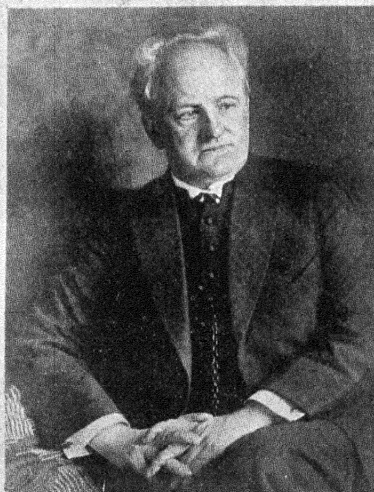
نعت

پریم پنتھ[۱] پھیلانے والے کوثر[۲] ساگر پانے والے
وحدت کتھا سُنانے والے بیڑا پار لگانے والے
پریم گُنشا ہیں سُندر سائیں
آپ ہی ہیں بخشانے والے
ہم نے جگ میں پاپ کئے ہیں سر نہیں اُٹھتا شرم کے مارے
کسے دکھائیں اپنی دُسا ہم جائیں کہاں ہم دُکھ کے مارے
پریم گنشا ہیں سندر سائیں
دُکھی دِلوں کے آپ سہارے
سُن لو، سُن لو، بپت ہماری آؤ پاپی من کو سنوارو
ایشور کے درشن دکھلاؤ ہر دے نور دیا کو بارو[۳]
پریم گنشا ہیں سُندر سائیں
پاپی جگ سے پار اُتارو

سیّد مقبول حسین
(احمد پوری)

---

[۱] دین محبت یعنی اسلام۔ [۲] انا اعطینٰک الکوثر [۳] روشن کرو۔



ملک الشعراء المانیه

ملک الشعراءِ المانیہ

جرہارٹ ہاپٹمین

ہنڈن برگ کی طرح ہاپٹمین بھی جرمنی کی ایک نمایاں شخصیت ہے۔ مجھے کئی دفعہ اُس کا مہمان ہونے کی عزت حاصل ہوئی ہے اور ایک دفعہ میں نے پورا ایک ہفتہ اُس کے خوبصورت دہاتی مکان میں گذارا ہے جو سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ جارج سلوسٹر ویرک

جرمنی کی صرف چند شخصیتیں ایسی ہیں جن کی شہرت شہنشاہی کے خاتمے کے بعد بھی قائم رہی ان میں سے دو ایسی ہیں کہ قدیم جرمنی کی بہ نسبت جدید جرمنی میں انہیں زیادہ عروج نصیب ہوا ہے۔ ایک ان میں سے سپاہی ہے اور دوسرا شاعر۔ ایک کا نام ہنڈن برگ ہے اور دوسرے کا ہاپٹمین۔

دونوں غریب خاندانوں میں پیدا ہوئے۔ ہنڈن برگ کا باپ ایک معمولی دہاتی تھا۔ ہاپٹمین کا باپ کوہستانِ سلیشیا میں ایک سرائے دار تھا۔ اس کا دادا ایک جلاہا تھا جس کی مصیبت بھری کہانی اس نے اپنے زمانۂ جوانی کے بہترین ناٹک میں لکھی ہے۔

جمہوریۂ جرمنی کے ملک الشعراء نے کہا "ہم جرمن اس لئے مضبوط ہیں کہ جس سرزمین میں ہم پیدا ہوتے اُس کی خاک میں ہماری جڑیں بڑی گہرائی تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ جب تک ہم اس خاک سے چپٹے رہیں گے ہم مستحکم ہیں، ہمیں کوئی تباہ نہیں کرسکتا۔ خاکِ وطن ہر لمحہ ہمارے وجود میں قوت بڑھا رہی ہے۔ تھوڑی بہت جتنی قوت بھی مجھ میں موجود ہے میں اُس کی وجہ اِسی خاک کے قرب کو قرار دیتا ہوں۔"

ہم ہاپٹمین کے سلیشیا والے گھر کے قریب جنگل میں سیر کر رہے تھے۔ ہاپٹمین نے چلتے چلتے اپنا قدم احتیاط سے ایک طرف کر لیا کیونکہ اس کے نیچے ایک جنگلی پھول آچلا تھا۔ پھر اِسی طرح اُس نے ایک چیونٹیوں کے بنائے ہوئے مٹی کے ننھے سے ٹیلے کو بھی پامال ہونے سے بچا لیا۔

ہاپٹمین نے کہا "آپ کو تو جرمنی چیونٹیوں کے اس ننھے سے ٹیلے سے کچھ بڑا معلوم نہ ہوتا ہوگا لیکن وہ ایک نہایت قابلِ احترام ٹیلا ہے۔ اس میں بڑی شاندار چیونٹیاں آباد ہیں۔ اگر یہ ٹیلا گر جائے تو چیونٹیاں اسے ایک پل میں پھر کھڑا کر دیں گی!

"جرمن قوم کی فطرت میں بے نظیر استقلال اور بے نظیر عین پرستی ہے۔ جب تک جنگِ عظیم جاری رہی ہمیں ایک سنگدل تباہ کار ظاہر کیا جاتا رہا۔ یہ ہماری قوم پر ایک الزام ہے۔ ہماری سب سے بڑی خواہش تعمیر ہے تخریب نہیں۔

"گوئٹے کا فاوسٹ" تاریکی مصیبت اور موت کے منہ میں پہنچ کر بھی ایک نئی دنیا کی تخلیق اور ایک نئی تہذیب کی تشکیل کی کوشش کرتا ہے۔ گوئٹے محض ایک محبِ وطن ہی نہ تھا بلکہ اُس نے اپنی تصنیف "فاوسٹ" میں جرمن رُوح کی ایک نہایت کامل تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی۔

"جرمن روح میں تنوع کے ساتھ ہی گہرائی بھی ہے۔ اس حیثیت سے یہ جرمنی کا آئینہ ہے۔ جرمنی میں اتنے ہی مختلف النوع خطے ہیں جتنے کہ ریاستہائے متحدہ میں ہیں حالانکہ جرمنی ایک چھوٹا سا ملک ہے اور ریاستہائے متحدہ آدھا براعظم ہے۔"

ہاپٹمین جنگل کو اپنا گھر سمجھتا ہے۔ اُس نے نہایت مسرت کے ساتھ خوشبودار ہوا سے اپنے سینے کو بھر لیا اور کہنے لگا میں اپنے ٹیوٹنی آبا و اجداد کی طرح درختوں کی پرستش کرتا ہوں۔ اگر درختوں کے کسی جھنڈ میں خدا سے میری ملاقات ہو جائے تو مجھے ذرا بھی حیرت نہ ہو!

"میں خوش ہوں کہ بسمارک سے میری پہلی ملاقات جنگل میں ہوئی۔ میں اپنے عہد کے اس عظیم ترین جرمن سے اُس کے زوال کے تھوڑی ہی دیر بعد ملا۔ اُن دنوں میں اُس کا مخالف تھا۔ میں اُس کی عظمت سے واقف تھا، لیکن مجھے اس کی کمزوریوں کا بھی علم تھا۔

"میں گرون والڈ کے جنگل میں پھر رہا تھا جو برلن سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے کہ یکایک ایک چھوٹی سی گاڑی میں بسمارک نمودار ہوا، اور شاید سیر کرنے کے لئے یا شاید اپنی ذات اور فطرت کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ درختوں میں وہ اِس طرح کھڑا تھا جیسے بلوطوں میں ایک بلوط کھڑا ہو۔

"میں اُس کے عظیم قد و قامت، اور اُس کی عظیم شخصیت کو دیکھ کر نوجوانی کے سارے تعصبات کو بھول گیا۔ ایسے آدمی سے رُو در رُو ملنا ایک بات تھی۔ آہ وہ سر، وہ آنکھیں، وہ بال! میری چشمِ تصور اب بھی اُن کو دیکھ رہی ہے۔ یہ ایک مسحور کر دینے والا نظارہ تھا۔

"اُس کی موجودگی میں دوسرے آدمی بونے معلوم ہوتے تھے۔ اُس کی معزولی کے تھوڑے ہی دن بعد میونخ کے بڑے بڑے مصوروں نے جمع ہو کر اس کے اعزاز میں ایک دعوت دی۔ غلطی سے کہیں بسمارک وقتِ مقررہ سے پہلے ہی دعوت کے کمرے میں آ داخل ہوا۔ اُس کے پُر رعب قد و قامت کو دیکھ کر میزبان ایسے گھبرائے کہ اس کو تعظیم دینا بھی بھول گئے۔

ہنڈن برگ کی طرح ہاپٹمین بھی اپنی طرز کا ایک خاص انسان ہے، ایک بلند و بالاقامت، گہری نیلی آنکھیں، ترچھے سیدھے خطوط سے بھرا ہوا چہرہ۔ اُس کی چال میں لچک ہے، اُس کے ہاتھوں میں قوت ہے اور اُس کا دل جوان ہے۔ چہرہ اور دل دونوں یکساں بے قرار ہیں۔ اُس کی صُورت دل کو ایسی موہ لینے والی ہے کہ جب وہ بازار میں سے گزرتا ہے تو لوگ اُس کی طرف مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی یونانی دیوتا ہے جس نے بھیس بدل رکھا ہے۔

"جرہارٹ" ہاپٹمین محض ایک شاعر ہی نہیں۔ اُسے مُلکی معاملات سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ گوئٹے ایک مختصر سی جرمن مملکت کا وزیرِ اعظم تھا۔ ہاپٹمین کا نام واقعی طور پر جمہوریۂ جرمنی کی صدارت کے امیدواروں کے ساتھ لیا گیا تھا۔ لیکن اُس نے اِس تجویز کو مُسترد کر دیا۔

۲

ہاپٹمین نے کہا "میں اپنے معاصرین کی نسبت کوئی فتوٰی صادر کرنا نہیں چاہتا۔ طائرِ حقیقت کا دام میں آنا سخت مشکل ہے"

میں نے کہا کیا یہ علم آپ کے احساس کو مُردہ کر دیتا ہے کہ ہم اکثر حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے؟"

ہاپٹمین نے جواب دیا "نہیں، زندگی کی پیچیدگیوں کا علم میرے احساس کو مردہ نہیں کرتا۔ یہ صرف مجھے دوسروں کے حق میں زیادہ رواداری برتنے پر مجبور کرتا ہے"۔

"کیا آپ کی رواداری کے حلقے میں سوویٹ روس بھی شامل ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

"کیا آپ بالشویت کے عروج میں دنیا کے لئے کوئی امید دیکھتے ہیں؟"

"نہیں میں بالشویت کو زیادہ پسند نہیں کرتا، کیونکہ یہ شخصیت کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے۔ لینن کے جنازے پر ایک مقرر نے کہا تھا "وہ ایک شخصیت تھا، لیکن ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ یہ ضروری نہیں سمجھا جائے گا، کہ ہم شخصیتیں پیدا کریں"۔

میں نے کہا "آپ کے خیال میں امریکا کا مستقبل کیا ہوگا؟"

شاعرِ المانیہ نے جواب دیا "اس بات کو تیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں جب میں امریکا گیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالشویک رُوس کی طرح امریکا کے لئے بھی تہذیب کے ایک مشینی تصور کی غلامی کا خطرہ ہے، انسان مشین کو صرف اس لئے قبضے میں لاتا ہے کہ اُس کا غلام بنے۔ وہ خود ایک مشین بن جاتا ہے۔ بعض

اوقات ہنری فورڈ مجھے انسان کے بجائے ایک عظیم الہیئت مشین معلوم ہوتا ہے۔

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ تہذیب کے لئے امریکا کا سب سے بڑا تحفہ کثرتِ پیداوار ہے۔ مثلاً فورڈ کاریں اور دوسری موٹریں۔ میں کہتا ہوں نہیں۔ امریکہ والوں نے اپنی انسانیت کو قائم رکھا ہے۔ خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے وہ سچے انسان ہیں، تہذیب کے سچے حامل۔ تلاش اور سہو، سہو اور تلاش، اِس پر اُن کا عمل ہے۔ لیکن وہ بے خطا سادگی اور وحدتِ مقصد کے مالک ہیں، جس میں سے عظیم الشان ایجادات اور عظیم الشان خیالات ظہور میں آتے ہیں۔

"امریکا نے دو عجیب چیزیں دنیا کو دی ہیں: ایڈگر ایلن پو کی تصنیفات اور جدید رقص۔

"امریکا کے رقص اتنے ہی دلکش ہیں جتنی کہ پو کی شاعری۔ میں ان دونوں کے بُت پرستانہ اوصاف کا دلدادہ ہوں۔ رُوح کو بچانا ضروری ہے لیکن جسم کو آزادی دلانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ رقص جسم کو اپنی ذات سے حظ حاصل کرنا سکھاتے ہیں۔ وہ اس کو قیود اور روایات سے آزادی دلاتے ہیں"۔

"امریکا کو اگر اپنی طاقت کا علم ہو جائے اور وہ اس طاقت کو استعمال کرے تو وہ ساری دنیا پر حکومت کر سکتا ہے۔ لیکن لاعلمی شاید بہتر ہے۔ طاقت ایک دو دھاری تلوار ہے۔ اس کا مالک بھی غلام ہے۔

"اس ملک کے راک فیلر اور مارگن اپنی مشینوں اور اپنی دولت کے غلام ہیں۔ دولت سے وہ کیا کام لے سکتے ہیں؟ وہ لائبریریاں اور کالج کھول سکتے ہیں، لیکن تعلیم ہمیں خوش نہیں کر سکتی، کتابیں ہمارے دکھ کا علاج نہیں کر سکتیں۔ حکمت شاید ہماری صحت کو بہتر بنا سکتی ہے، لیکن ہمیں یہ خوش نہیں کر سکتی۔

میں نے پوچھا "ہمیں کونسی چیز خوش کر سکتی ہے؟"

شاعر نے کہا "حسن! ایک وحشی جانور اور ایک مہذب انسان میں جو بات مشترک ہے وہ خواہشِ حسن ہے۔ ہمیں اپنی نئی پود کی تربیت حسن کے ماحول میں کرنی چاہئے۔ حسن مادی آرام و آسائش سے زیادہ ضروری ہے۔ یہی میرا پیغام ہے"۔

میں نے اُن سرسبز درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے جو دنیا کو ہماری نظروں سے چھپائے ہوئے تھے افسوس آمیز لہجے میں کہا "امریکہ والوں کو جنگل تباہ کر دینے کی عادت ہے۔ لیکن وہ اب جرمنی سے اُن کی حفاظت کرنا بھی سیکھ رہے ہیں"۔

ہاپٹمین نے کہا "نشو و نما اور قدرتی مناظر کے فطرتی احترام نے ہمیں درختوں کی حفاظت کرنا سکھایا ہے۔ میرے گھر سے تھوڑے ہی فاصلہ پر شہزادہ پکلر مسکاؤ کی خوبصورت جاگیر ہے۔ پکلر نپولین اوّل کا ہمعصر تھا وہ ایک سپاہی اور ایک مصنف تھا۔ لیکن اس کی شہرت کی اصلی وجہ وہ سلیقہ ہے جس سے اُس نے یہ باغ لگایا۔

تھا۔ باغ لگانے کے فن میں وہ جرمنی کا استاد تھا۔

"شہزادے نے چار شادیاں کیں اور ان چار شادیوں سے جو دولت حاصل ہوئی اُسے اُس نے ایک ایسا باغ لگانے میں صرف کیا جس کی نظیر سارے ملک جرمنی میں نہیں ملتی۔ اگر اُسے کسی سرائے کے سامنے کوئی خوبصورت درخت لگا ہوا نظر آیا تو اُس نے اُسے خرید لیا اور وہاں سے اکھڑوا کر اپنے باغ میں نصب کرایا جو درخت لگوانے کا ایک نہایت بھدا طریق ہے۔ اگرچہ اُس زمانے میں باغبانی کے فن نے زیادہ ترقی نہ کی تھی لیکن وہ ہمیشہ اپنے تجربات میں کامیاب ہو جایا کرتا تھا۔

میں نے کہا "یہ حیرانی کی بات ہے کہ کوئی شخص ایک باغ کی تکمیل کے لئے اپنی اور اپنی چار بیویوں کی زندگیاں قربان کر دے۔"

ہاپٹمین نے جواب دیا "جو شخص درختوں سے محبت کرتا ہے درخت اُسے اپنا ہمراز بنا لیتے ہیں۔ مجھے اُن سے ایک دلی لگاؤ ہے۔ میں اُن کی زبان سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اسی طرح مائیں بھی بچوں کے دل کی بات سمجھ جاتی ہیں۔

" وہ ماں جو اپنے بچے کی طرف دیکھ رہی ہو اُس ٹہنی کی طرح ہے جو اپنے پھول کی طرف دیکھ رہی ہو۔ اگر ٹہنی اپنے پھول کا مقصد اور اس کی خواہشات نہیں سمجھ سکتی، نہ سمجھے اس کے باوجود اِن دونوں کے درمیان الفت کا ایک ایسا گہرا رابطہ ہے جس کی مثال فطرت کی اور کسی شے میں نہیں ملتی۔

"پکلر نے جو درخت لگوائے تھے انہوں نے اُس کے دل میں ایک احساس بقا پیدا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے درختوں سے بھی ایک دلبستگی تھی۔ ہر شخص اپنے لئے ایک ارضی جنت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ پکلر کی جنت اُس کا باغ تھا۔ شاید وہ آخر تک اپنے مطمح نظر کو حاصل نہ کر سکا، ورنہ وہ اِس جنت کو چھوڑ کر ایک اور جنت کی تخلیق میں مصروف ہو جاتا۔ اِس حیثیت سے پکلر ایک پکا جرمن تھا۔ فاؤسٹ کا ہم وطن۔ جب ہم اپنے مقصد کو حاصل کر لیتے ہیں تو ہم ضرور ایک نیا خواب دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔"

۳

ہاپٹمین نے کہا "زندگی کے پرے بھی کوئی چیز موجود ہے، زندگی سے برتر، ایک اسرار۔ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں ـــــ بدھ، مسیح، روح کائنات، تخلیقی ارتقا وغیرہ۔ میں اس کی کوئی تعریف نہیں کر سکتا۔ میں اس کو بیان نہیں کر سکتا۔ زندگی کے غیر فانی لمحوں میں اور آرٹ کی مسرتوں کے غیر فانی لمحوں میں ہمیں اس کی ایک جھلک نظر آ سکتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کہاں ہے۔ میں نہیں جانتا

کہ یہ کیا ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ ہے۔"

سمندر کی موجوں کا جادو دانی نغمہ موجودہ جرمنی کے بہترین شاعر کا ہم آہنگ معلوم ہوتا تھا۔

ہاپٹمین نے مجھے ایک ہفتے کے لئے اپنے ہاں ہڈن سی میں مدعو کر رکھا تھا۔ یہ چھوٹا سا جرمن قصبہ جہاں لوگ گرمیوں کا موسم گزارنے جاتے ہیں اور جو ایک چھوٹے سے جزیرے پر واقع ہے ایک لحاظ سے ہاپٹمین کا اپنا دریافت کیا ہوا ہے۔ گرمیوں کے ہر موسم میں یہ مقام اُسے چند ماہ کے لئے اپنے ہاں کھینچ لاتا ہے۔

ایک سیر کے دوران میں ہم بارش سے بالکل بھیگ گئے۔ اس سے میرے جوش و خروش میں کچھ فرق آ گیا لیکن ہاپٹمین کی شگفتگی اور مسرت جوں کی توں قائم رہی۔ اُس نے بارش کو رحمتِ خداوندی کا نزول سمجھا۔ اُس نے کہا "جب میں دو تین گھنٹے کی طویل سیر کرتا ہوں تو بارش اکثر میرے کپڑوں سے گذر کر میرے جسم تک پہنچ جاتی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تو اس قدر بھیگنے کا اتفاق کبھی نہیں ہُوا۔"

اُس نے کہا "لیکن جب بارش آجاتی ہے تو آپ کیا کرتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "میں ٹیکسی لے لیتا ہوں"۔

یہ بات ہاپٹمین کو بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔ یہ عقدہ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ فطرت سے اس قدر دُور بھی کوئی مقام ہو سکتا ہے جہاں ٹیکسی ہمیشہ اور ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہو۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں بھی فطرت کی قوتوں کا مقابلہ کر سکتا ہوں میں نے جھٹ ایک ایسی بحث شروع کر دی جسے فلسفے کی جان کہنا چاہئے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بارش کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا "کیا زندگی بسر کرنے کے قابل ہے؟"

شاعرِ المانیہ نے میرے ناگہانی سوال پر کوئی تعجب ظاہر نہ کیا اور کہنے لگا!

"میری عمر پینسٹھ برس کی ہے، لیکن اس عرصے میں میں کبھی زندگی کی مسرت سے محروم نہیں ہُوا۔ صرف مرغزار کی دھوپ سے لطف اندوز ہونا مجھے راضی برضا رکھتا ہے۔ مجھے اپنے کسان آبا و اجداد سے زندگی کی ایک نباتاتی مسرت ورثے میں ملی ہے جسے میں نے آج تک ضائع نہیں کیا۔

"زندگی اُس وقت تک غنیمت ہے جب تک اُس کا غم اُس کی خوشی سے بڑھ نہ جائے۔ ممکن ہے کہ جب غم بہت بڑھ جاتا ہو تو زندگی بسر کرنے کے قابل نہ رہتی ہو، لیکن اِس کا مجھے علم نہیں۔ میں صرف زندگی کے کیف و نشاط کو جانتا ہوں۔ میں زندگی سے اِس طرح لطف اندوز ہُوا ہوں جس طرح ایک بچہ آندھی میں بے تحاشا دوڑ رہا ہو۔ میں آج بھی اس سے اِسی طرح لطف اٹھاتا ہوں ـــــ تقریباً اسی طرح۔

" زندگی سے لطف اٹھایا جاسکتا ہے اگر ہم تھوڑے سے اعتدال اور تھوڑی سی عقل کو کام میں لائیں ممکن ہے کسی اور چیز سے زندگی سے بھی زیادہ لطف اٹھایا جاسکے۔ ممکن ہے کہ نہ ہونا ہونے سے بھی زیادہ قابل ترجیح ہو۔ ممکن ہے کہ نروان میں دنیاوی زندگی سے بھی زیادہ برکات پوشیدہ ہوں۔ میں آئندہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ مجھے صرف اب کا علم ہے۔

" دنیا میرا صدف ہے۔ زمین میرا گھر ہے۔

" میں سفر اس لئے کرتا ہوں کہ ہر نیا ملک ہمیں ایک نئی روح عطا کرتا ہے۔ کسی دن میں اپنی بیوی مارگریٹ کو ساتھ لے کر تمام دنیا کا سفر کروں گا۔ روح کی نشوونما کے لئے تنوع اور وسعت کی ضرورت ہے۔ کسی مکان میں یا کسی ہوٹل کے کمرے میں انسان آفاقی ساز کے تال پر رقص نہیں کرسکتا۔

" ایک دفعہ پینتیس برس کی عمر میں میں نے اپنے بھائی کارل سے کہا تھا کہ آؤ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اور تمام جھگڑوں بکھیڑوں کو الوداع کہہ کر یہاں سے نکل چلیں اور امریکا میں جاکر نئے سرے سے زندگی کی ابتدا کریں میری خواہش تھی کہ ہم لوگوں میں مل جائیں، جتنی زندگیاں بھی ممکن ہوں بسر کروں اور جتنے پیشے بھی ممکن ہوں اختیار کروں۔

" بعض اوقات مجھے سانپ پر رشک آتا ہے۔ ایک بڈھے سانپ کو اپنی کینچلی اتارتے وقت کتنا لطف آتا ہوگا! میں اپنی روح کو اتار پھینکنا چاہتا تھا اور کسی نئے ولولے کی دھن میں ایک نئی شخصیت کا جامہ اوڑھ لینا چاہتا تھا۔

" میرے بھائی نے انکار کردیا۔ اور اب ایسا تجربہ کرنے کا وقت نہیں رہا!

" مجھے ہر وہ چیز حاصل رہی ہے جس کی ایک انسان کو خواہش ہوسکتی ہے۔ محبت۔ شہرت۔ آرام آسائش طاقت۔ مجھے سلیشیا کے پہاڑوں سے محبت ہے۔ مجھے سمندر سے محبت ہے۔ ریلو کی دھوپ میرے خیالات میں تیز شراب کی طرح حرکت پیدا کردیتی ہے لیکن مجھے اب بھی اُن بلندیوں پر چڑھنے اور اُن گہرائیوں تک پہنچنے کی آرزو ہے جن کو میں نے اب تک نہیں دیکھا۔

" تاہم میری خواہشات میں پیچیدگی نہیں ہے۔ مجھے سادہ چیزوں سے انتہائی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ میں خوب کھانا اور خوب پینا چاہتا ہوں۔ شراب سے مجھے رغبت ہے۔ کیونکہ شراب زبان کا عقدہ کھولتی ہے اور ہمیں بندشوں سے آزاد کرتی ہے۔ اب میں اُس وقت تک امریکا جانا نہیں چاہتا جب تک وہاں شراب کی ممانعت ہے

" تاہم میری اکثر مسرتیں سادہ ہیں۔ میں فطرت کا قرب، دھوپ اور بارش چاہتا ہوں۔ ایک سرسبز میدان جس میں جابجا پھول بھی اُگے ہوئے ہوں میری دلی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔

"انسان کو رفاقت کی ضرورت ہے، لیکن اُسے خلوت کی بھی ضرورت ہے۔ میں دونوں سے آشنا ہوں۔ آپ میری سیرت اور میرا افسانۂ حیات میری تصانیف میں سے پڑھ سکتے ہیں۔ میری تصانیف میری اپنی ذات کا مظہر ہیں۔"

میں نے دریافت کیا "کیا آپ مسیحیت کو مانتے ہیں؟"

ہاپٹمین نے جواب دیا "دینیات میں ایک ناقابلِ بیان گہرائی ہے جہاں تمام مذاہب جا کر مل جاتے ہیں۔ مسیحیت اور بدھ مذہب میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ لیکن بدھ مذہب خدا کے تشبیہی تصور کے ترک کرنے میں مسیحیت سے بڑھا ہوا ہے۔ ہندو زندگی کو دائرۂ تجرید میں مقید نہیں رکھتا۔

"تاہم یہ ایک ناقابلِ فہم عقدہ ہے کہ ہندوستان نے ہزاروں خدا پیدا کئے اور فطرت کی ہر قوت کو ایک انسانی شکل میں پیش کیا۔"

"میں نے کہا" لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب بالکل نہیں دیا۔ میرے سوال کا مطلب یہ تھا کہ کیا آپ حضرتِ مسیح کے تاریخی وجود کے قائل ہیں اور کیا آپ انہیں خدا مانتے ہیں؟"

شاعرِ المانیہ کی آنکھوں میں ایک پُراسرار روشنی چمکنے لگی۔ اُس نے کہا "میں حضرتِ مسیح کی تاریخی ہستی کا قائل ہوں مجھے مسیحیت میں خدا نظر آتا ہے۔ میں اُسے بدھ مذہب میں بھی دیکھتا ہوں۔ میں اُسے ایک پھول میں بھی پاتا ہوں۔ خدا کا وجود ضروری ہے۔ اگر وہ موجود نہیں تو قلبِ انسانی اُسے پیدا کرے گا"

میں نے پوچھا "کیا ہم کبھی معمائے حیات کو حل کر سکیں گے؟ اگر ہم اسے حل نہیں کر سکتے تو فلسفے کا کیا مقصد ہے؟"

ہاپٹمین نے جواب دیا "اگر ہم معمائے حیات کو حل نہ بھی کر سکیں پھر بھی اپنی زندگی ہی میں خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو ہم اُس کی متناقض صورتوں کا جو ہمیں مخمصے میں مبتلا رکھتی ہیں کم از کم ایک تصور سا قائم کر لیتے ہیں۔ حیات ہمارے قلب میں سے ہو کر گذرتی ہے ――― تمام کائنات ہمارے قلب میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ ہر چیز جو موجود ہے دل کے آئینے میں اپنا عکس ڈالتی ہے۔ اِس سے انسانی علم کے نامکمل ہونے کی تلافی ہو جاتی ہے۔

"شاید ہر ایک چیز میں ہر دوسری چیز کی خاصیت موجود ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے اندر ایک عالم رکھتا ہے آرٹ کا ہر کام فی نفسہ تمام آرٹ ہو سکتا ہے لیکن انسان کو ایسے مسالک کے بیان میں زیادہ لفاظی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ سب سے ادنیٰ بت پرست الفاظ کا پرستار ہے۔"

میں نے کہا "آپ کے خیالات کی اتنی مختلف توضیحات ہو سکتی ہیں کہ اکثر اُن کے مفہوم تک پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے"

ہاپٹمین نے کہا "زندگی خدا کا سانس ہے۔ وہی اندر جاتا ہے اور وہی باہر آتا ہے۔ پو نے اسی خیال کو "یوریکا" میں بیان کیا ہے۔ شاعر بھی مصنفِ کائنات کی طرح سانس لیتا ہے۔ اُس کا نفس بھی خدا کے نفس کی طرح ہزاروں شکلیں اختیار کرتا ہے لیکن اُس کی تہ میں ہمیشہ توحید چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

"میری تصانیف میں بعض مشکلات میرے اس متصوفانہ عقیدے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز کامل نہیں ہے اور کسی بات کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔"

اس اثنا میں بارش تھم چکی تھی۔ میں بالکل بھول گیا تھا کہ پانی میرے جسم تک پہنچ چکا ہے۔ ہاپٹمین کا چہرہ ایک پھول کی طرح شگفتہ تھا۔

جب ہم گھر کے قریب پہنچے تو ہاپٹمین کا کتا موگلی دوڑ کر اُس کے پاس آ گیا۔ ہاپٹمین اُس کے ساتھ اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے وہ کوئی انسان ہو۔

میں نے کہا "کیا آپ کا خیال ہے کہ کتا آپ کی باتیں سمجھتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "میں سمجھتا ہوں کہ کتے اپنے مالکوں کے خیالات کو سمجھ لیتے ہیں۔ شاید روح ایک بو ہے، جیگر کا بھی نظریہ تھا ـــــ جیگر جس کے بنیان وغیرہ مشہور ہیں۔ شاید میرا کتا خیالات کو سونگھ لیتا ہے۔

"میرے پاس ایک اور کتا تھا۔ وہ بڈھا ہو گیا تو جب کبھی میں سیر کو جاتا تھا وہ شرمسار نگاہوں سے میری طرف دیکھا کرتا تھا، لیکن کبھی اٹھ کر میرے پیچھے آنے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے ایک ایسے ہمسائے کے ہاں جانے کا ارادہ کیا جس سے ملے مجھے تقریباً دو سال ہو گئے تھے۔

"کتے نے شاید میرے خیالات کو پا لیا۔ وہ اپنی دُم ہلاتا ہوا اٹھا اور میرے آگے آگے چل کر مجھ سے پہلے میرے ہمسائے کے مکان پر پہنچ گیا۔ میرے ارادے کو بھانپ کر غالباً اُس نے سوچا ہو گا کہ چلو، اتنی دُور تو میں جا سکتا ہوں۔ اپنے آقا کے دوست کے گھر جانا اور دیکھنا کہ وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے پُر لطف رہے گا۔

مجھے یقین ہے کہ حیوان سوچتے ہیں۔ اگر فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ کا یہ قول صحیح ہو کہ "چونکہ میں سوچ سکتا ہوں اس لئے میں ہوں" تو حیوانات میں ضرور روح موجود ہے۔"

"کیا آپ روح کی بقا کے قائل ہیں؟"

ہاپٹمین نے متفکرانہ جواب دیا "ہر چیز جس کا آغاز ہے ایک انجام بھی رکھتی ہے۔ زندگی کا کوئی انجام نہ ہو گا کیونکہ اس کا کوئی آغاز نہیں۔ ہم سرمدیت سے بچ نہیں سکتے۔ ہم سرمدیت کے شعور سے صرف اس لئے بچ جاتے ہیں کہ انسانی حافظہ ایک نامکمل آلہ ہے۔"

"کیا آپ شخصیت کی بقا کے قائل ہیں؟"

"میں تناسخ کا قائل ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہم پہلے بھی موجود تھے۔ اگر ہم پہلے موجود تھے تو ضرور ہے کہ ہم آیندہ بھی موجود ہوں گے۔ لیکن میں بقا کو شخصی نہیں سمجھتا۔ یہ بات ناقابلِ تسلیم ہے کہ کوئی ایسی ظالم طاقت بھی ہوگی جو ہمیں ہماری ذات کی سرمدیت میں مبتلا کر دے گی۔

"روح کو اپنے ہی زندان میں اسیر کر دینے سے بڑھ کر سزا میرے تصور میں نہیں آسکتی۔ اس کا مطلب جہنم ہے جنت نہیں۔ زندگی اپنی مخلوق پر اس سے زیادہ سخت کوئی عذاب نازل نہیں کر سکتی۔ ہم زندہ تو رہتے ہیں لیکن ہم بدل جاتے ہیں۔ روحِ کائنات ہم کو جذب کر لیتی ہے۔ صرف زندگی جاودانی ہے؟"

"اور زندگی کا مقصد کیا ہے؟"

ہاپٹمین نے کہا "میں نہیں جانتا۔ ایک جرمن مثل ہے کہ تقدیر خیال رکھتی ہے کہ کوئی درخت اتنا اونچا نہ ہو جائے کہ آسمان کو چھونے لگے۔ مجھے اب معلوم ہو چکا ہے کہ واقعی وہ بہت بلند نہیں ہوتے۔ میرا فلسفہ مجھے مسرور قناعت کا سبق دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود خدا کا شعار بھی قناعت ہے۔"

"میں نے کہا "آپ جدوجہد اور کام کس لئے کرتے ہیں؟"

"میں صرف ایک اندرونی تقاضا کو پورا کرتا ہوں۔ میں شطرنج کسی جزا کے خیال سے نہیں کھیلتا بلکہ صرف کھیل سمجھ کر کھیلتا ہوں۔ زندگی اور آرٹ کے مسائل میں کسی جزا کی خاطر حل نہیں کرتا بلکہ اُس مسرت کی خاطر جو عمل میں حاصل ہوتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ یہی تقاضا ہوگا جو خدا کو تخلیق پر مجبور کرتا ہے۔ بھگوت گیتا میں دیوتاؤں کا بادشاہ ارجن سے کہتا ہے اے پارتھا کے بیٹے تینوں دنیاؤں میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی ابھی مجھے تکمیل کرنی ہو کوئی ناممکن الحصول مقصد نہیں جسے میں حاصل کروں۔ لیکن میں پھر بھی سرگرمِ عمل ہوں"۔

منصور احمد

راحت کدہ

اگر ضو افگن اس میں جلوۂ جانانہ ہو جائے
طرب زار و نشاط آگیں مرا غمخانہ ہو جائے

بلائیں لے رہی ہے دو جہاں کی عقل و نادانی
خوشا وہ دل! کہ تیرے شوق میں دیوانہ ہو جائے

صبا! اس کو اٹھا کر دوش پر فردوس پہنچا دے
کہیں ویراں نہ یہ خاکستر پروانہ ہو جائے

خدا معلوم کیا لذت ہے روداد محبت میں!
کہ جب چھیڑو اسے اک مستقل افسانہ ہو جائے

الٰہی خیر! پھر طوفانِ غم سینے میں برپا ہے
کہیں میرا لب خاموش بھی اب وا نہ ہو جائے

مری آنکھوں سے اشکِ خوں کا اک سیلاب جاری ہے
ترا رازِ محبت بھی کہیں افشا نہ ہو جائے

سبق آموز ہے تقدیر کی غارتگری ہمدم
کہ دم بھر میں دلِ عشرت نشاں ویرانہ ہو جائے

دلِ برباد پہ سنسان تنہائی برستی ہے
ذرا اس پر نگاہیں ڈال دو میخانہ ہو جائے

وہ میرا کعبۂ عشق و محبت جلوہ فرما ہے
نگاہِ شوق! اب اک سجدۂ شکرانہ ہو جائے

اثرؔ اب شکوۂ اغیار کس منہ سے کرے کوئی
کچھ ایسی آپڑی اپنا بھی جب بیگانہ ہو جائے

اثر صہبائی

ممالکِ متحرکہ

آفتاب سے جُدا ہو کر زمین پر کیا گذری؟

نظریۂ تخلیق ارض میں علماء کے درمیان کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں ہے۔ ان کی قریب قریب متفقہ رائے یہ ہے کہ ایک عظیم الشان جسیم ستارہ آفتاب کے قریب سے گزرا جس نے اپنی غیر معمولی جاذبیّت کی وجہ سے سطحِ آفتاب میں بہت زیادہ "مد" پیدا کر دیا اور اس میں سے متعدد قطعات جدا کر لئے۔ ان قطعات نے فضا میں اپنی طبعی حرکت جاری رکھی اور انہی قطعات میں سے ایک قطعہ نے آگے چل کر زمین کی موجودہ صورت اختیار کر لی[۱] جرم زمین ابتداءً بخارات[۲] اور پگھلی ہوئی معدنیات کا ایک مجموعہ تھا جس میں آفتاب کی طرح غیر معمولی حرارت موجود تھی کروڑوں سال گذرنے پر یہ ٹکڑا سرد ہونے اور سمٹنے لگا۔ یہاں تک کہ مرورِ ایام سے انجماد ہو کر وہ خول پیدا ہو گیا جسے "خشکی" کہتے ہیں۔ دوسرے اطراف میں یہی بخارات کثیف ہو کر پانی کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ اس پانی نے جھیلوں، دریاؤں اور سمندر کی وہ صورت اختیار کر لی جو آج تک دیکھی جاتی ہے۔

لیکن زمین نے موجودہ صورت کیوں اختیار کی اور بعض اطراف میں پہاڑ اور بعض میں سمندر اور دریا وغیرہ جغرافیائی مظاہر کیوں کر پیدا ہو گئے؟

قدیم ترین زمانے سے علما کے دل میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اس کی توجیہہ مختلف طریقوں سے کی گئی ہے اور اس میں متعدد مذاہب رونما ہو گئے ہیں۔ جدید ترین نظریہ کا ماحصل (جو دیگنر کا نظریہ کہلاتا ہے) یہ ہے کہ جب کرۂ زمین منجمد ہونے لگا تو اس میں وہ حالات رونما ہو گئے جو پختگی کے قریب سیب میں رونما ہوتے ہیں۔ یعنی جس طرح سیب میں جابجا ابھار پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی گولائی جاتی رہتی ہے اسی طرح زمین میں بھی نشیب و فراز پیدا ہو گئے اور کثرت سے شکنیں پڑ گئیں۔ اور یہیں سے پہاڑوں دریاؤں، جھیلوں، اور سمندر کی بنیاد پڑتی ہے۔ انہی کے منجملہ شمالی ہندوستان میں سلسلۂ کوہ ہمالیہ اور امریکہ

---

[۱] دیکھئے قرآن ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کیا کہتا ہے:۔ انّ السموات والارض کانتا رتقاً ففتقنٰھما ط

[۲] GASES

وغیرہ میں دوسرے کوہستانی سلسلے وجود پذیر ہوئے۔

زمین کے طبقات ثلثہ۔ کرۂ زمین کی نشوونما کے دوران میں تین طبقات پیدا ہو گئے جو ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) بالائی طبقہ "یا قشر" اس کی دبازت تقریباً ۲۷میل یا ۴۴ کیلو میٹر ہے،

(۲) طبقہ اوسط، اس کی دبازت تقریباً ۱۸۰۰ میل ہے،

(۳) طبقۂ اسفل، اور وہ قلب کرۂ زمین ہے۔

پہلا طبقہ یعنی "قشر" ان عناصر سے مرکب ہے جو سلیکن[۱] اور ایلومینیم کے امتزاج سے پیدا ہوئے ہیں اسے ماہرین علم طبقات الارض طبقہ سیال[۲] کہتے ہیں یہ طبقہ ٹھوس ہے اور اپنے نیچے والے طبقہ (درمیانی طبقہ) کی بہ نسبت سبک ہے۔

دوسرا طبقہ جس کی دبازت ایک ہزار آٹھ سو میل بتائی گئی ہے۔ علماء طبقات الارض کی اصطلاح میں طبقہ سیما[۳] کے نام سے مشہور ہے، اس میں سلیکن اور مگنیشیم کے اجزا بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ طبقہ بہت زیادہ لزاجت رکھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وزنی اور نہایت ٹھوس بھی ہے

طبقۂ اسفل "یا قلب زمین" ـــــ جسے طبقہ نیف[۴] کہتے ہیں ـــــ پگھلے ہوئے نکل اور لوہے سے مرکب ہے۔ یہ دونو پانی سے آٹھ گنا زیادہ وزنی اور فولاد سے بدرجہا زیادہ سخت ہیں۔

عقل انسانی درمیانی طبقہ کے تصور سے عاجز ہے۔ وہ ایک چپچپے مادے سے بنا ہے جو کسی بہت گرم بہنے والے مادے سے مشابہ ہے۔ اس اعتبار سے بعض لوگ اس کو کاگ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جب اُس پر کسی ایسے مادے کا دباؤ پڑتا ہے جو اس سے زیادہ سخت ہو تو یہ اس سے سہار لیتا ہے اور چور چور نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

---

[۱] ایک جدید دریافت شدہ دھات کا نام ہے۔

[۲] (Sial) چونکہ یہ طبقہ سلیکن اور ایلومینیم کے اجزا سے بنا ہے اس لئے سلیکن اور ایلومینیم کے ابتدائی دو دو حروف لے کر لفظ "سیال" بنا لیا گیا (Sial) سروش

[۳] (Sima) یہ طبقہ سلیکن اور مگنیشیم کے عناصر سے مرکب ہے اس لئے ان دونوں لفظوں کے ابتدائی دو دو حروف لے کر "سیما" وضع کیا گیا، Sima (سروش)

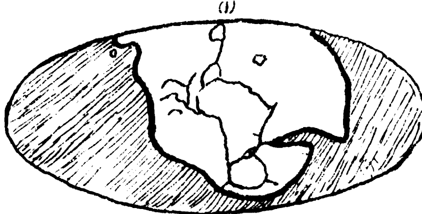
[۴] مذکورہ بالا اصول کے مطابق نکل اور فیرم (Ferrum) کے دو دو ابتدائی حروف لے کر اس لفظ کی ترکیب کی گئی ہے۔ فیرم (Ferrum) یونانی میں لوہے کو کہتے ہیں (سروش)

کہ وہ کوئی راستہ پاکر قشر کو چیرتا ہوا سطح زمین پر ظاہر ہوجاتا ہے۔

بعض لوگوں نے اندازہ کیا ہے کہ درمیانی طبقہ ـــــــ یا طبقہ سیما ـــــــ کی لزاجت (چپچپاہٹ) ڈامر (تارکول) کی لزاجت سے دس ہزار گنا زیادہ ہے۔ اس سے اس طبقہ کی شدتِ کثافت کا اندازہ ہوسکتا ہے یہاں تک کہ وہ بالائی طبقہ (یعنی سطح زمین) کا بوجھ برداشت کرلیتا ہے جو اس پر تیر رہا ہے حالانکہ وہ (یعنی بالائی طبقہ) اس سے بہت زیادہ سخت ہے۔

ویگنر کا نظریہ۔ گذشتہ بیان ذہن نشین کر لینے کے بعد ویگنر کا نظریہ اچھی طرح سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ نظریہ کرۂ زمین کے یوم پیدائش سے بحث کی ابتدا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ زمین اس وقت کرہ نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ محض ایک ایک "ٹکڑا" تھا جس کی کوئی صورت معین نہیں کی جاسکتی لیکن اس کے فضا میں گردش کرنے سے کروی شکل پیدا ہوگئی

(۱)



زمین جبکہ گردش نے اس کی شکل کروی بنا دی تھی!
(خشکی تمام تر قطب کے پاس ایک قطعہ کی شکل میں مجتمع نظر آتی ہے)

قطب جنوبی کو چھوڑ کر جو خشکی سے گھرا ہوا تھا اس کی سطح کا اکثر حصہ پانی سے چھپا ہوا تھا۔ درحقیقت خشکی تمام کی تمام قطب کے قریب ایک قطعہ کی شکل میں مجتمع تھی۔ جن ممالک کو اب جنوبی امریکہ کہتے ہیں یہ افریقہ کے مغربی ساحل سے ملے ہوئے تھے۔ شمالی امریکہ اور گرین لینڈ یورپ سے ملحق تھے۔ افریقہ کا مشرقی ساحل ہندوستان کے ساحل سے ملتا تھا اور ہندوستان کا رقبہ اس زمانہ میں موجودہ رقبہ سے بہت زیادہ تھا۔ اسی سے ملا ہوا مدغاسکر واقع تھا انٹارکٹا (بلادِ قطبِ جنوبی) اور آسٹریلیا ایک دوسرے سے متصل تھے اور ایک قطعہ کی صورت میں جنوبی افریقہ کے پہلو میں واقع تھے۔

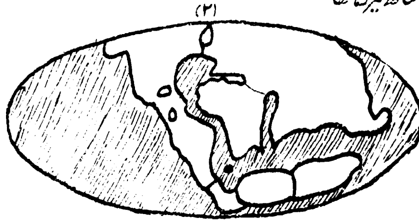
اس بعید ترین زمانہ میں تمام خشکی اسی قدر تھی جیسا کہ شکل نمبر ۱ دیکھنے سے معلوم ہوگا، یہ اس نقطہ کے اردگرد واقع تھی جسے اب قطب جنوبی کہتے ہیں اور جو موجودہ کیپ ٹاؤن کے قریب واقع ہے۔

لیکن خشکی کا یہ بڑا قطعہ گردش میں زمین کی اندفاعی قوت کی وجہ سے منقطع ہونے اور ایک دوسرے سے جدا ہونے لگا۔ زمین کے اس انقطاع کی وجہ سے براعظم اور جزائر رونما ہوئے جو قطب جنوبی سے دور ہو کر موجودہ مواقع کی جانب ہٹنے لگے۔

مختلف و متعدد اطراف میں بعض ممالک نے ایک دوسرے کو ہٹانے اور دھکیلنے کی کوشش کی پہاڑ اسی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ اس کا نمونہ شمالی ہند میں موجود ہے۔ کیونکہ ان ممالک نے شمال کی جانب ہٹنا شروع کیا۔ لیکن جو ممالک شمال کی جانب واقع تھے انہوں نے جنوب کی طرف ہٹانا چاہا اور اس کشمکش اور باہمی تدافع کی وجہ سے خطِ اتصال پر وہ عظیم الشان جغرافیائی منظر رونما ہوا۔ جسے سلسلہ کوہ ہمالیہ کہتے ہیں دنیا کے اکثر بڑے بڑے پہاڑوں کی نشو و نما کی یہی توجیہہ ہوسکتی ہے۔

خشکی کے مرکز سے جدا ہو کر شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے قطعات نے مغرب کی طرف ہٹنا شروع کیا۔ چونکہ شمالی امریکہ جنوبی امریکہ کی بہ نسبت نقطۂ مرکزیہ سے زیادہ دور تھا اس لئے اُس کا اندفاع زیادہ تیز اور اس کی حرکت زیادہ سریع تھی، وسطی امریکہ اور گرین لینڈ[۱] نے بھی انہی کا اتباع کیا لیکن جنوبی امریکہ کی رفتار تیز نہ تھی اور وہ طبقہ سیما پر اطمینان اور وقار کے ساتھ تیر رہا تھا۔

(۲)



گردش کے دوران میں کرۂ ارض کی قوتِ اندفاع کے سبب سے خشکی شق ہوگئی ہے اور اس کے اجزا ایک دوسرے سے منفصل ہو گئے ہیں!

گذشتہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ ویگنر کا نظریہ اکثر جغرافیائی مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔ اور خشکی کے وجود اور اس کی نشو و نما کی دل نشین توجیہات پیش کرتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کے اثبات کے لئے قطعی دلائل کی ضرورت ہے۔

کیا ایسی ادلّہ موجود ہیں؟

نظریۂ ویگنر کی صحت کے دلائل۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر ویگنر کا نظریہ صحیح ہے اور تمام خشکی درحقیقت ایک ہی جگہ جمع تھی تو اُن ممالک میں جو پہلے باہم متصل تھے اور اب ایک دوسرے سے جدا ہوگئے

---

[۱] یہ ظاہر کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ اس وقت ان ممالک کا کوئی نام نہیں تھا، اسما کا تعین بعد کے زمانہ میں ہوا ہے (سروش)

ہیں تشابہ ہونا چاہئے خصوصاً نقطۂ اتصال پر۔

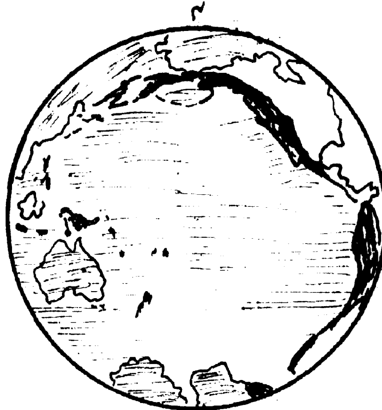
یہاں اس نظریہ کی واقعیت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ جب ہم جنوبی امریکہ کے مشرقی سواحل کا مغربی افریقہ کے سواحل سے مقابلہ کرتے ہیں تو مٹی کی ترکیب کو اس درجہ متماثل پاتے ہیں گویا ایک ہی ہے۔ آثار مدفونہ اور حیوانات متحجرہ کے بقایا میں بھی یہ تشابہ اتنا ہی مکمل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونو ساحل آپس میں ملے ہوئے تھے صرف یہی نہیں بلکہ افریقہ کے مغربی ساحل اور جنوبی امریکہ کے مشرقی ساحل کی ظاہری شکل وصورت میں بھی اتنی مطابقت پائی جاتی ہے کہ اگر پہلے کی طرح ان دونوں کا مکر رضم کر دینا ممکن ہوتا تو اس میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔



مشرقی امریکہ اور مغربی افریقہ کے سواحل!
سواحل کے کٹاؤ پر غور کیجئے، گویا ٹوٹی ہوئی طشتری ہے جس
کے ٹکڑوں کو جوڑ کر پھر سالم طشتری تیار ہوسکتی ہے۔

بجنسہ یہی اصول دوسرے براعظموں پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ شکل ظاہری اور سواحل کے موادِ ترکیبی میں اس طرح متماثل ہیں کہ اگر ان کا وجود جوڑ دینا ممکن ہو تو ان کی سطح، اُن کی مٹی کی ترکیبی ہیئات ساحلِ بحر سے ان کے ارتفاع اور دوسرے اعتبارات میں مطلق کوئی فرق رونما نہ ہوگا۔

یا مثلاً برازیل میں سیرا گیرال اور جنوبی افریقہ میں ڈرکنبرگ کے پہاڑوں کو لے لیجئے۔



مشرقی ایشیا اور مغربی امریکہ کے سواحلی پہاڑ

صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں وجوہ مشابہت قطعاً مکمل ہیں. گویا دونوں ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ اس کے علاوہ برازیل اور جنوبی افریقہ میں ایک ہی قسم کی الماس کی کانیں پائی جاتی ہیں بلکہ ان میں سے جو الماس نکلتا ہے وہ بھی دونوں جگہ کا تقریباً یکساں ہوتا ہے۔

ان دلائل پر اس دلیل کا اور اضافہ کر لیجئے کہ عصرِ حجری میں مختلف قطعات کی آب وہوا اور موسم میں بہت زیادہ مشابہت بلکہ مماثلت تھی۔ اگرچہ آج کل ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ان کے تماثل کا ثبوت یہ ہے کہ جو اقالیم باہم متلاصق تھیں ان میں قدیم حجری زمانہ کے حیوانات اور مدفونہ آثار ایک دوسرے سے کامل مماثلت رکھتے ہیں۔ ان حیوانات کا مختلف منطقوں میں زندہ رہنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب یہ منطقے آب وہوا اور موسم کے اعتبار سے متماثل ہوں. مثلاً جب ہم جنوبی افریقہ میں ایسے حیوانات کے ڈھانچ پائیں جو صرف سرد ممالک میں زندہ رہ سکتے ہیں تو ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں گے کہ جن ممالک میں یہ آثار پائے گئے ہیں حقیقتاً ان کی آب وہوا سرد تھی۔

اس نظریہ کی صحت کی ایک دلیل اور ہے۔ جو ممالک و اقالیم دراصل ایک دوسرے سے ملحق تھے ان میں حجری زمانہ کے نباتاتی بقایا بھی باہم بہت مشابہ ہیں۔ اگر یہ ممالک زمانہ ماقبل تاریخ میں ایک ہی قطعہ کی صورت میں نہ رہے ہوتے تو ان کی نباتات کا متماثل ہونا غیر ممکن تھا۔ اس لئے کہ متماثل نباتات ——— متماثل حیوانات کی طرح ——— ایک قسم

کی زمین اور ایک ہی قسم کی آب و ہوا میں نشو و نما پا سکتی ہیں چونکہ ان متعدد ممالک میں جو آج ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں نباتات کے آثارِ مدفونہ متشابہ ہیں اس لئے درحقیقت ان ممالک کا باہم متصل و ملحق ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔

دوسرے دلائل۔ نظریۂ وگینر کی صحت پر دوسرے دلائل بھی قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے منجملہ ایک "ارصاد فلکی" کی دلیل ہے جو اگرچہ قطعی نہیں کہی جا سکتی تاہم اس سے پتا چلتا ہے کہ خشکی کا انقسام اور اس کے حصص کا جزیروں اور براعظموں کی صورت میں ایک دوسرے سے انفصال ضرور اصلیت رکھتا ہے۔

یہ ظاہر کرنا غیر ضروری ہوگا کہ اگر مذکورہ ممالک ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہیں اور مرورِ ایام کے ساتھ دور دور جا پڑے ہیں تو یقیناً وہ اب بھی حرکت کر رہے اور دور ہو رہے ہونگے یعنی وہ ایک جگہ پر قائم نہیں ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ارصادِ فلکیہ کی امداد سے بہ آسانی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم ان ممالک کے "بُعد انفصالی" اور ان کی سرعتِ رفتار کے اوسط کا اندازہ کر سکیں تو یہ ممکن ہے کہ تقریبی طور پر ابتدائے انفصال کا زمانہ متعین کیا جا سکے۔ اِس اصول پر ہمارے خیال میں وہ ممالک جو گرین لینڈ کے نام سے مشہور ہیں ناروے سے تقریباً ایک لاکھ سال پہلے جدا ہوئے تھے کیونکہ گرین لینڈ کم از کم ۴۰ فٹ سالانہ کے اوسط سے مغربی جانب ہٹ گیا ہے۔ ارصاد فلکی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۶۳ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک گرین لینڈ کی رفتار مغربی سمت میں ۶۰ فٹ سالانہ کے اوسط سے رہی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ خشکی کے انفصال و انقسام کا سبب گردش میں کرۂ زمین کا اندفاع تھا زمین کے اِس انقسام کی وجہ سے موجودہ براعظم و جزائر پیدا ہوئے اور نقطۂ قطب جنوبی سے اپنے موجودہ مواقع کی طرف ہٹنے لگے لیکن اس انتقالِ مکانی کے لئے کسی دوسری قوت کی معاونت و مساعدت لازمی تھی یہ قوت ——— ڈبلن (Dublin) (آئرلینڈ) کے ایک عالم سٹرگول کے نظریہ کے مطابق ——— طبقۂ سیما کی وہ قوت ہے جسے برقی عملیت (Radio action) کہتے ہیں۔ یہ مسلّم ہے کہ وہ تمام عناصر جن میں "برقی عملیت" پائی جاتی ہے۔ حرارت پیدا کرتے ہیں جب اوپر والے سنگین طبقات بہت دبیز ہوتے ہیں اور اس کی حرارت کو خارج ہونے سے روک دیتے ہیں تو طبقۂ سیما میں جمع شدہ حرارت بے انتہا بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ وُہ ان مادّوں کو جن پر یہ طبقہ مشتمل ہے پگھلا دیتی ہے اس کی وجہ سے طبقۂ سیال یا قشرِ زمین اپنے نیچے والے طبقہ (سیما) سے بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے اور وہ ایک متحرک جزیرے کی طرح بآسانی حرکت کر سکتا ہے اور مد و جزر کی تاثیر سے انتقال مکانی رونما ہو جاتا ہے!

منظور سروش
(بھوپالی)

تجلّیات

کس کے فروغِ نور سے گلنار ہے بہار؟ کس کی تجلیوں کی پرستار ہے بہار؟
کس کی صباحتوں سے گل افشاں ہے کائنات؟ کس کی لطافتوں سے شفق زار ہے بہار؟
کس کی بہارِ حسن سے رنگیں ہیں باغ و راغ؟ کس نقشبندِ ناز کا شہکار ہے بہار؟
کس کی ضیائے رُخ سے درخشاں ہے آفتاب؟ کس کی جبیں سے مخزنِ انوار ہے بہار؟
کس کی نظر سے دل ہے صنم خانۂ نشاط؟ کس کے اثر سے غیرتِ فرخار ہے بہار؟

تعریف سے بلند ہے وہ پیکرِ جمال؟ کیا حسن ہے کہ نقش بدیوار ہے بہار؟
جلووں نے تیرے آگ لگا دی بہار کو؟ یہ لالہ زار ہے کہ شرر بار ہے بہار؟
میرے غمِ وفا کے لئے درد ہے نشاط؟ میری رگِ جنوں کے لئے خار ہے بہار؟
صحنِ چمن میں جھوم رہے ہیں گل و سمن؟ میخانۂ حیات میں سرشار ہے بہار؟
جوشِ بہار ہے کہ فریبِ خیال ہے آئینۂ نگاہ کا زنگار ہے بہار؟
آزاد ہے جمال ترا قیدِ رنگ سے زندانِ رنگ و بو میں گرفتار ہے بہار؟
اک لرزشِ حیات ہے اک ساعتِ نشاط برقِ نظر گداز کی رفتار ہے بہار؟
موجِ نسیم سے نہ بجھے گا چراغِ گل گلزار کی فضا میں فسوں کار ہے بہار؟

خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل
عابد شہیدِ حسرتِ دیدار ہے بہار

عابد

گمشدہ رومال

شملہ میں یوں تو عموماً غروبِ آفتاب کا منظر دلفریب ہوتا ہے۔ لیکن آج مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے اور بھی دلکش تھا۔ نریمان سہراب اور مس جمشید اپنے چند دوستوں کے ہمراہ "جاکھو" پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے۔

پہاڑ کی بلند چوٹی اور شام کی ٹھنڈی ہوا نے اپنا کام کیا مس جمشید کو جس نے ایک ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی سردی محسوس ہونے لگی۔

مس جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو سردی لگ رہی ہے۔ نریمان لاؤ تو میں اپنا کوٹ پہن لوں"

نریمان نے اپنے کندھے سے کوٹ اتارا اور مس جمشید کو پہنا دیا۔

"شکریہ۔ میں نے بہت اچھا کیا جو اپنے ساتھ کوٹ بھی لے آئی ..... ہیں؟ کیا؟ میرا ریشمی رومال کہاں ہے" مس جمشید نے کوٹ کی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔

نریمان نے متعجب ہو کر کہا "تو کیا۔ اس میں رومال بھی تھا؟"

مس جمشید نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں نے چلتے وقت کوٹ کی دائیں جیب میں رکھا تھا۔ لیکن اب گم ہے۔ تم بڑے بے پروا ہو نریمان! کہیں راستے میں گرا دیا ہوگا"

سہراب نے موقع پاکر کہا "تم بھی بڑی عقلمند ہو جو اپنی چیزیں نریمان کے سپرد کر دیتی ہو یہ تو سکول میں بھی بڑا غیر محتاط مشہور تھا"

نریمان متاسف ہو کر بولا مس جمشید مجھے افسوس ہے"

مس جمشید نے بات کاٹ کر کہا "اور تھا بھی بالکل نیا" واقعی سہراب۔ میں آج صبح ہی مئیل سے خرید کر لائی تھی۔ بڑا خوبصورت تھا"

نریمان نے ندامت محسوس کرتے ہوئے کہا "وقت تو ہے میں ابھی واپس جاتا ہوں اور اس کی تلاش کرتا ہوں۔ راستے میں کہیں کوٹ کی جیب سے گر گیا ہوگا"

مس جمشید نے کہا "ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ دونوں مل کر جلد تلاش کر لیں گے اور پھر غروبِ آفتاب سے پہلے واپس بھی آسکیں گے"

ان کے ہمراہیوں میں سے ایک نے بآوازِ بلند کہا "شاباش جلدی کرو۔ ورنہ شام ہو جائے گی اور ہمارا پہاڑ پر چڑھنا یونہی رائیگاں جائے گا۔"

مس جمشید اور نریمان پہاڑ سے نیچے اترنے لگے۔ انہوں نے اس جگہ کو جہاں رومال گرنے کا شبہ ہو سکتا تھا دو حصوں میں تقسیم کر لیا ایک حصہ میں مس جمشید اور دوسرے میں نریمان مصروفِ تلاش ہو گئے تھوڑی دور جا کر نریمان ایک جھاڑی کے پاس جھکا اور اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک ریشمی رومال نکال کر وہاں رکھا اور آگے کو چل دیا۔ تلاش کے بعد ملنے کی مقرر کردہ جگہ پر دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی ناکامی کی خبر سنائی۔

مس جمشید نے کہا "نہیں مل سکا تو نہ سہی۔ چلو ہم واپس چلیں اور غروبِ آفتاب کے دلچسپ منظر کے مشاہدے سے لطف اندوز ہوں۔"

نریمان نے کہا "جانے سے پیشتر تم میرے حصہ میں دوبارہ تلاش کرو اور میں تمہارے حصہ میں ڈھونڈتا ہوں۔ ممکن ہے کہ ہم میں سے کسی کی نظر چوک گئی ہو۔"

اس طریق پر دوبارہ تلاش شروع ہوئی۔ مس جمشید کو ایک جھاڑی کے پاس اپنا ریشمی رومال زمین پر پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے نریمان کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ مس جمشید نے جلدی سے جھک کر رومال اٹھا لیا اور پھر اسی طرح تلاش میں مصروف ہو گئی۔

اس نے نریمان ہی تھوڑی دیر بعد بلند آواز سے کہا "وہ تو کہیں نظر نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ کہیں گم ہو گیا ہے خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں"

نریمان اس طرف آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ جھاڑی کے پاس سے گذر چکی ہے۔

مس جمشید نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمارے پیچھے آنے والے کسی شخص نے اٹھا لیا ہوگا۔ اب اس کی تلاش فضول ہے۔ ہم . . . . . . "

نریمان نے متحیر ہو کر جواب دیا "یہ ناممکن ہے وہ ضرور کہیں یہاں ہی پڑا ہوگا" ابھی تین منٹ بھی نہیں گذرے کہ میں نے . . . .

مس جمشید نے کہا "ہاں۔ ہاں۔ کہو نریمان! چپ کیوں ہو گئے؟"

"میں . . . . . میرا یہ مطلب ہے کہ یہاں سے کوئی بھی نہیں گذرا . . . نریمان نے سنبھل کر جواب دیا۔

مس جمشید نے مسکراتے ہوئے کہا "نریمان تم نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے میرا رومال تمہارے ہی پاس تھا"
نریمان نے منفعل ہو کر کہا کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے پاس؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "
مس جمشید نے نریمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ہاں۔ ہاں تمہارے پاس۔ اور تم نے ہی پہلی تلاش کے دوران میں جھاڑی کے پاس رکھ دیا تھا۔ اب انکار کیوں کرتے ہو؟ یہ تو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے"
"خیر ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ میرا یہ مطلب ہے ۔ ۔ ۔ میرا خیال نہیں تھا کہ تم ایک رومال کے لئے مجھ سے اس طرح خفا ہو جاؤ گی میں نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے تمہیں تمہارا رومال دے دوں اور بعد میں تم سے دریافت کروں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "
مس جمشید نے مضطربانہ انداز میں پوچھا "مجھ سے دریافت کرو؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ "
"مس جمشید تمہیں معلوم ہے کہ میرے لئے یہ آخری موقع ہے۔ کل میری رخصت ختم ہو جائے گی سہراب ابھی ایک ہفتہ اور یہاں رہے گا میں تمہیں تنہا ملنا چاہتا تھا اور تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے تم سے محبت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " نریمان نے بے تاب ہو کر کہا۔
نریمان جوش محبت میں مس جمشید کی طرف بڑھا۔ وہ ذرا پیچھے ہوئی ہی تھی کہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ نریمان نے اسے گرتے ہوئے کو تھام لیا لیکن اس ذرا سی حرکت میں مس جمشید کی بغل میں سے کچھ۔ ۔ ۔ ریشمی رومال۔ ۔ ۔ زمین پر گر پڑا
"او ہی نریمان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "
نریمان نے زمین پر سے رومال اٹھا لیا۔
"خوب تم نے تو رومال وہاں سے اٹھا لیا تھا۔ جہاں میں نے رکھا تھا اور مجھے نہیں بتایا۔ ۔ ۔ ٹھہرو ذرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
نریمان نے اس کی نازک کلائی کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا "تم تو کہتی تھیں کہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "
مس جمشید نے متبسم ہو کر کہا "لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اسے اس خیال سے اٹھا لیا تھا کہ اگر میں نے اسے وہاں رہنے دیا اور تم نے ڈھونڈ لیا تو تم مجھے جلد واپس لوٹنے کو کہو گے۔ بغیر اس کے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ بغیر ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں۔ تو نریمان تم کل جا رہے ہو۔ میں خود دل سے اس بات کی خواہشمند تھی کہ تم مجھ سے یہ بات کہو جو تم نے ابھی کہی ہے۔ میں برابر پندرہ روز سے اس کے انتظار میں تھی"۔
"او ہی نریمان" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اُس روز غروبِ آفتاب کا منظر نہایت دلفریب اور رُوح پرور تھا لیکن نریمان اور مس جمشید نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا۔

اختر (امرتسری)

واردات

راتوں کو تصور ہے اُن کا اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا انجام مرا کیا ہونا ہے

ان نورس آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے کیا رونا ہے
برسے ہوئے سچے موتی ہیں بہتا ہوا خالص سونا ہے

تو یہ نہ سمجھ للّٰلہ کہ ہے تسکین ترے دیوانوں کو
وحشت میں ہمارا ہنس پڑنا دراصل ہمارا رونا ہے

تمییز کمال و نقص اٹھا یہ تو ہے روشن دنیا پر
میں چندن ہوں، تو کندن ہے میں مٹی ہوں تو سونا ہے

ہر آنسو بحرِ گوہر ہے ہر موجِ تبسم اک آنسو!
رونا بھی تمہارا ہنسنا ہے ہنسنا بھی ہمارا رونا ہے

دل کو کھویا، جاں کو کھویا، دنیا کھوئی دیں بھی کھویا
یہ گم شدگی ہے تو اک دن اے دوست تجھے بھی کھونا ہے

ماتم ہے مری آوازِ شکستِ سازِ دلِ صد پارہ کا
ساغرؔ میرا نغمہ گویا دیپک کے سروں میں رونا ہے

ساغر نظامی (علیگ)

کلوپیٹرا کی زندگی کے آخری لمحات

کلوپیٹرا اپنی خوابگاہ میں بستر پر عجیب ذہنی انتشار کی حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ ناخنوں کی مسلسل رگڑ سے نُچ گیا تھا۔ آواز نحیف اور لرزاں تھی۔ آنکھیں وہ دُرِ شہوار لُٹا رہی تھیں جو اُس کے غمِ نہاں کے واحد ترجمان تھے۔

جب اُس نے "سیزر" کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہُوئے دیکھا تو وہ بے تابانہ اُٹھی اور ایک مجنونانہ انداز کے ساتھ اس کے قدموں پر گر پڑی۔

کلوپیٹرا گنہگار تھی محبت کی۔ اس نے انٹونیس سے محبت کی تھی اور پھر بے پایاں محبت۔ ایسی محبت جس میں ان دونوں کی رُوحوں کا اِتصال ہوگیا تھا لیکن خدا نے اس کے محبوب کو چھین لیا۔ اب وہ سیزر کے ہاتھوں میں قید تھی اور شدید سزا پانے والی تھی۔

کلوپیٹرا اپنے اُن مجرمانہ افعال کے لئے معافی مانگ رہی تھی جو انٹونیس کی محبت میں سرزد ہوتے تھے۔ وہ بار بار معافی کی طالب ہو رہی تھی۔ سیزر ظاہرا اور بناوٹ سے اس کے جرائم کی تردید کر رہا تھا۔ حالانکہ اس کا ارادہ کچھ اور ہی تھا۔ مگر پھر بھی جب کلوپیٹرا نے اس کو مہربان ہوتے دیکھا تو امید بھرے دل کے ساتھ سیزر سے ملتجی ہوئی کہ مجھے موت سے بچا لیا جائے۔ کیونکہ کچھ دن اور میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

باوجود اس کی اس قابلِ رحم حالت کے اس کا حُسن ...... متاعِ دل کو لوٹ لینے والا حُسن .... سیزر سے اس کی سفارش کر رہا تھا!

آخر کار کلوپیٹرا نے سیزر کو لالچ دیتے ہوئے کہا کہ "میں اپنے تمام جواہرات اور خزانے تمہاری خدمت میں پیش کرنے کے لئے طیار ہوں بشرطیکہ تم مجھے معاف کر دو"۔ لیکن اُسی وقت اتفاقاً اُس کا خزانچی سیلوکس سیزر کے سامنے حاضر ہُوا اور سیزر کو آگاہ کیا کہ وہ کلوپیٹرا کی تمام گفتگو کو محض گپ سے بڑھ کر اہمیت نہ دے۔

کلوپیٹرا غصہ میں کانپ اٹھی۔ اس کے دماغ میں اشتعال سے آگ سی لگ گئی تھی۔ اس نے خزانچی کو سر کے بالوں سے گھسیٹتے ہوئے چلّا کر کہا۔

"سیزر۔ کیا کلوپیٹرا بدبخت کے لئے یہ باعثِ ننگ نہیں ہے کہ وہ شاہی وقار سے بھی محروم کر دی

جائے؟ کیا کلوپٹرا کے لئے یہ روحانی اذیت کا باعث نہ ہوگا کہ اس کا ادنیٰ خادم جو کل زبان ہلانے کی جرات نہ کرتا تھا آج اس کے آگے زبان درازی کرے چغلی کھائے اور اس کے منہ پر اس کو جھوٹا کہے۔ اس کے بعد اس نے خزانچی کو دھکے دے کر نکال دیا۔ سیزر نے اس کو تسلی دی کہ میں تمہاری زندگی اور تمہارے وقار کی حفاظت کے لئے حتی الوسع کوشش کروں گا لیکن یہ تسلیاں اوپری دل سے تھیں۔

(۳)

کارناس ڈولابیلا نے جو سیزر کا بہترین رفیق اور کلوپٹرا کا چاہنے والا تھا خفیہ طور پر کلوپٹرا کو لکھ بھیجا کہ سیزر سیریا کے سفر پر جانے والا ہے اور پھر تین دن کے اندر وہ تمہیں مع تمہارے بچوں کے جلاوطن کر دے گا جب کلوپٹرا نے یہ روح فرسا خبر سُنی تو اس نے سیزر سے التجا کی کہ مجھے آخری مرتبہ اپنے عاشق انٹونیس کی قبر کی زیارت کی اجازت دو۔ اس کو اجازت دے دی گئی۔ کلوپٹرا مع چند مسلح فوجیوں اور سہیلیوں کے انٹونیس کی قبر کی طرف روانہ ہوئی۔ قبر پر پہنچتے ہی اس کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہوگیا اور وہ گھٹنوں کے بل جھک گئی اور قبر کو مخاطب کرتے ہوئے بولی" انٹونیس۔ اے میرے آقا۔ میں نے ہی تجھ کو اپنے ہاتھوں سے اس قبر میں سلایا اور دنیوی تکالیف کا مقابلہ کرنے کے لئے اس دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ میں یہاں ایک قیدی کی زندگی بسر کر رہی ہوں، حتیٰ کہ اپنی زندگی کا خود خاتمہ نہیں کر سکتی۔ اے آرام کرنے والے! تو خود سمجھ سکتا ہے کہ میں کن الجھنوں اور مخمصوں میں گرفتار ہوں۔ جب تک کہ تو زندہ تھا کوئی طاقت ہمیں جُدا نہ کر سکی۔ اب جب کہ تو آغوش لحد میں سو رہا ہے مجھ بیکس پر طرح طرح کے مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ قدرت کی نیرنگیاں دیکھ! تو ایک رومن ہے لیکن مصر میں مدفون ہے میں ایک مصری ہوں لیکن اٹلی میں دفن کی جاؤں گی۔

میں اس مفلسی کے عالم میں تجھے کچھ نذر نہیں کر سکتی۔ ہاں کلوپٹرا اپنی زندگی اور اپنا جسم تجھ کو دے سکتی ہے۔ معزز آقا! کلوپٹرا کے دل میں صرف ایک تمنا باقی رہ گئی ہے اور وہ آخری تمنا ہے۔ وہ یہ کہ میرے مرنے کے بعد ہم دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا جائے۔

اپنے اس غمناک نوحہ کے بعد کلوپٹرا نے اپنا قیمتی ہار اور چند گلدستے قبر کی نذر چڑھائے اور ایک مرتبہ قبر کو بھینچ کر لپٹنے کے بعد اپنے اشک ہائے گرانمایہ کو نذر کر کے رخصت ہو گئی!

اس کے بعد اس نے غسل کیا اور بہترین لباس زیب تن کیا اور کھانے کی میز پر بیٹھ گئی۔ وہ بعینہ ایک فردوسی حور معلوم ہو رہی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے چند خطوط سیزر کو لکھے اور روانہ کر دئے۔ باقی نوکروں اور پہرے والے سپاہیوں

کو اس نے تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ صرف وہ اور اُس کی دو سہیلیاں اراس اور شارمین اس کے ساتھ باقی رہ گئی تھیں۔ اس کے بعد ان تینوں نے اپنے کمرہ کو خوب مضبوط بند کر لیا۔

سیزر نے کلوپطرا کے روانہ شدہ خطوط کو پڑھا جو شدید رنج والم میں اس کو لکھے گئے تھے۔ ان میں اس سے الحاح وزاری کے ساتھ درخواست کی گئی تھی کہ کلوپیٹرا کو اس کی موت کے بعد انطونیس کے ساتھ دفن کیا جائے۔

سیزر نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ کہیں کلوپیٹرا نے خودکشی نہ کر لی ہو۔ چند آدمیوں کو فوراً اس کے محل کی طرف روانہ کیا۔ ان لوگوں نے پہرے دار سپاہیوں کو حالات سے بے خبر پہرہ دیتے دیکھا۔ کلوپیٹرا کا کمرہ توڑا گیا۔ لیکن وہاں کیا دھرا تھا؟ کلوپیٹرا کا بے جان مجسمہ جس کی روح موت کے ابدی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ اس کی دو سہیلیاں ایک افعی کو کلوپیٹرا کے حکم سے زندہ پکڑ لائی تھیں جس سے ان تینوں نے اپنے آپ کو ڈسوا لیا۔

اس کی ایک سہیلی تو اُس کے قدموں پر پڑی ہوئی تھی اور دوسری کلوپیٹرا کے تاج کو سنبھالے ہوئے تھی جس کو اُس نے آخری مرتبہ سر پر رکھا تھا۔ اس طرح غریب کلوپیٹرا کی زندگی ختم ہوئی۔

ترجمہ **منیر الدین** حیدرآبادی۔

ہوشیار!

رنگیں خیالیوں پہ اگر ناز ہے تجھے ۔۔۔ پھولوں کا رنگ دیکھ چمن کی بہار دیکھ

فیاضیاں تجھے ہیں اگر باعثِ غرور ۔۔۔ گنگ و جمن کو دیکھ کے ابرِ بہار دیکھ

ہے جوہرِ خرد کی اگر خواہشِ نمود ۔۔۔ لعل و زمرد و گہرِ آبدار دیکھ

ہو مرتبہ میں تجھ کو بلندی اگر نصیب ۔۔۔ کوہِ ہمالیہ کا عروج و وقار دیکھ

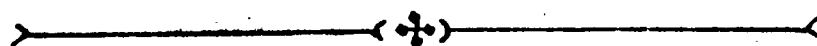
خوش قامتی و حسن سے گر بہرہ یاب ہے ۔۔۔ سروِ چمن کو دیکھ گلوں کا نکھار دیکھ

کرتی ہے قدرِ زیست تو کسبِ کمال کر

رہ خود فروشیوں سے مگر ہوشیار دیکھ۔

جگر بریلوی

سرودِ نشاط



چھایا ہوا بہشتِ بریں کا سماں ہے آج — اک نو بہارِ ناز مرا میہماں ہے آج
ہر سمت گرمِ رقص ہے اک زندگی کی لہر — جاں بخش بوئے کاکلِ عنبر فشاں ہے آج
ہر ذرہ ہے ہجومِ تجلّی سے مہر و ماہ — یہ عرصۂ زمیں تو نہیں آسماں ہے آج
دیتی ہے ہر شگفتہ کلی دعوتِ سکوں — موجِ ہوا میں نغمۂ امن و اماں ہے آج
آنکھوں سے اُٹھ رہے ہیں نظر آزما حجاب — بے پردہ رازِ ہستی کون و مکاں ہے آج
طے ہو رہے ہیں معرفتِ عشق کے مقام — لعلِ فسوں طراز خود افسانہ خواں ہے آج
ٹھکرا رہا ہے کوئی خُلدِ بریں کا جہانِ تنگ — ہر سانس موجِ زندگیِ جاوداں ہے آج
دُھندلی سی اک ضیا ہی جہاں عینِ سرمدی — آسُودہ اُس مقام پہ عمرِ رواں ہے آج
لیتے ہیں مہر و ماہ کی تزئین کے لئے — ہر ذرۂ حقیر وہ جنسِ گراں ہے آج
سب ختم ہو رہے ہیں مقاماتِ وجد و ذوق — منزل شناس راہبرِ کارواں ہے آج
آنکھوں میں ہو رہا ہے بیانِ حدیثِ عشق — صرف ایک قلب ہی کہ مرا رازداں ہے آج
اللہ رے ذوقِ بادہ کشی جام کے عوض — ہر رند محوِ خواہشِ رطلِ گراں ہے آج
بیخوف جا رہی ہے مری کشتئ مراد — وہ ناخدا ہیں پرتوِ مے بادباں ہے آج
ہے وہ فضا کہ خاکِ چمن بھی ہے گلفروش — ہے وہ سماں کہ پیرِ دوتا بھی جواں ہے آج

اختر یہ بزمِ عیش، یہ ساقی، یہ دورِ جام
زندہ ہوں میں ابھی، یہ مجھے بھی گماں ہے آج

علی اختر
حیدرآباد دکن

—"آپ ہی حیراں ہونا"

چچاجان "آزاد خیال" تھے ——— یعنی مائل بہ دہریت۔ اگلے زمانے کے لوگ تو کسی قدر سریع الاعتقاد ہونے کی وجہ سے مذہب کی غرض و غایت سمجھنے کی کوشش کئے بغیر اپنے آبائی دین پر مرتے دم تک قائم رہا کرتے تھے۔ اُس وقت کسی پیش پا اُفتادہ "مذہب" کا پیرو ہونا ایک دلپذیر فرسودگی تھی اور دہریت اور لامذہبیت جدت۔ موجودہ صدی میں ہمارے جذبات و محسوسات میں منطقیت اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ ہم کسی چیز کو دیکھے سُنے، چکھے، سونگھے یا چھوئے بغیر اس کے وجود کے قائل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں لامذہبیت آسان ترین چیز ہے۔ اسی لئے عام ترین اور مذہب کی روحانی اہمیت کا اندازہ لگانا اور اس پر یقین واثق اسی تناسب سے دشوار۔ چچاجان آزاد خیال تھے ——— محض حماقت کی وجہ سے، اسی طرح جیسے پچھلے زمانہ کے لوگ مذہبی ہوا کرتے تھے۔ کسی مُلّا یا پنڈت کی محض شکل دیکھ لینا ہی ان کے واسطے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ اکثر مولویوں پر اپنے "جلالِ صادق" کے ساتھ مُکّے اٹھایا اور دانت پیسا کرتے تھے، کبھی کبھی ان کے منہ سے کوسنے بھی نکل جاتے ——— "خدا ان مردودوں کو غارت کرے"! ——— اس کوسنے میں جو ستم ظریفی پنہاں ہے اس کا احساس ان غریب کو نہ ہوا۔ مگر میں کبھی ان کی اس حرکت پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، جیسے وہ غالباً اپنی اس مردانگی کا خاموش اور حیرت آمیز اقبال تصور فرمایا کرتے تھے۔

مذہب کے معاملات میں میں خود آزاد خیال ہوں۔ مگر مجھ میں اور چچاجان میں فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ دشمن ہیں لفظ "مذہب" اور اس کے لوازمات کے اور میں محض بدعت و وہم کا۔ مقاماتِ پرستش خواہ کسی مذہب کے ہوں چچاجان کو دائرۂ اختیار سے باہر کر دینے پر مجبور ہیں میں نے انہیں بارہا سمجھایا کہ حضرت مسجدیں اور مندر تو محض قبلہ نما ہیں ——— قبلہ تو وہ "عظیمِ نامعلوم" ہے جسے بے نقاب کرنے میں آپ کی سائنس نہایت شدت سے مصروف ہے۔ ہمارا دائرۂ علم رفتہ رفتہ وسیع ہو رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مقاماتِ پرستش روز بروز معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ یقین رکھئے وہ زمانہ قریب ہے جب مسجدیں اور مندر بورئیے، گھنٹیوں اور بدنیوں کی بجائے، خوردبینوں، دوربینوں اور برقی آلاتِ مطالعہ سے آراستہ ہوا کریں گے۔ مگر چچاجان عادی تھے کہ تقریباً ہر شے میں مجھ سے اختلاف کریں۔

وہ وطن پرست تھے۔ میں کچھ نہ تھا۔ وطن پرستی بھی تو ایک قسم کا مذہب ہے اور غالباً دنیا کے نصف تعصب اور اختلاف کا ذمہ دار۔

اس کے علاوہ چچا جان ایک ایسی انجمن کے فرد بھی تھے، جس کا مقصد تمام دنیا کے مذاہب کی اندھی مخالفت کرنا ہے۔ مگر جو اپنی اس تنگ نظری کو "امداد باہمی" اور اسی وضع کے "نوق البھڑک" اصولوں میں چھپا کر اسے عوام کے لئے جاذبِ توجہ بنا رہے تھے۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا "چچا جان! آپ کی جماعت کے تمام افراد اُن جاہل عورتوں سے بھی بدتر ہیں جو بے امتیاز ہر ایسی قبر پر ماتھا ٹیکنے کو تیار ہیں جس پر گنبد بنا ہُوا ہو۔ اگر آپ کسی نہ کسی مذہب کا سہارا لینے پر مجبور ہیں تو پرانا مذہب اس سے بدرجہا بہتر ہے۔

"آپ کی انجمن کا سب سے بڑا مقصد امداد باہمی ہے۔ بہت دل کش اصول ہے۔ مگر غالباً آپ حضرت محمد کے مشہور اصول کو بھولے جا رہے ہیں ——— کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ" اس تمام قدر طویل اور تکلیف دہ استدلال کے جواب میں ہمیشہ چچا جان کہتے "ہم لوگ مذہب کے خلاف ایک مذہب کھڑا کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے مقاصد بارور ہوئے تو یہ لفظ بہت جلد دنیا سے نابود ہو جائے گا۔ دراصل ہماری انجمن ایسے افراد کا مرکز ہے۔ جو خدائیت سے عاجز آ چکے ہیں"۔

"بہت خوب" میں جواب دیتا "مگر قبلہ یہی تو وہ چیز ہے جس کے باعث میں آپ کو اخلاق اور معاشرت کے واسطے عظیم ترین مصیبت خیال کرتا ہوں۔ اگر آپ حضرات کا مقصد ہوتا تخریب ——— مجرد تخریب ——— تب تو خیریت تھی۔ مگر بدقسمتی سے آپ کا مقصد تو صرف مجادلہ ہے۔ آپ ایک جنس کی قیمت محض اس لئے گھٹا رہے ہیں کہ آپ کا حریف دیوالیہ ہو جائے اور یہ صریح مقابلہ ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ کی انجمن محدود ہوتی آپ جیسے آزاد خیال حضرات تک تب تو خیر، مگر کیفیت یہ ہے کہ آپ نے چند غیر معمولی قسم کے وعدے کر کے بہت سے ایسے سادہ لوحوں کے واسطے بھی جال بچھایا ہے۔ جن کا اعتقادِ مذہبی آپ سے یکسر مختلف ہے۔ اب ملاحظہ فرمایئے کہ مولینا عبدالحیٔ "مجلس العلماء" کے صدر بننے سے قبل آپ کی انجمن کے فرد تھے۔ ان تمام چیزوں کے باوجود اگر آپ اپنی انجمن کو مذہبیت کے خلاف ایک قلعہ کہیں تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کا قلعہ گارے کا بنا ہُوا ہے"۔

چچا جان ایک اندازِ برتری کے ساتھ اپنی آنکھوں کو جنبش دے کر فرماتے "صاحبزادے ہمارے اہم ترین مقاصد تو سیاسی ہیں۔ تم جانتے ہو مذہب بھی تو آخر سیاست ہے اور ہم لوگ ملوکیت کے استیصال میں بھی اسی اہتمام کے ساتھ مصروف ہیں جس کے ساتھ مذہب کے استیصال میں۔

میں ہنسی ضبط نہ کر سکا "بے شک آپ لوگ بہت ذہین ہیں" پھر سنجیدگی سے "اگر آپ فرماتے کہ ہماری

انجمن ایک آلۂ انتخاب ہے تو مجھے مان لینے میں تامل نہ تھا اگر آپ کہتے کہ ہم تو محض لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈال کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں تب بھی مجھے اس کے باور کر لینے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر جب آپ پوری متانت کے ساتھ اس امر کا اعلان فرماتے ہیں کہ ہمارا مقصد تو ملوکیت کی بیخ کنی کرنا ہے تو میں وہی حرکت کرنے پر مجبور ہوں جو ابھی کی ——"

جب کبھی چچا جان اپنی انجمن کے کسی فرد کو کھانے پر مدعو کرتے تو منظر قابل دید ہوتا تھا۔ ملاقات ہونے پر پہلے تو وہ ایسے انداز میں مصافحہ کرتے کہ دیکھنے والا محوِ حیرت رہ جاتا۔ تھوڑی دیر ایک دوسرے کے ہاتھوں کو نہایت پُراسرار انداز میں آہستہ آہستہ دباتے رہنے کے بعد وہ علیحدہ ہو جاتے۔ پھر چچا جان کو یکایک کوئی بھولی ہوئی بات یاد آتی اور وہ اپنے دوست کو "چند ضروری امور" پر گفتگو کرنے کے لئے ایک محفوظ کونے میں لے جاتے۔ کھانا کھانے کے دوران میں بھی وہ دونوں ایک دوسرے کی جانب بے حد متوجہ رہتے اور ان کا طرزِ عمل زبانِ حال سے یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا "سمجھ گئے نا، ہاں!"

ہمارے قصبہ میں ایک مولینار ہتے تھے جن سے چچا کو طبعی نفرت تھی جب کبھی وہ ان غریب کو دیکھتے اُن کے غصہ کی انتہا نہ رہتی ایک روز میں اور وہ تفریحاً باغ میں جا نکلے مولوی صاحب اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ چچا جان نے ان کی طرف نہایت غیض آلود نظروں سے دیکھا اور میرے بازو کو زور سے جھٹکا دے کر فرمایا "اس شخص کو جانتے ہو؟ مجھے یقین ہے کہ یہ مجھے کسی نہ کسی دن دھوکا ضرور دے گا"

آج میں چچا جان کی اس پیغمبرانہ پیشگوئی پر حیرت میں پڑا ہوا ہوں۔

رمضان شریف کا مہینہ تھا، اور چچا جان نے بزعمِ خود محض اس مہینہ کے تقدس کو برباد کرنے کے لئے دوپہر کی دعوت دی تھی۔ میں نے مقدور بھر عذر کیا۔

رمضان شریف میں کھانا کھانے کو تو میں تیار ہوں۔ مگر اس مظاہرہ میں کوئی ذہانت نہیں پاتا اگر لوگ رمضان میں روزے رکھتے ہیں تو اس میں آپ کا نقصان؟

مگر چچا جان اس قسم کی گفتگو پر اپنی توجہ ضائع نہیں کیا کرتے۔ ان کے تین دوست بھی مدعو تھے اور چونکہ مجھے یقین تھا کہ کھانے کا بل چچا جان ہی ادا کریں گے اس لئے میں اس مظاہرۂ آزادخیالی کے واسطے بھی تیار تھا۔

گیارہ بجے کے قریب ہم لوگ شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں سب سے زیادہ عام جگہ تلاش کر کے بیٹھ گئے اور چچا جان نے نہایت بلند آواز سے حکم دیا کہ کھانا بارہ بجے حاضر کیا جائے۔

دعوت وقت پر شروع ہوئی یعنی بارہ بجے۔ اور جب ہوٹل کے گھنٹے نے تین بجائے تو ابھی تک ہم لوگ کھانے میں مصروف تھے۔ بل آنے پر معلوم ہوا کہ محض لیمونیڈ کی بوتلیں دو درجن سے کچھ زیادہ پی گئی تھیں۔

چار بجے کے قریب ہم ہوٹل سے اس کیفیت میں نکلے کہ ہر شخص کا پیٹ اپنی معمولی وسعت سے کم و بیش دو انچ زیادہ جگہ گھیر رہا تھا۔ چچا جان کی حالت خصوصاً بہت خراب تھی۔ ایسی صورت میں ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ ٹیکسی کرایہ پر لینا ایک ایسا سماجی فرض تھا جس کی انجام دہی کا ہم میں سے ہر شخص بے حد مشتاق تھا۔

جب میں اپنے مکان کے قریب پہنچا تو شام رات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میرا دماغ قدرے مخمور تھا لیکن خیالات میں ایک غیر فطری شگفتگی تھی۔ بجلی کی طرح ایک بات میرے ذہن میں آئی۔

میں نے جلدی جلدی اپنے کپڑے صاف کئے اور چہرہ پر آثارِ حزن و ملال طاری کر کے مولوی صاحب کے مکان پر جا کر بڑے زور زور سے کنڈی کھٹکھٹائی۔ مولینا صاحب قدرے اونچا سنتے تھے اس لئے میری پیہم پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد محلہ میں آخری جاگنے والے شخص غالباً وہ خود تھے۔

میں پوری طاقت کے ساتھ چیخا "مولینا جلدی کیجئے! ایک مایوس مریض آپ کی روحانی مدد کا محتاج ہے"۔

مولینا نے جلدی جلدی تہ بند اتار کر پاجامہ زیب تن کیا اور اپنی روئی کی ٹوپی اور سیاہ لبادے سے آراستہ ہو کر باہر تشریف لائے۔ میں نے نہایت فکرمند لہجے میں انہیں بتایا کہ چچا جان یکایک سخت علیل ہو گئے ہیں اور چند ہی گھنٹے میں مرض نے اس قدر تشویش خیز صورت اختیار کر لی ہے کہ انہیں خود اپنی زندگی کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔ اس وقت آپ سے ملنے کے بہت آرزومند ہیں۔ ان کا مقصد ہے کہ اپنے گذشتہ گناہوں کی معافی مانگیں اور اگر بچ جائیں تو آیندہ خدا کے نیک بندوں کی سی زندگی گذاریں"۔

مولوی صاحب پہلے تو قدرے چونکے۔ مگر پھر جلد ہی ان کے چہرہ پر مسرت و طمانیت کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے "ایک منٹ توقف کیجئے، میں ابھی چلتا ہوں" انہوں نے اشتیاق سے کانپ کر کہا۔

میں نے لہجے میں لجاجت پیدا کر کے کہا "مولانا معاف فرمائیے گا۔ میں آپ کے ہمراہ نہیں چل سکوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے عقاید اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لئے مہربانی فرما کر اُن کے سامنے میرا تذکرہ

نہ کیجیے گا۔ کہئے کہ آپ کو اس کی اطلاع کشف کے ذریعہ ہوئی ہے"۔

مولوی صاحب راضی ہو گئے اور لپکے ہوئے چچا جان کے مکان پر پہنچے۔

میں قریب ہی ایک مکان کے برآمدہ کے نیچے چھپ کر واقعات کا انتظار کرنے لگا۔ اگر چچا جان معمولی حالت میں ہوتے تو غریب مولوی کے قتل ہو جانے میں کوئی شبہ نہ تھا مگر مجھے یقین تھا کہ آج کی دعوت کے بعد وہ اس قدر لسپت ہو کر لیٹے ہونگے کہ انگلی بھی نہ ہلا سکیں گے اس لئے نتیجہ کا اندازہ لگانا قدرے دشوار معلوم ہوتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ انجام "حزینہ" ہوگا۔

سردی بڑھتی جا رہی تھی مولوی صاحب ابھی اندر تھے۔ میں نے سوچا کہ بحث ہو رہی ہوگی۔ بار بار مجھے اس نادر اختراع پر ہنسی آ رہی تھی۔

ایک گھنٹہ گذرا، دو گھنٹے، تین گھنٹے ابھی دروازہ بند تھا اور مولوی صاحب اندر۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مولینا اور چچا جان کے مابین واقعات کیا صورت اختیار کر رہے ہیں۔ ایک امکان تھا کہ مولینا اپنے غصہ کی شدت سے خود ہی وفات پا گئے ہوں دوسرا یہ کہ مولینا کو نا کردہ کوئی آزار پہنچا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دونوں بزرگ "اکل باہمی" کے مرتکب ہوئے ہوں۔ مگر آج کی دعوت کے بعد کم از کم چچا جان اس کے قطعاً ناقابل تھے۔

دو بج گئے آسمان پر سیاہی ہلکی پڑنے لگی۔ صبح کاذب کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ نیند کے مارے میرا برا حال ہوا جا رہا تھا۔ چچا جان کے مکان میں جا کر صورت حالات کا اندازہ لگانا بے وقت اور نامناسب تھا۔ اس لئے میں قریب ہی ایک دوست کے گھر چلا گیا وہ اس بے وقت کی تشریف آوری سے قدرے سراسیمہ ہوئے مگر جب میں نے واقعات بتائے تو بہت ہنسے۔ مکان کی کھڑکی میں بیٹھ کر میں مولینا کے انتظار میں مصروف ہو گیا۔ تین بجے کے قریب میں نے اپنے دوست کو جگا کر اپنی جگہ بٹھایا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کی نیت کر کے لیٹ رہا۔ صبح سات بجے میری آنکھ کھلی تو میرے دوست بیچارے ابھی تک انتہائی انہماک کے ساتھ چچا جان کے دروازے پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھے اور مولوی صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

آخر آٹھ بجے کے قریب دروازہ کھلا اور مولینا نہایت اطمینان و مسرت کے انداز میں برآمد ہوئے ان کی چال میں اعتماد تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں شرمندہ ہو کر چچا جان کے مکان پر پہنچا۔ وہ ابھی تک بستر میں ہی تھے۔ چہرہ پر زردی کھنڈی ہوتی تھی اور آنکھوں میں تھکن اور بے خوابی کے آثار تھے۔ ایک چھوٹی سی حمائل ان کے تکیے کے پاس رکھی تھی "کیوں چچا جان خیریت؟ ابھی تک بستر میں لیٹے رہنا کیا معنی؟" انہوں نے نہایت نحیف آواز میں جواب دیا "عزیزی خیریت کہاں؟ آج تو گویا ہم قبر کے منہ سے واپس ہوئے ہیں"۔

"یعنی؟ ———" میں قدرے متحیر ہوا۔ چچا جان کے منہ پر سرخی کا نام نہ تھا۔ چچا جان نے میرے سوال کی طرف بالکل توجہ نہ کرکے کہا "مگر سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہوا کہ وہ مولوی صاحب جو ابھی تشریف لے گئے ہیں۔ ——— تم ان مولینا کو جانتے ہو نا جن کا ہم اکثر مذاق اڑایا کرتے تھے؟ ——— انہیں میری علالت کے متعلق کشف ہوا اور وہ مجھے دیکھنے کے لئے آئے تھے"

میری ہنسی کے مارے بری کیفیت تھی۔ مگر بڑی دشواری سے سنجیدہ صورت بنا کر کہا "واقعی؟ ہاں وہ تشریف لائے تھے انہوں نے ایک آواز بہ کہتی ہوئی سنی "اے خدا کے بندے اٹھ اور فلاں شخص کی مدد کر" میں نے چھینکنے کا بہانہ کیا پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑے جا رہے تھے۔ تقریباً ایک منٹ کے بعد میں نے نہایت برافروختگی کے لہجہ میں کہا۔

"اور آپ نے۔ آپ جیسے آزاد خیال، فاخر علی الدہریت شخص نے انہیں گھر سے نہ نکلوا دیا۔ چچا جان سراسیمہ سے تھے "میاں سنو تو سہی۔ تمام واقعات اس قدر حیرت انگیز ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مولوی صاحب نے مجھ سے والد صاحب کا تذکرہ بھی تو کیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ ان کے دوست تھے ......"

"مگر آپ کے والد کا تذکرہ کرنا تو ایک مولوی کو مکان پر رکھنے کا کوئی معقول عذر نہیں"

"ہاں ہاں! مگر میں سخت بیمار تھا اور وہ تمام شب نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ میری تیمارداری کرتے رہے۔ مجھے یقین ہے کہ آج اسی شخص نے میری جان بچائی ہے۔

میں نے طنزاً کہا "اوہو تو کیا مولینا ابھی تشریف لے گئے ہیں؟"

"ہاں تمام شب کی کوفت کے بعد میں نے انہیں بمشکل ناشتہ کرنے پر راضی کر لیا تھا ابھی تو گئے ہیں تمہارے آنے سے پندرہ منٹ قبل"

"اور انہوں نے رمضان میں ناشتہ کیا؟"

چچا جان قدرے گھبرائے۔ گویا میں نے کوئی بہت بے تکی بات کہی ہو۔

"مذاق کرتے ہو اس غریب نے میرے ساتھ اس قدر محبت اور شفقت کا سلوک کیا ہے کہ اپنے عزیزوں سے بھی توقع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میں اس کے عقائد و اعمال کی عزت کرنے اور کرانے پر مُصر ہوں"۔

مجھے یقین ہو گیا کہ صورتِ حال قابو سے باہر ہو چکی ہے "اچھا چچا جان، خدا حافظ معلوم ہو گیا کہ آپ آزاد خیالی ترک کر رہے ہیں۔ انہوں نے بات ٹالنے کے انداز میں کہا "مگر مذہب بھی تو آزاد خیالی ہے"۔

دوسرے روز مجھے اپنے مذاق کا نتیجہ معلوم ہو گیا۔ چچا جان لامذہبیت چھوڑ کر پکے مسلمان بن چکے تھے اور اگر یہیں معاملہ رفع دفع ہو جاتا تو ہرج نہ تھا مگر ہوا یہ کہ دوسرے روز ہی انہوں نے اپنی وصیت لکھی اور مجھے اس مردود مولوی کے حق میں عاق کر دیا:

(ملخص از موپساں)

معین الحق جعفی

میں تو وہیں تھا

اک شخص چلا گھر سے نکل کر سوئے صحرا
مولا کی طلب میں زن و فرزند کو چھوڑا
سمجھا، زن و فرزند ہی ہیں مانعِ دیدار
ہے منزلِ مقصود میں حائل، یہی دیوار
صحرا میں، سمندر میں، اُسے ڈھونڈ رہا تھا
ہر بحر میں، ہر بر میں اُسے ڈھونڈ رہا تھا
کھویا گیا، خود آپ، مگر اُس کو نہ پایا
سب کھو کے بھی بیچارے کو کچھ ہاتھ نہ آیا
مایوسی سے دل ٹوٹ گیا، پاؤں کے مانند
ڈھلتی رہی عمر اس کی یونہی چھاؤں کے مانند
بیچارے پہ جس وقت گھٹا موت کی چھائی
اُس وقت کسی کی یہ صدا کانوں میں آئی
اے طالبِ حق! حق تو ترے گھر میں مکیں تھا
جس جا سے تو نکلا تھا، ارے میں تو وہیں تھا

ترجمہ سید احمد حسین امجد

یتیم

(پہلی صدی قبلِ مسیح کی یہ ایک چینی نظم ہے۔ شاعر کا نام معلوم نہیں)

یتیم ہونا،
قسمت میں یتیمی لکھی ہوئی،
کیسی تلخ زندگی ہے!
جب میرے والدین زندہ تھے
میں گاڑی پر سوار ہوا کرتا تھا
جس میں چار نفیس گھوڑے لگے ہوتے تھے۔
مگر جب والدین کا انتقال ہوگیا
میرے بھائی اور بھابی نے
مجھے تجارت کرنے کے لئے باہر بھیج دیا
میں نے جنوب میں نو دریاؤں تک سفر کیا
اور مشرق میں چی اور لو تک گیا
سال ختم ہونے پر جب میں گھر واپس آیا
تو مجھے اُن کو یہ بتانے کی ہمت نہ ہوئی کہ میں نے کیا کیا مصیبتیں جھیلی تھیں۔
سر میں جوئیں۔ منہ پر اور آنکھوں میں گرد و غبار۔
میرے بھائی نے مجھے کھانا تیار کرنے کے لئے حکم دیا
اور بھابی نے گھوڑوں کی نگہداشت میرے سپرد کی۔
میں اوپر کے کمرے میں جاتا تھا
اور پھر دوڑ کر نیچے کے دالان میں واپس آتا تھا،
میری آنکھوں سے مسلسل آنسوؤں کے قطرے گر رہے تھے،
صبح کے وقت انہوں نے مجھے پانی لانے کے لئے بھیجا،
میں شام سے قبل واپس نہ آسکا
میرے ہاتھ ٹھٹھرے جارہے تھے،
میرے پاس جوتا نہیں تھا،
میں سرد یخ زمین پر چل رہا تھا

کانٹوں اور جھاڑیوں کو روندتا ہوا،
جب میں کانٹوں کو اپنے تلووں سے نکالنے کے لئے رک جاتا،
آہ! اس وقت میں کیسی بے کسی محسوس کرتا!
میرے آنسو بہے جاتے تھے
اور میں سسکیاں لیتا ہوا جا رہا تھا۔
موسم سرما میں میرے پاس کوٹ نہیں ہوتا
اور گرمی میں باریک کپڑے!
زندہ رہنے میں کوئی لطف بھی نہیں ہے
کاش میں اس زمین کو جلد چھوڑ دیتا
اور "زرد چشموں" کے نیچے چلا جاتا
اپریل کی ہوائیں بہہ رہی ہیں
سبزہ اگ رہا ہے،
تیسرے مہینہ میں ریشم کے کیڑے اور شہتوت،
چھٹے مہینہ میں خربوزے کا موسم
میں خربوزوں کی گاڑی کے ساتھ گیا
اور جب میں گھر واپس آرہا تھا،
گاڑی الٹ گئی۔
جن لوگوں نے میری مدد کی اُن کی تعداد کم تھی
مگر جو میرے خربوزے کھا گئے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی
انہوں نے صرف چھلکے چھوڑ دیئے،
کہ انہیں لے کر میں جلد سے جلد مکان پہنچ جاؤں۔
میرے بھائی اور بھابی میرے ساتھ سختی سے پیش آئے،
انہوں نے مجھ سے پریشان کن سوالات کئے۔
دیہات میں ہر شخص مجھ سے کیوں نفرت کرتا ہے؟
میں ایک خط لکھنا چاہتا ہوں اور اس کو بھیج دینا چاہتا ہوں
زمین کے نیچے اپنے والدین کے پاس،
اور اُن کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اب
اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ ایک لحظہ بھی رہنا نہیں چاہتا۔

آرزو جیلی

ع۱ Yellow springs چینیوں کا خیال ہے کہ زرد چشموں کے نیچے "پردۂ ظلمات" ہے۔ زرد چشموں کے نیچے چلے جانے سے مراد مرجانے سے ہے۔

جب میں چھ برس کا تھا

اور

تم چار برس کی تھیں

(ایک انگریزی نظم)

تم اور میں مرغزاروں میں بہار کے شگفتہ پھولوں کے درمیان کھیلا کرتے تھے،
اُن دنوں جب میں چھ برس کا تھا، اور تم چار برس کی تھیں۔
ہم ہار گوندھتے تھے اور ایک دوسرے پر پھولوں کے گوے پھینکتے تھے۔
آہ یہ سادہ مسرتیں اتنی ہی گریز پا نکلیں جتنے بچپن کے دن۔
درختوں کے گھنے جھنڈوں اور مرغزاروں میں،
ہری ہری دوب اور جنگلی پھولوں کے فرش پر،
ننھے ننھے ہمجولیوں کے ساتھ، ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہم اِدھر اُدھر گھومتے تھے۔
مگر یہ ساٹھ سال کی بات ہے

رفتہ رفتہ تم ایک گل رُو دوشیزہ بن گئیں،
ہماری پہلی محبت اب بھی اسی طرح تر و تازہ تھی۔
ہمارے آسمان پر تاریکی کا کوئی دھبا نہ تھا،
زندگی کے دن مسرت کے نور سے جگمگاتے تھے
اور میں جان و دل سے تمہارا شیدا تھا۔
آہ یہ محبت کتنی گہری کتنی پاکیزہ تھی، الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔
اُن دنوں میں خیال کرتا تھا کہ تمہیں بھی مجھ سے ایسی ہی محبت ہوگی
مگر یہ پچاس سال کی بات ہے

پھر تمہارے گرد والہانِ محبت کے گروہ حلقہ زن رہنے لگے،
اور تمہارا روز افزوں حسن سیکڑوں دلوں کی سنہری امیدوں کا مرکز بن گیا۔
اس وقت میں نے تمہیں پہلی محبت کے عہد و پیمان سے روگرداں ہوتے ہوئے دیکھا،
تم دولت و ثروت اور منصب و اعزاز کی طرف جھک گئیں
اُس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا دل پاش پاش ہو رہا ہے
مگر یہ چالیس سال کی بات ہے

میں زندہ رہا اور ایک دوسری لڑکی سے میری شادی ہو گئی،
اُس نے مجھے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی، مجھے شکایت کا کوئی موقع نہ دیا،
اور جب میں نے سنا تم بچوں والی ہو گئی ہو،
میرے دل میں یہ خواہش نہ تھی کہ یہ بچے میرے ہوتے۔
میرے اپنے بچے میری عیدوں کی رونق بڑھانے کے لئے کافی تھے،
اور میں ان کی موجودگی میں بے قیاس مسرت محسوس کرتا تھا
مگر یہ تیس سال کی بات ہے

تم بڑی بوڑھی بن گئیں، پختہ سال، دلاویز، فربہ!
دولت و ثروت اور شکوہ و شان کی جگمگاتی دنیا میں۔
میری دنیا مقابلتہً بہت سیدھی سادھی تھی،
مگر مسرت کے دن میری قسمت میں بھی تھے۔
موسم سرما میں کسی آتش دان کے قریب،
کبھی اِس سے زیادہ مسرور آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی نہیں دیں، جتنی اس دن جب میرے سب سے چھوٹے بچے کا نام رکھنے کی رسم ادا ہوئی
مگر یہ بیس سال کی بات ہے

وقت گزرتا گیا میری سب سے بڑی لڑکی کی شادی ہو گئی،
میں ایک سفید ریش دادا بن گیا،
ایک چار سال کی بچی کو ساتھ لے کر میں خود رو پھولوں والے مرغزاروں میں پھرنے لگا
انہیں مرغزاروں میں جو ہمارے بچپن کی مسرتوں کا گہوارہ تھے
اور جہاں اب بھی جنگلی پھول اُسی طرح کھلتے تھے۔
وہ اپنی ٹوکری ان پھولوں سے خوب بھر لیتی تھی۔
اور یہ ابھی دس سال کی بات ہے

اگرچہ پہلی محبت کے جنوں پرور ولولے
ہوش و خرد کی پُرسکوں فضا میں گم ہو چکے ہیں،
لیکن میں ابھی اکثر محبت سے تمہیں یاد کرتا ہوں
اور اُس وقت تک کرتا رہوں گا جب یہ زندگی مجھے خدا حافظ کہہ دے گی۔
یہ بہم گزرنے والی ساعتیں
آخر ایک ایسا وقت لائیں گی جب ہم نہ ہوں گے۔
اور جب ہماری بچپن میں پھول چننے کی داستان صد سالہ سال کی پرانی بات ہو چکی ہو گی

حامد علی خاں

محفلِ ادب

پنچانہ ظرافت

بعضوں کا خیال ہے کہ پنچانہ ظرافت اکثر ذوقِ سلیم پر بار ہوتی ہے۔ پنچ میں لکھنے والے اکثر حدِ اعتدال سے گذر جاتے ہیں اُن کا مقصد، طنز اور ظرافت کے بجائے ٹھٹا فضیحت ہوتا ہے اور اس طور پر پنچ کے ذریعہ سے سوقیانہ ظرافت اور بازاری پھکڑ کو بے جا فروغ حاصل ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

ممکن ہے یہ فردِ جرم ادودھ پنچ یا کسی اور پنچ پر کامیابی کے ساتھ لگائی جا سکے لیکن یہ کہنا کلیتہً صحیح نہیں ہے کہ پنچ اس قسم کے پھکڑ یا فحاشی کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ پنچ کا وسیلہ، پھکڑ یا فحاشی ہو سکتا ہے۔ مقصد ہرگز نہیں ہوتا، پنچ کا مقصد عالمانہ اور فلسفیانہ ظرافت کی نشر و اشاعت نہیں ہوتا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ تبسم نہیں صرف قہقہہ کا قائل ہوتا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ تبسم سے زیادہ قہقہہ کا قائل ہوتا ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ یہ قہقہہ پھکڑ یا فحاشی کا محتاج ہوتا ہے یا کوئی سنجیدہ ظرافت بھی اس کی محرک یا معین ہو سکتی ہے تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ فی الحقیقت متبسم ہونے یا قہقہہ لگانے کا انحصار نفسِ ظرافت پر اتنا نہیں ہے جتنا خود متبسم ہونے یا قہقہہ لگانے والے کی افتادِ طبع پر۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق نفسِ ظرافت سے ہو بنا بر آں خود ظرافت کو معقول اور مہذب ہونا چاہیئے یہ اور بات ہے کہ اس پر کوئی قہقہہ لگائے یا متبسم ہو۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "معقول" اور "مہذب" کا معیار کیا ہے اور آیا پنچ اس کا پابند ہے یا نہیں۔ سرسری طور پر اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ معقول اور مہذب کا معیار وہی ہے جو معقول اور مہذب لوگوں کا شعار ہو۔ لیکن سوال کا دوسرا حصہ یعنی آیا پنچ کو اس کا پابند ہونا چاہیئے یا نہیں، کسی قدر پیچیدہ ہے۔ بظاہر یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ پنچ کو یقیناً اس کا پابند ہونا چاہیئے۔

یہاں اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پنچ کا مفہوم خود "عام پسندی" سے وابستہ ہے۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ یہی "عام پسندی" اکثر گر کر "عوام پسندی" کے حدود تک پہنچ جاتی ہے۔ ظاہر ہے جس تحریک کا مقصد "عام پسندی" ہوگا وہ "عوام پسندی" پر ختم ہوگی پنچ بالعموم اپنا مخاطب عوام کو سمجھتا ہے۔ ممکن ہے پنچ کو اس سے انکار ہو لیکن خود عوام اس سے کبھی انکار نہ کریں گے۔ یہاں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پنچ بعض پیچیدہ نکتے

دقیق مسائل اور پُر لطف اشارات کو اکثر ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ عوام اُس کو سمجھ سکیں یا نہیں لیکن اس پر سر دُھننے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں تاہم یہ فن یا طریقۂ کار اپنے مقاصد کے اعتبار سے کتنا ہی مستحسن کیوں نہ ہو، صد درجہ نازک اور خطرناک ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کوشش میں قطعاً ناکامی ہوتی ہے اور پنچ کی ظرافت سرتاسر عامیانہ اور بازاری ہو جاتی ہے۔

"عام پسند" یا "خاص پسند" کا مسئلہ نازک اور مشکل ہے۔ سیاسی اور معاشرتی مسائل کی اہمیت ممکن ہے "عام پسندی" سے وابستہ ہو۔ لیکن جہاں تک اس کا تعلق، طنز و ظرافت کے فن یا مذاقِ سلیم سے ہے یہ کہنے میں تامل نہیں کیا جا سکتا کہ طنز اور ظرافت کو ہر حال میں ٹکسالی ہونا چاہئے۔ عوام کے مذاق کو بھی "خواص" کی سطح پر لانے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس کوشش کا سب سے پہلا اور سب سے قوی اثر یہ ہوگا کہ ظرافت کی سطح، مائل بہ پستی ہونے کی بجائے ہمیشہ مائل بہ عروج رہے گی۔ یہ چیز نہایت ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ اس مقصد کی کامیابی میں پنچ کی خدمات سے ہمیشہ رجوع کرنا پڑے گا۔ "ہندوستانی"

جاحظ کے دو لطیفے

(۱)

جاحظ کہتا ہے مجھ کو عمر میں کسی سے شرمندگی نہیں اٹھانی پڑی، ہاں دو عورتوں نے بے شک مجھے بہت خجل کیا۔ جن میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے دروازے پر ٹہل رہا تھا کہ ایک عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ مجھے ایک بڑی سخت ضرورت درپیش ہے، ذرا تھوڑی دور تک میرے ساتھ چلے چلیئے۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا، ایک یہودی سُنار کی دکان پر جا کر کھڑی ہو گئی اور اس سے مخاطب ہو کر کہا "ایسا ہی" اور یہ کہہ کے چلتی بنی۔ میں نے سنار سے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے اس نے کہا کہ اس عورت نے ایک انگوٹھی مجھ سے بنوائی اور فرمائش کی کہ میں اس پر شیطان کی صورت نقش کر دوں میں نے کہا میں کیا جانوں شیطان کیسا ہوتا ہے؟ یہ سُن کے وہ چلی گئی اور اب یہاں آکر جو کچھ اُس نے کہا وہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے؟

(۲)

ایک آدمی میرے پاس آیا اور فرمائش کی کہ اپنے دوستوں کو ایک سفارشی خط لکھ دیجئے مجھے ضرورت ہے، میں نے ایک خط لکھا اور اس پر مُہر لگا کے اس کے حوالہ کیا،

رقعہ لے کر جب وہ باہر پہنچا، تو اُس نے رقعہ کا لفافہ پھاڑا، اور خط پڑھ لیا، اس میں میں نے لکھا تھا۔

یہ خط لکھ کے میں اس شخص کو دے رہا ہوں جسے میں ذرا بھی نہیں پہچانتا۔ اگر آپ اس کی حاجت پوری کر

دیں تو میں آپ کی تعریف نہیں کروں گا، اور اگر اسے ناکام واپس کر دیجئے، تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

وہ آدمی فوراً میرے پاس واپس آیا، میں نے کہا شاید تم نے میرا خط پڑھ لیا، اس نے کہا جی ہاں۔
میں نے کہا میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تمہیں گزند نہیں پہنچ سکتا، میں نے اپنی یہ علامت مقرر کر لی ہے کہ جب میں کسی کی سفارش کرتا ہوں تو ایسے ہی الفاظ لکھتا ہوں۔
اس نے کہا خدا تجھ پر لعنت کرے، تیرے ہاتھ پاؤں بیکار کر دے،
میں نے کہا یہ کیا،
اس نے جواب دیا، یہ میری علامت ہے، جب میں کسی شخص کا شکریہ ادا کرتا ہوں تو ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا ہوں۔

"جامعہ"

ابواسحاق کے اکالانہ تصرفات

پس از سی سال این معنی محقق شد بہ خاقانی ۔۔۔ کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

اس کا پہلا مصرعہ تو یقیناً خاقانی کا ہے، لیکن دوسرا نہیں۔ خاقانی کا اصل شعر یہ ہے:۔

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی ۔۔۔ کہ سلطانی ست درویشی و درویشی ست سلطانی

لیکن اس شعر کا دوسرا مصرعہ بدل کر ابواسحٰق نے وہ رکھ دیا جو اوپر لکھے ہوئے شعر میں پایا جاتا ہے۔
ابواسحٰق ایک شاعر تھا جو کھانے کا بڑا شائق تھا اور اس کی شاعری کی خصوصیت یہی تھی کہ سوائے کھانے کی چیزوں کے اور کوئی ذکر ہی نہ کرتا تھا، اس نے سعدی، حافظ وغیرہ کے بہت سے اشعار میں اس طرح کا تصرف کرکے اپنے ذوق کا اظہار کیا ہے۔
چنانچہ حافظ کے بعض اشعار مع تصرفات ابواسحٰق کے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

اشعار حافظ	تصرفات ابواسحٰق
آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند ۔۔۔ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند	کیپا پزاں سحر کہ سر کلّہ وا کنند ۔۔۔ آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند
ترک عاشق کش مامست برون رفت امروز ۔۔۔ تاکرا خون دل از دیدہ رواں خواہد بود	مطبخی باز پیاز از جہت قیمہ خرید ۔۔۔ تا دگر آب ز چشم کہ رواں خواہد بود
گوشہ گیری و سلامت ہوسم بود ولے ۔۔۔ فتنہ می کند آں نرگس فتاں کہ مپرس	روزہ داری و قناعت ہوسم ہست ولے ۔۔۔ چشمکے می زنداں برۂ بریاں کہ مپرس
کس بہ امید وفا ترک دل و دیں مکناد ۔۔۔ کہ چنانم من ازیں کردہ پشیماں کہ مپرس	کس بہ بالائے مزعفر مکناد آش ترش ۔۔۔ کہ چنانم من ازیں کردہ پشیماں کہ مپرس

سعدی کا مشہور شعر ہے:۔ تواضع ز گردن فرازاں نکوست ۔۔۔ گدا گر تواضع کند خوئے اوست

ابواسحٰق نے اس میں یہ تصرف کیا:۔ شکم پر ز حلوا و بریاں نکوست ۔۔۔ عدس گر شکم پر کند خوئے اوست

الغرض اس نے اپنی ساری عمر اسی طرح کی شاعری میں بسر کی اور اُسی نے خاقانی کے اس شعر کو جس کا آپ نے ذکر کیا ہے

باذنجان بورانی" کے افسانہ سے اپنا کر لیا اور اس قدر مشہور ہو گیا کہ آج خاقانی کا اصل شعر شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ ابو اسحٰق کا شعر جو تصرف کے بعد اس نے لکھا تھا یہ ہے:۔ پس از سی سال بو اسحٰق شد تحقیق این معنی کہ بورانی ست باذنجان و باذنجان بورانی
لیکن عام طور پر لوگ اس طرح پیش کرتے ہیں جس طرح ابتدا میں لکھا گیا ہے

"نگار"

ترکی کا جدید رسم الخط

ترکی میں پہلے چغتائی رسم الخط کا چلن تھا۔ اسلام کے پہنچنے پر عربی رسم الخط اختیار کیا گیا تھا مگر یکم ستمبر ۱۹۲۸ء سے رومن رسم الخط لازمی قرار دیا گیا ہے جس کی تفصیل و ترتیب ذیل میں درج ہے

حروف تہجی جدید ترکیہ[1]

A a ا	B b بہ	C c جہ	Ç ç چہ	D d دہ	E e ئہ
F f فہ	G g غہ۔ گہ	Ğ ğ غہ	H h ھہ	ı ئی	İ i عی
J j ژ	[2]K k نہ۔ کہ	L l لہ	M m مہ	N n نہ	O o او
Ö ö ئو	P p پہ	R r رہ	S s سہ	Ş ş شہ	T t تہ
U u اُو	Ü ü اُو	V v وہ	Y y یہ	Z z زہ	

عام طور سے مشہور تو یہ ہے کہ ترکی میں رومن رسم الخط جاری ہوا ہے۔ اب عربی رسم الخط وہاں نہیں رہا لیکن مذکورۂ بالا حروف پر محض ادنیٰ تامل کرنے پر حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) تعدادِ حروفِ تہجی میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ ترکی زبان میں پہلے غالباً کل ۳۲ حروف تھے جن میں سے ۲۸ عربی ۴ فارسی اور صرف ایک ترکی زبان کا تھا مگر اب صرف ۲۹ حروف ہیں تمام ہم آواز حروف میں سے صرف ایک رکھا گیا ہے۔ چنانچہ وہاں اب یہ جھگڑا نہیں رہا کہ فلاں لفظ میں ت ہے یا ط۔ علاوہ بریں یہ بھی واضح رہے کہ موجودہ رومن حروف میں خ اور ق داخل نہیں ہیں کیونکہ خ کا تلفظ دراصل ہ کی طرح ہوتا ہے اور ق کے بدلے صرف ک ہی بولا جاتا ہے القصہ جو حرف جس طرح بولا جاتا ہے اسی طرح لکھا جاتا ہے۔

(۲) حروف تہجی کی قدیم ترتیب اب باقی نہیں رہی بلکہ رومن حروف کی ترتیب کو مناسب تبدیلی کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔

(۳) حروف تہجی کے تلفظ میں ضرور فرق آ گیا ہے۔ فتحہ (زبر) چونکہ اخف الحرکات ہے اس لئے فتحہ مخلوط بالہا سے کام لیا گیا۔ بہر کیف الف۔ بے۔ جیم وغیرہ کے ڈھنگ پر تلفظ کرنے کا جو قدیم دستور تھا اس کو خیرباد کہا گیا ہے۔

(۴) زیر۔ زبر۔ پیش۔ جزم۔ تنوین اور تشدید کی علامتیں اب علیحدہ چیزیں نہیں رہیں بلکہ جدید ۲۹ حروف ہی سے ان کا کام بھی چل گیا۔ پس ۳۲ حروف تہجی قدیم اور مذکورۂ بالا علامتوں کی جگہ پر صرف ۲۹ حروفِ جدید ہی کافی و شافی ہوئے ہیں۔

(۵) عربی حروف کے نقاط، اعراب اور مختلف صورتیں خصوصاً اختصار کی حالتوں کی، جو خوشخط ٹائپ کے حق میں سد راہ تھیں اب کالعدم ہو گئیں۔

"زمانہ"

۱؎ ماخوذ از سالنامہ "پارس" ۱۳۰۸ھ پارس مطبوعہ طہران
۲؎ ترکی کی زبان میں ک کی آواز ن کے مانند بھی نکلتی ہے اس وجہ سے جدول میں K کے نیچے نہ بھی ہے۔

فہرستِ مضامین



"ہمایوں" بابت ماہِ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء



تصاویر:- (۱) ڈینیٹے اور بیٹرس (۲) شیخ عبدالقادر جیلانی کا مقبرہ (۳) مسجدِ شاہ جیلاں کا اندرونی منظر

قیمت فی پرچہ ۶/ ویلر بک سٹال پر ۸/ چندہ سالانہ چار روپیہ چھ آنے مع محصول ڈاک

جہاں نما

کامیاب زندگی

برنارڈ شا کی تقریر

برنارڈ شا کی یہ بصیرت افروز تقریر حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم ناظرین ہمایوں کے فائدے کے لئے اس کا ملخص درج کرتے ہیں:۔

"کوئی شخص اپنی ذات کے متعلق دوسروں کو صحیح واقفیت بہم نہیں پہنچاتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کو اپنے متعلق صحیح باتیں بتاؤں گا تو یہ آپ کی غلطی ہے، کیونکہ میں کوشش کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکتا۔

آپ لوگ "مجھے بڑا آدمی" سمجھتے ہیں۔ اس لئے والہانہ شوق کے ساتھ میری باتیں سُنتے ہیں تاکہ آپ خود یا آپ کے بچے "بڑے آدمی" بن سکیں۔ لیکن میں ظاہر میں ویسا ہی ڈاڑھی والا بڈھا ہوں جیسے اور ہوتے ہیں۔ پھر مجھ میں بڑائی کیا ہے؟ سنیئے یہ بڑائی آپ کے مقابلے میں میری کوئی اخلاقی برتری نہیں، بلکہ محض یہ ہے کہ میں ڈرامے لکھ سکتا ہوں اور آپ نہیں لکھ سکتے۔ اگر مجھ میں یہ بات نہ ہوتی تو میں ایک ہرزہ گرد بے سروپا گدا ہوتا۔ لیکن میری موجودہ حالت اتنی اچھی ہے کہ ہر شخص مجھے اُس سے بہت بڑا آدمی سمجھتا ہے جتنا فی الحقیقت میں ہوں۔ اُدھر اخبار لوگوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ اخبار میرے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں، خبردار! اُس سے دھوکا نہ کھائیے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا۔ بڑے آدمیوں کی ہستی کے متعلق لوگوں کا وہم وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت کبھی جن بھوت اور اس قسم کی دوسری فوق العادت مخلوق کی ہستی کے وہم کی تھی۔ بڑے آدمی اپنے ۹۹ فیصدی اوصاف میں بالکل ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے آپ خود ہیں بلکہ یہ کہنا آپ کی توہین کے مترادف ہے کیونکہ نام نہاد "بڑے آدمی" عموماً اپنے ان ننانوے فیصدی انسانی اوصاف میں مقابلۃً بدتر ہوتے ہیں۔ باقی رہا ایک فیصدی امتیازی وصف، سو اُس کا وجود بھی بسا اوقات اُن کے لئے آفت ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کوئی خوبصورت عورت ہیں یا آپ کا گلا اچھا ہے اور آپ خوب گا سکتے ہیں تو آپ میں بعض ایسی خود غرضانہ صفات پیدا ہو جائیں گی جو کسی بدصورت عورت یا بُرا گانے والے میں کبھی قابلِ معافی نہ سمجھی جائیں۔ اسی طرح اگر آپ میں زر اندوزی کی قابلیتیں موجود ہیں تو آپ "دائرۂ قانون" کے اندر رہ کر ہر بڑے سے بڑا ظلم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کے اوصاف کا یہ ایک فیصدی امتیازی عنصر غریبوں کو امیر یا امیروں کو غریب بنانے پر صرف ہونے لگے یا آپ لوگوں کو توہمات سے نکال کر سچے مذہب کا راستہ دکھانے لگیں یا آپ سرمایہ دار طبقے سے غریبوں کے لئے حق طلبی

کرنے لگیں تو پھر آپ بہت ہی خوش قسمت ہوں گے اگر آپ "جامِ شہادت" نوش فرمانے سے بچ جائیں۔

پس اگر آپ اپنے بچوں کی سلامتی چاہتے ہیں تو چوکس رہیئے اور انہیں سیدھے سادے عام راستے سے الگ نہ ہونے دیجئے۔ اگر وہ ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹے تو بس جانیئے کہ اب ان کی خیر نہیں۔ سلامتی کی راہ یہی ہے کہ اپنے نظامِ تمدن و معاشرت کی قدامت کا پورا احترام کیا جائے۔ یہاں بھیڑ چال میں سلامتی ہے ورنہ آپ جانتے ہیں کہ کوئی نئی بات کہنے والوں کا حشر کیا ہوتا ہے۔ علم اور مذہب کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔

احمق لوگ کہتے ہیں بچے ایک بہت بڑی "ذمہ داری" ہیں۔ ذمہ داری کا حال تو وہی جانیں لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ کمانے کے قابل ہونے سے پہلے تک بہت بڑے "خرچ" کا باعث ہوتے ہیں۔ بچے ہمیں کیا فائدہ پہنچاتے ہیں؟ بعض اوقات یہ اپنی بے راہ روی سے الٹے ہمارے لئے ایک عذاب بن جاتے ہیں۔ بچوں کی ضرورت تو حکومت کو ہوتی ہے اسی لئے وہ مردم شماری کراتی رہتی ہو کہ مبادا نسلِ انسانی منقطع ہونے لگے اور وہ حاکم بے محکوم رہ جائے۔ حکومت اپنی ذمہ داری اس لئے صحیح طور پر محسوس نہیں کرتی کہ باپ اور مائیں خود بخود اس کی سرپرستی کے بغیر اس کی مردہ رعایا کے جانشین پیدا کرتی رہتی ہیں۔ آپ کو چاہیئے کہ حکومت کو متنبہ کر دیں کہ اگر وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا بار نہ سنبھالے گی تو ہم بچے پیدا کرنے بند کر دیں گے۔ پھر دیکھئے اسے کس طرح قدر عافیت معلوم ہوتی ہے۔

اور پھر موجودہ طریقۂ تعلیم و تربیت ہے بھی بالکل ناقص۔ کسی قسم کی جبری تعلیم و تربیت بھی اصلی مقصد کو پورا نہیں کر سکتی۔ بچپن میں میرے ماں باپ نے کبھی میرے معاملات میں زیادہ دخل نہ دیا تھا۔ میرے والدین کی ذہنیت عام نامطبوع ذہنیت کے والدین کی طرح نہ تھی جو بچوں کے اخلاق کی اصلاح کی دھن میں اپنے اخلاق کی خبر لینے کی کبھی فرصت ہی نہیں پاتے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری ماں نے مجھے کوئی اخلاقی یا مذہبی ہدایت دی ہو۔ اپنے والد کی صرف مجھے ایک بات یاد ہے کہ جب انہوں نے اپنے تتبع میں کھیلنے کا ایک پائپ مجھے اپنے منہ میں لئے ہوئے دیکھا تو انہوں نے کہا "تم میری تقلید نہ کیا کرو میں ایک ناقص آدمی ہوں۔ تم اچھے بنو" سچ یہ ہے کہ گو انہوں نے اپنے اوصاف کو بہت گھٹا دیا لیکن اس سے مجھے فائدہ پہنچا۔ چنانچہ میں نے تمام عمر نہ کبھی سگرٹ پیا ہے نہ شراب پی ہے اور نہ ڈاڑھی منڈائی ہے۔ عموماً والدین کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ بچوں کے سامنے اپنے اوصاف بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ پھر جب بچے بڑے ہو کر ان کی اصل حقیقت سے واقف ہوتے ہیں تو انہیں اُن سے نفرت ہو جاتی ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے بچوں کے سامنے اپنے حسبِ فطرت بالکل غیر منافقانہ زندگی بسر کیجئے تاکہ انہیں برنارڈ شا بننے کا کافی موقع میسر آئے۔

بچوں کے سامنے ہم اپنے یا دوسروں کے عمل کا نمونہ کسی طرح پیش نہیں کر سکتے۔ جس سوسائٹی میں وہ پیدا ہوتے ہیں اس میں ہر شخص خود غرض ہے۔ مزدوروں کی کوشش ہے کہ حتی الامکان کام کم کریں اور اجرت زیادہ سے زیادہ لیں۔ اس کے برعکس کارخانہ دار زیادہ سے زیادہ کام اور کم سے کم اجرت دینا چاہتے ہیں اور سرمایہ دار طبقہ ان دونوں کی محنتوں کے بل پر بغیر کسی

کام کے نہایت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کا خوگر ہے۔ اشتہاری تجارت اور ریاست وغیرہ کا حال بھی یہی ہے کہ اُن میں بے شرمانہ دروغ گوئیوں اور خیرہ چشمانہ عیاریوں کے بغیر کام نہیں چلتا۔ گویا اپنے بیٹے کو آپ جس کام میں لگنے کے لئے کہیں گے ساتھ ہی ان تمام خودغرضیوں اور فریبکاریوں پر بھی آمادہ کریں گے۔ ہمیں اپنے بچوں کو ایماندار بنانے سے پہلے دنیا کو ایماندار بنانا چاہیئے بہتر یہ ہے کہ ہم بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور یہ اعتماد رکھیں کہ دنیا کے حالات دیکھ کر وہ اپنے متعلق ہم سے مقابلۃً کسی قدر بہتر اور صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔

موجودہ تعلیم ناکارہ ہے۔ بچوں کو چند باتیں طوطوں کی طرح رٹ کر ڈگریاں لے لینے سے کچھ فائدہ نہیں۔ نصاب کی پابندی فضول ہے۔ جس بات سے بچوں کو دلچسپی نہ ہو اُس کا سیکھنا ضروری نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے جسموں کی صحت کے لئے پہلے ذہنی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمارے کھیلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ہم ہمیشہ دوسرے کو زک دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اس سے ہماری ذہنیت پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کا ہر تعلیم یافتہ شخص دوسروں کے لئے ایک چلتا پھرتا فتنہ، ایک آشوب خراماں ہے۔ جس سے ہر وقت دوسروں کو شکست اور ناکامی کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ ایک دوسرے سے بڑھنے کی خواہش سے بہتر یہ ہے کہ ہم تمام سوسائٹی کو بلند کرنے کی کوشش کریں، لیکن موجودہ کالجوں کے تعلیم یافتہ گروہ سے اس بلند مطمحِ نظر کو کامیاب بنانے کی توقع نہیں ہوسکتی۔

کسی بلند مقصد کے حاصل کرنے کا راز یہی ہے کہ اُس کے حصول کا صحیح جذبہ پیدا کیا جائے اور یہ جذبہ جنون کی حد تک ترقی کر جائے۔ اسی طرح دولت بھی حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن دولت کا جنون ایک عذاب ہے۔ غریب لوگ بھی خودکشی کرتے ہیں لیکن جنوبی افریقہ کے اُس بدقسمت کروڑپتی کی "مصیبت" کا اندازہ کیجیئے جس نے صرف اس لئے خودکشی کرلی کہ اُس کے لاکھوں پاؤنڈ میں سے چند لاکھ پاؤنڈ کم ہو گئے۔ میں کہتا ہوں غریب آدمی اُس کے مقابلہ میں زیادہ خوش قسمت ہیں۔ میں نے خود کبھی دولت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر میں اِس طرف توجہ کروں تو اپنے کاروبار کو بہت وسعت دے سکتا ہوں، لیکن میرے اطمینان کے لئے بہت ہی مختصر ساز و سامان کافی ہے۔ البتہ مساوات کے لئے میں ضرور چاہتا ہوں کہ سوسائٹی میں ہر شخص کے پاس اتنا ہی سامان ضرور ہو۔ بس اس سے زیادہ کسی قسم کی ہوس نہ ہونی چاہیئے اور نہ ہوس کی زندگی انسان کے لئے اچھے نتائج پیدا کرسکتی ہے۔

ڈینٹے اور بیٹرس

اٹلی کا شہرۂ آفاق شاعر اور عالم ڈینٹے ۱۲۶۵ء میں پیدا ہؤا۔ ۹ ہی سال کی عمر میں وہ اپنے مولد و منشا فلارنس کے ایک معزز گھرانے کی ایک کمسن لڑکی بیٹرس کی گہری اور غیر فانی محبت میں مبتلا ہو گیا اور بالآخر "ڈیوائن کامیڈی" لکھ کر اُس نے بیٹرس کے نام کو زندۂ جاوید کر دیا۔

جب ڈینٹے نو برس کا تھا اور بیٹرس آٹھ برس کی تھی بیٹرس کے باپ کے قصر میں موسمِ بہار کا ایک جشن برپا ہؤا جس میں ڈینٹے نے بھی شرکت کی۔ بیٹرس سے دوچار ہوتے ہی ڈینٹے کے نوخیز دل پر ایسا گہرا اثر ہؤا جسے وہ مرتے دم تک پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتا رہا۔ اُسی وقت اُس کا چہرہ زرد ہو گیا اور اِس خوبصورت لڑکی کے جذبۂ پرستش سے وارفتہ و بےخود ہو کر وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلوں میں حصہ لینے کے بجائے ایک طرف الگ کھڑا ہو گیا اس کے بعد اُسے کبھی بیٹرس کے تصور سے فراغت نہ ہوئی۔ مگر پھر نو سال تک اُس کو بیٹرس سے ملنے کا موقع نہ مل سکا، اور آخر جب اُس کی بیٹرس سے مُلاقات ہوئی تو وہ ایک نوجوان عورت بن چکی تھی! اب اس کے حسن نے ڈینٹے کو کامل طور پر مسحور کر لیا۔ بیٹرس کا نوازش آمیز سلام ہی ڈینٹے کو ایک معجزے سے کم معلوم نہ ہؤا۔ وہ ہیجانِ جذبات سے کانپتا ہؤا گھر واپس آیا جہاں اُس نے اپنا وہ پہلا سایَنٹ لکھا جس میں اُس نے بیٹرس کی جاودانی محبت کا نغمہ گایا۔

اُس زمانے میں یہ دستور تھا کہ نوجوان شاعر اپنی وہ نظمیں جو وہ اپنی محبوب عورتوں کے متعلق لکھتے ایک دوسرے کی طرف بھیجا کرتے تھے۔ ڈینٹے نے اپنا یہ سایَنٹ اُس زمانے کے ایک مشہور شاعر کی طرف بھیجا جس نے اُس کی بے انتہا تعریف کی اور ڈینٹے کی دوستی کا دم بھرنے لگا۔ ڈینٹے کی شاعری کا موضوع صرف محبت تھی اور بیٹرس کے سوا اس کی نظموں میں کبھی کسی دوسری عورت کی محبت کا ذکر نہ آیا۔ ڈینٹے کے دل میں بیٹرس کے احترام کی یہ حالت تھی کہ وہ اس کے روبرو آنے سے ڈرتا اور جھجکتا تھا چنانچہ اس نے یہ عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا کہ وہ دوسری عورتوں کے پاس جا کر اُن کے سامنے بیٹرس کی خوبیاں بیان کر کے اپنی رُوح کو تسکین دیا کرتا۔ لیکن اس طریقہ سے آخر ایک المناک نتیجہ ظہور میں آیا۔ بیٹرس دوسری عورتوں سے اس کی ملاقاتوں کا ذکر سُن کر غلط فہمی میں مُبتلا ہو گئی اور جب اس کے بعد وہ ڈینٹے سے ملی تو اُس نے اس کی بے۔۔۔ اور ہرجائی پن کا مضحکہ اُڑایا۔ ڈینٹے کو اِس بات سے اتنا صدمہ ہؤا کہ وہ بیمار ہو گیا اور دوسرے لوگ اُٹھا کر اُسے گھر پہنچا گئے۔ بیٹرس نے اس کے بعد جا۔۔۔ سے شادی کر لی اور ڈینٹے نے تقدیر کے فیصلے پر صبر اختیار کر کے اپنا غم غلط کرنے کیلئے میدانِ جنگ کا رُخ کیا مگر اب اس کے دل۔۔۔ لگے کہ بیٹرس مر جائیگی عجیب بات ہے کہ ڈینٹے جنگ کے بعد فلارنس پہنچا ہی تھا کہ واقعی یہ المناک واقعہ پیش آ گیا اور ۱۲۹۰ء۔۔۔ ۲۴ سال کی تھی۔ —— بیٹرس کے کھو جانے کے غم کو بُھلانے کے لئے ۲ سال بعد ڈینٹے کے دوستوں نے۔۔۔ ہوئے لیکن بیوی کی بدمزاجی کی وجہ سے ان دونوں کے تعلقات کبھی زیادہ اچھے نہ ہوئے ڈینٹے کے ۵ بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔۔۔ اُس کے دو بیٹوں نے جنہیں اُس کی قابلیت کا ایک حصہ ورثہ میں ملا تھا اپنی یہ قابلیت اپنے باپ کی مشہور نظم دیوا۔۔۔ باوجود بیٹرس کی پُراسرار محبت عمر بھر ڈینٹے کی زندگی کا چراغِ رہنما بنی رہی۔ وہ اس دنیاوی زندگی کو محض ایک جانزا سمجھتا۔۔۔ اتر نیکی کا راستہ دکھا کر سرمنزلِ کمال کی طرف لے جا رہا تھا "ڈیوائن کامیڈی" کی بنیاد یہی خیال ہے۔۔

قصّہ نویسی و قصّہ خوانی

(۲)

علمبرداران حقیقت حامیانِ صنّاعی کو یہ کہہ کر مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ وہ (یعنی صنّاعین) زندگی کو ایک خاموش نگار خانہ اور قصہ کو ساکن و جامد تصویر سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ان کی سخت غلطی ہے۔ ہر فنّی پیداوار بذاتِ خود ایک مکمل شے ہوتی ہے۔ اس لئے وہ زندگی کی نمائندگی نہیں کر سکتی کیونکہ زندگی کی امتیازی خصوصیتیں اختلاف۔ تنوع۔ ہجوم اور ہنگامہ ہیں۔ چونکہ افسانہ زندگی یا جزوِ زندگی کی محاکات ہے اس لئے اس میں وحدت و تسلسل کے بجائے انتشار و گوناگونی پائی جانی چاہیئے۔ صناعین اصولِ انتخاب پر عمل کرتے ہیں حالانکہ صحیح طریقہ اصولِ اشتمال کی پابندی ہے۔ صرف امتیازی و نمایاں واقعات انتخاب کر لینے سے قصّہ کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ افسانہ نگار کا فرض ہے کہ وہ قصہ میں تمام ضروری و غیر ضروری یا اہم و غیر اہم واقعات کو شامل کرے۔ "حقیقیئین" کو اس پر بڑا ناز ہے کہ وہ معاملاتِ حیات کو ان کی تمام باریکیوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ اصلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا کارنامہ فطرت و صداقت پر مبنی ہوتا ہے لیکن صناعین جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ محض فرضی و مصنوعی ہوتا ہے۔ اگر غیر اہم تفصیلات اور غیر ضروری جزئیات کی بھرمار قصّہ کو بیزار کن بنا دے اور جمالیاتِ صناعی کا خون ہو جائے تو بھی انہیں کوئی پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ بزعمِ خود حقیقت و صداقت کے علمبردار ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو "حقیقیئین" کو بھی اصولِ انتخاب اور تصنع سے مفر نہیں ۔۔نکہ وہ زندگی کے کسی جزو کی کامل محاکات کے مدعی ہیں۔ کیا زندگی کے کسی ایک جزو کو دوسرے اجزا سے ممیّز و مخصوص ۔۔ انہیں اصولِ انتخاب پر عمل پیرا ہونا نہیں پڑتا؟ کیا بغیر کوئی واضح و قطعی ابتدا اور انتہا مقرر کئے ہوئے کسی ۔۔ ممکن ہے؟ کیا "حقیقیئین" بھی اپنا قصہ کسی خاص جگہ سے شروع اور کسی خاص مقام پر ختم نہیں کرتے ۔۔بلہ ہے جس کے حصّوں کا نہ کہیں آغاز ہے نہ انجام اور نہ ایک حصّے کو دوسرے حصے ۔۔رہتے ہیں کیا "حقیقیئین" کے اصولِ عمل اور کارنامے ویسے ہی ہیں مانے اور ۔۔ کے؟ بات تو یہ ہے کہ کھلی فضا میں آزادانہ کام کرنے والے "حقیقیئین" اور ۔۔ کے پابند "صناعین" دونوں کے طریقۂ کار میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔

آج کل افسانہ نویسی کا شمار بھی فنونِ لطیفہ میں ہونے لگا ہے۔ افسانہ نگار کو نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ ان تمام فنی امور کی تکمیل کرنی پڑتی ہے جن کی سرانجام دہی شاعر، مصور، سنگ تراش اور دوسرے صناعوں کا فریضہ ہے۔ عمیق مشاہدہ۔ تلاشِ مواد۔ انتخابِ واقعات۔ ترتیب و ترکیب۔ تناسب و توازن۔ بلندیٔ مقصد۔ جوشِ بیان اور حسنِ اسلوب وغیرہ کی اوگھٹ گھاٹیوں کو طے کئے بغیر کسی بلند پایہ افسانے یا قصے کی تکوین ناممکن ہے جن لوگوں کا خیال ہے کہ افسانہ کی کوئی خاص صورت و شکل نہیں ہوتی اور نہ افسانہ نویسی کے لئے اصول و قوانین مقرر ہیں وہ اس کی نوعیت و ماہیت سے بالکل بیگانہ ہیں۔ واقعات کے انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب و ترکیب سے پلاٹ وجود پذیر ہوتا ہے۔ پلاٹ میں حرکت و روانی اور جوش و ارتعاش ضرور پایا جانا چاہئے خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی۔ نمایاں ہو یا مخفی ورنہ قصہ کی حیثیت محض ایک جسدِ بے روح یا پیکرِ بے جان کی سی ہوگی۔ یہ حرکت بالعموم دو مختلف و متضاد عناصر مثلاً نیکی و بدی۔ ہمدردی و بے مروتی۔ ظلم و رحم۔ سنجیدگی و ظرافت وغیرہ کی کشمکش دکھا کر پیدا کی جاتی ہے۔ علاوہ بریں منظر۔ مقام۔ ماحول اور کام کی تبدیلیاں بھی اہتزاز و ارتعاش کی محرک ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمارے مشاہدہ کے وقت ہی حرکت واقع ہو۔ ممکن ہے کہ حرکت پہلے پیش آچکی ہو اور ہم اس کے خاموش و ساکن نتیجہ کا تماشا دیکھ رہے ہوں۔ فرض کرو کہ ہم ایک زبردست فوج کو کسی مقام پر پڑاؤ ڈالے دیکھ رہے ہیں۔ سپاہیوں کی موجودہ ساکن و خاموش وضع بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے لیکن اس کی لطف انگیزی و اثر آفرینی میں بے حد اضافہ ہو جائے گا۔ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے وہ متحرک نظارہ بھی پیش ہو جائے جبکہ فوج کا شاندار جلوس دشت و جبل سے گذرتا اور سڑکوں پر کوچ کرتا ہوا آ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص لمحہ میں ہم جس شے کا مشاہدہ کر رہے ہوں وہ خاموش نتیجہ نہیں بلکہ سبب ہو اور اس کے دامن میں لاتناہی واقعات کا ایک محشر پوشیدہ ہو۔ مثلاً جہانگیر کے دربار میں سر طامس رو کی باریابی کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اُس وقت کون جانتا تھا کہ فرنگی سفیر کی یہی رسائی آئندہ ہزاروں انقلاب انگیز واقعات کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ بہرکیف قصہ کے پلاٹ میں ظاہری یا مخفی حرکت ضرور پائی جانی چاہئے۔

پلاٹ کی طرح کردار نگاری بھی ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے کیونکہ اشخاصِ قصہ کے بغیر پلاٹ ایک بے معنی سی چیز ہے۔ ماہرینِ فن کے نزدیک پلاٹ نام ہی ہے اُن واقعات کا جو اشخاص قصہ کو پیش آئیں فنی نقطۂ نظر سے پلاٹ کے مقابلہ میں کردار نگاری کہیں زیادہ اہم اور مشکل کام ہے۔ صرف نقادوں کے خیال میں نہیں بلکہ ایک عامی شخص کے نزدیک بھی قصہ نویس کی کامیابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کے تخلیقی کردار زندہ انسان کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر چلتے پھرتے اور کام کرتے دکھائی دیں۔ کردار یا رجالِ داستان خواہ تاریخی ہوں یا تمثیلی۔ حقیقی ہوں یا فرضی۔ خواہ وہ معمولی انسان کی طرح روزمرہ کام کرتے ہوں یا فوق البشری

مہمات سرانجام دیتے ہوں لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ہمارے سامنے سے پرچھائیوں کی طرح نہ گذریں بلکہ گوشت پوست کے بنے ہوئے زندہ انسان معلوم ہوں اور ان کی شخصیتیں انفرادی ہوں تاکہ کتاب پڑھ لینے کے بہت عرصہ بعد جب ہم اس کی تمام تفصیلات بھول جائیں اُس وقت بھی زندہ دوستوں یا دشمنوں کی طرح اُن کی یاد ہمارے ذہن میں باقی رہے۔ بعض جادو نگار و باکمال مصنفوں کے تخیلی اشخاصِ قصہ نے تاریخی اکابرِ رجال سے کہیں زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ ہم ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ان سے مشورہ لیتے ہیں اور انہیں اپنا یارِ غار سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بُرے رجالِ داستان سے ہمیں دشمنوں کی سی نفرت و بیزاری بھی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اس قسم کے کردار پیدا کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں بلکہ اس کے لئے خداداد ذہانت و قابلیت درکار ہے۔

جس شخص کو ہم روز دیکھتے ہیں۔ اس سے ملتے جُلتے اور گفتگو کرتے ہیں اس کی سیرت کا بھی مطالعہ سخت دشوار ہے۔ تجربی نفسیات کے ماہرین ذہن کی جانچ کے لئے پیمانے دریافت کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن انسانی سیرت کی جانچ یا پیمائش کا کوئی سہل طریقہ آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ ہم ایک دوسرے کے بطن و ماہیت سے بہت کم آگاہ ہیں اور خود اپنے نفس کو پہچاننا تو محال ہی ہے۔ بڑے بڑے فیلسوف اور عارف معرفتِ نفس حاصل کرنے میں سرگرداں رہے لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ فی الحقیقت انسان کا وجود ایک معمّا ہے جو کسی سے نہ حل ہوا ہے نہ ہو گا۔ پس "حقیقیئین" کا دعویٰ کہ وہ انسانی فطرت و سیرت کے رمز آشنا و کشاف ہیں لایعنی سی بات ہے۔ "حقیقیئین" ہوں یا "صناعئین" دونوں صرف انسانی سیرت کی چند ظاہری نمایاں خصوصیتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے بھی خداداد ملکہ کی ضرورت ہے۔ انگلستان کے زبردست افسانہ نویس ٹھیکرے کا قول ہے کہ کردار نگاری کے لئے جس تخلیقی قوت کی ضرورت ہے وہ ایک پُراسرار چیز ہے جسے دوسرے لوگ تو درکنار خود مصنف بھی سمجھ نہیں سکتا۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غیبی ہاتھ قلم پر قابض ہو گیا ہے اور جس طرف چاہتا ہے اسے حرکت دیتا ہے"۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعری کی طرح افسانہ نویسی بھی اکتسابی نہیں بلکہ وہبی چیز ہے اور اس کے لئے خداداد قابلیت کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ہڈسن اس خداداد قابلیت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کردار نگاری کے لئے افسانہ نویس میں باریک تصور، حقیقت شناس تخیل اور عبارت آرائی کا زبردست ملکہ پایا جانا چاہیئے۔ جس مصنف کو ان سہ گانہ قوتوں کا وافر بہرہ قدرت کی جانب سے نہ ملا ہو وہ کبھی کامیاب کردار نگار نہیں بن سکتا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا میں کوئی دو انسان صورت و سیرت کے لحاظ سے بالکل یکساں نہیں بلکہ اُن میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اشخاصِ قصہ میں بھی انفرادی خصوصیتیں پائی جانی چاہئیں تاکہ

وہ ایک دوسرے سے ممیز ہوسکیں۔ ایک باکمال صنّاع (آرٹسٹ) اپنی ذہنی مخلوقات کی صورت و سیرت۔ عادت و خصلت۔ مذاق دلپسند۔ طبعی رجحان۔ طرزِ گفتگو اور چال ڈھال میں بعض امتیازی خصوصیتیں پیدا کر دیتا ہے جن کی بنا پر ہم انہیں زندہ انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے شناخت کر لیتے ہیں۔ اکثر حالتوں میں ہم اُن کی سیرت سے اس قدر مانوس ہو جاتے ہیں کہ بعض مذبذب موقعوں پر ہم پہلے ہی سے ان کے قول و فعل کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کردار نگاری کے دو طریقے ہیں راست اور بالواسطہ۔ پہلے طریقہ کے مطابق مصنف خود ہی اشخاصِ قصّہ کے خیالات و جذبات۔ عادات و خصائل اور عزائم و مقاصد کی تحلیل و تشریح کرتا جاتا ہے لیکن دوسرے طریقہ کے تحت وہ اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں دیتا بلکہ رجالِ داستان کے افعال و اعمال۔ حرکات و سکنات اور بات چیت سے ان کی سیرت ظاہر ہوتی جاتی ہے۔ دورانِ مکالمہ میں وہ خود ہی ایک دوسرے کے قول و فعل پر بھی تنقید کرتے جاتے ہیں۔ یہی طریقہ زیادہ مستحسن ہے۔ ڈراما نویس ہمیشہ اسی طریقہ پر عمل کرتا ہے لیکن افسانہ نگار کو حسبِ موقع دونوں طریقے اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہے۔

ایک قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ انسان کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اس کی صورت اور سیرت میں تغیر ہوتا جاتا ہے۔ بمرورِ زمانہ ہر شخص کی عادت و خصلت رفتہ رفتہ بدلتی جاتی ہے۔ لہذا اشخاصِ قصہ کے اصل کے مطابق معلوم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کردار نگاری میں حرکت و ارتقا کے شواہد پائے جائیں۔ جو کردار حرکت و ارتقا سے عاری ہو اُس کی حیثیت گڑیا یا پتلے سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ سرشار نے "فسانۂ آزاد" کے لئے تقریباً ڈھائی ہزار صفحے سیاہ کر دئے ہیں لیکن اس ضخیم افسانہ میں نہ پلاٹ کی کوئی خوبی نظر آتی ہے نہ کردار نگاری کی۔ اس افسانہ کا ہیرو آزاد ابتدا سے انتہا تک ایک ہی قسم کا لاابالی و بے پروا عیاش امیر ہے۔ اس کی سیرت میں ذرا بھی تبدیلی یا ارتقا کا ثبوت نہیں ملتا۔ ہیرو کیا ہے لکڑی کی کھونٹی یا الگنی ہے جس پر بے پروا مصنف مختلف بے ربط اور نامکمل واقعات لٹکاتا چلا گیا ہے۔

واقعات کی اس بے ترتیبی و بے ربطی کے مدِنظر "فسانۂ آزاد" کے متعلق سرشار کا ایک معاصر نقاد کہتا ہے کہ "افسانہ کا ہے کو ہے دیوانی ہانڈی یا صدقہ کا ست نجا ہے"۔ اسی طرح شرر کے افسانہ "ایامِ عرب" میں بھی عمرو اور زبیر کا کرداری ارتقا مفقود ہے۔ ہم انہیں شروع شروع بازارِ عکاظ میں جیسا دیکھتے ہیں ویسا ہی اختتامِ کتاب پر بھی پاتے ہیں۔ بعض جوشیلے نوآموز ناول نویس کردار میں حرکت و تبدیلی دکھاتے ہیں لیکن وہ مقتضائے وقت اور موقع و محل کے مطابق نہیں ہوتی۔ ان کی ساری توجہ ہیجان خیز واقعات کی جانب مبذول رہتی ہے۔ ان واقعات کے بیان کرنے میں جہاں جس شخص کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں وہ اُسے زبردستی کھینچ لاتے ہیں۔ اُن کے اشخاصِ قصہ کے تمام حرکات و سکنات مصنوعی و غیر متوقع معلوم ہوتے ہیں۔ وہ گویا کٹھ پتلیاں ہیں جو تار کے اشارے پر ناچتی

اور حرکت کرتی ہیں۔

جب کوئی بلند پایہ و باکمال افسانہ نویس اپنی ذہنی مخلوق کو منظرِ عام پر لاتا ہے تو اس سے چند اچھی یا بُری خصوصیتیں منسوب کر دیتا ہے جو اسے دوسرے اشخاص سے متمائز کرتی ہیں۔ یہی نمایاں خصوصیتیں اس کی شناخت کی علامتیں ہوتی ہیں۔ قصہ نویس کو پُوری آزادی حاصل ہے کہ ہم سے تعارف کرانے کے وقت وہ اپنے ہیرو کو جن اوصاف سے چاہے متصف کرے لیکن ایک بار اس کی سیرت سے ہمیں مانوس کرا دینے کے بعد ناول نگار کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ اب ہیرو سے جو کچھ افعال و حرکات سرزد ہوں گے وہ لامحالہ اس کی سیرت کے اقتضا کے مطابق ہوں گے۔ اگر اُس کا کوئی قول و فعل غیر متوقع یا خلافِ عادت ہوگا تو سامعین کو اعتراض و احتجاج کرنے کا پورا حق حاصل ہوگا۔ سیرت میں ارتقا و تغیر ضرور ہوتا ہے لیکن وہ ایسا بتدریج اور خاموشی کے ساتھ رونما ہوتا ہے کہ ہر شخص سے محسوس نہیں کر سکتا۔ کرداری ارتقا کی مثال گھڑی کی گھنٹے والی سوئی کی حرکت یا پودے کی بالیدگی سے دی جا سکتی ہے۔ یوں دیکھنے میں گھڑی کی چھوٹی سوئی اور پوٹے کی بیل دونوں ساکن معلوم ہوتی ہیں لیکن کون نہیں جانتا کہ سوئی ضرور چل رہی ہے اور بیل ضرور بڑھ رہی ہے۔ اسی طرح کرداری حرکت و ارتقا کا کوئی شخص منکر نہیں ہو سکتا خواہ وہ محسوس ہو یا نہ ہو۔ ناول نگار کا صرف یہی کام نہیں ہے کہ وہ کردار کی تدریجی ارتقا و تبدیلی کا اظہار کر دے بلکہ اسے یہ بھی لازم ہے کہ اس تبدیلیٔ سیرت کے اسباب و عوامل کی بھی اچھی طرح تشریح کرے وہ ابتدائً ہیرو کو چند نمایاں اور امتیازی خصوصیات کے ساتھ پیش کرتا ہے لیکن بمرورِ زمانہ دوستوں کی صحبت اجنبیوں سے تبادلۂ خیالات۔ گرد و پیش کے حالات۔ ذاتی مشاہدات و تجربات مطالعۂ کتب اور دوسرے متعدد موثرات کی وجہ سے اس کے عادات و خصائل اور خیالات و جذبات میں رفتہ رفتہ جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں ان سب کا تفصّا افسانہ نویس کے وظیفہ میں داخل ہے۔ یہ باتیں صرف ہیرو سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ تمام رجالِ داستاں کی سیرت نگاری اسی اصول کے تحت ہونی چاہیئے۔ جس شخصِ قصہ کا کرداری ارتقا رک جائے اسے ناول سے خارج کر دینا مناسب ہے۔

قصہ میں پلاٹ اور کردار کے علاوہ ماحول کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی جانتا ہے کہ کسی شے کی تصویر میں اس وقت تک اصلیت و صداقت کی جھلک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اُس میں عقبی زمین (بیک گراؤنڈ) اور گرد و پیش کی چیزیں بھی نمایاں نہ کی جائیں۔ فرض کرو کہ مصوّر ایک ہندوستانی حلوائی کی دکان کی تصویر پیش کرنا چاہتا ہے۔ جس شخص کو فنِ مصوری میں پوری مہارت حاصل نہ ہو اس کی پیش کردہ تصویر میں صرف مٹھائیوں سے بھری ہوئی چند تھالیوں کے پیچھے ایک موٹا حلوائی بیٹھا ہوا نظر آئے گا۔ لیکن ایک باکمال و چابکدست مصوّر اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ تمام ضمنی اور ضروری باتوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ اس کی تصویر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ایک کھپریل کے چھپر والی دکان میں متعدد تھالیاں اور خوانچوں میں طرح طرح کی مٹھائیاں سجی ہوئی ہیں۔ ہر طرف

بھڑیں اور مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ جن کے بھگانے کے لئے ایک برتن میں اُپلیاں سُلگائی گئی ہیں۔ ایک طرف بہت سے تِل اور دونے رکھے ہوئے ہیں۔ چند گاہک دکان کے سامنے کھڑے ہیں۔ بڑی توند والا حلوائی صرف ایک میلی کچیلی دھوتی باندھے مٹھائیاں تول رہا ہے۔ دکان کے ایک کونے میں کڑاہ چڑھا ہوا ہے۔ حلوائی کی بیوی چولھے میں اُپلیاں ڈال رہی ہے۔ دوسری طرف دو تین آدمی بیٹھے ساگ پوری کھا رہے ہیں۔ دکان کے نیچے ایک دو کتے دُم ہلا ہلا کر کھانے والوں کا منہ تک رہے ہیں۔ حلوائی کا لڑکا گوالن سے دودھ خرید رہا ہے۔ غرض کہ ان تمام چیزوں کی موجودگی کثیف حلوائی کی دکان کی جیتی جاگتی تصویر پیش نظر کر دیتی ہے۔ اسی طرح ماحول کی تشریح اور ضمنی باتوں کی تفصیل سے قصہ چمک اٹھتا ہے اور اس کی رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑنے لگتا ہے۔ بقصوی ماحول کی دو قسمیں ہیں ایک معاشری دوسرا طبعی۔

اشخاص قصہ کا تعلق جس زمانہ یا جس مقام سے ہو اس کی تمام خصوصیات کو نمایاں کرنا افسانہ نگار کا فریضہ ہے۔ آج کل ممالک متمدنہ میں زندگی کے معاملات اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ وہاں سہولت کی غرض سے اصول تخصیص پر عمل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حربی زندگی۔ بحری زندگی۔ تجارتی زندگی۔ ملازمتی زندگی۔ شہری زندگی دیہاتی زندگی۔ اعلیٰ طبقہ کی زندگی۔ ادنیٰ طبقہ کی زندگی وغیرہ کے متعلق علحدہ علحدہ افسانے لکھے جاتے ہیں۔ اشخاص قصہ جس سوسائٹی یا سماج سے تعلق رکھتے ہیں اس کے رسم و رواج۔ طرز بود و ماند۔ خیالات و اوہام اور معاشری کیفیتوں کا ہو بہو نقشہ کھینچنے سے قصہ کی دلچسپی المضاعف ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے "فسانۂ آزاد" میں نہ پلاٹ کی کوئی خوبی پائی جاتی ہے اور نہ کردار نویسی کی۔ بلکہ قصہ کی ساری دلچسپی کا باعث صرف یہ ہے کہ اس میں سرشار نے اپنے زمانے کی لکھنوی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے اور اس میں مبالغہ کا شوخ رنگ بھر کر اسے اصل سے بھی زیادہ پُر لطف بنا دیا ہے۔ اگر افسانہ نویس کی قوت مشاہدہ۔ قوت تخیل اور قوت بیانیہ نہایت زبردست ہو تو وہ غائب کو حاضر۔ بعید کو قریب اور ماضی کو حال میں منتقل کر سکتا ہے۔ چنانچہ شرر نے اپنے وسیع مطالعہ۔ زبردست تخیل اور قابل تحسین عبارت آرائی کی مدد سے "ایام عرب" میں قدیم عربوں کے خیالات و مزعومات۔ اوہام و عقاید اور رسم و رواج کی ایسی واضح و روشن تصویر پیش کی ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال پیشتر کا عربی تمدن پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔

طبعی ماحول میں مقامی اور فضائی دونوں کیفیتیں شامل ہیں۔ جس ملک یا جس شہر میں کوئی مشہور واقعہ پیش آتا ہے یا جہاں ابطال قصہ کا گذر ہوتا ہے وہاں کے دریا۔ پہاڑ۔ میدان۔ وادی۔ کھیت۔ سڑک۔ گلی کوچوں یا مکان کی زینت و آرائش کی تفصیل بیان کرنے میں اسکاٹ اور ڈکنسن کی طرح شرر کو بھی ید طولیٰ حاصل ہے۔ موسمی اور فضائی کیفیتوں کا بیان بالعموم دو طرح سے کیا جاتا ہے۔ بعض وقت قدرت کی تمام چیزیں ہیرو کی ہمدرد و غمگسار دکھائی

جاتی ہیں مثلاً قتل یا اور کوئی المیہ واقعہ پیش آنے پر طوفان کا آنا۔ شفقِ خونیں کا نمودار ہونا۔ ابرباراں کا گریہ وزاری کرنا وغیرہ۔ کبھی نیچر کو انسان کے رنج و خوشی سے بالکل بے حس و بے تعلق ظاہر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مصوّرِ غم فرماتے ہیں کہ "سورج نکلا اور ڈوبا۔ تارے چمکے اور ماند پڑے۔ پھول کھلے اور کملائے۔ غرض کہ کارخانۂ عالم حسبِ معمول چلتا رہا۔ دنیا کی ہر شے اپنا رنگ بدلتی رہی لیکن کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تو نجم النسا کی مصیبت میں۔"

کسی اختراعِ فنی کی قدر دانی کے لئے نقاد میں بھی ویسی ہی ژرف نگاہی پائی جانی چاہیئے جیسی اس کی تخلیق کے لئے خود صناع کے لئے ضروری ہے۔ بعض سخن فہموں کی تیز نظری کسی شعر میں ایسے ایسے نازک و باریک پہلو ڈھونڈ نکالتی ہے جو خود صاحبِ سخن کے دماغ میں بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اسی طرح فن نقاشی و مصوری کے نکتہ شناس بعض وقت تصویر کی "عقبی زمین" یا چھوٹے چھوٹے بیل بوٹوں میں ایسی اہم باتیں دریافت کر لیتے ہیں جو مصور کے مقصود بالذات سے بھی زیادہ اثر آفریں اور قیمتی ہوتی ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار کسی چابکدست مصور نے جامع مسجد دہلی کی شاندار تصویر مولانا محمد علی کی خدمت میں پیش کی تھی۔ لائق مصور اپنے فن کے نکتوں سے واقف تھا اس لئے تصویر میں اصلیت کی جھلک پیدا کرنے کے لئے اس نے نہ صرف "عقبی زمین" کو درختوں اور نیلگوں آسمان سے زینت دی تھی بلکہ "پیشِ منظر" میں بھی یہ دکھایا تھا کہ مسجد کی سیڑھیوں پر چند بے فکر لوگ بیٹھے ہیں اور ایک اندھی بڑھیا چیتھڑے لگائے اپنی بچی کی انگلی پکڑے بھیک مانگ رہی ہے۔ تصویر کا عنوان "جامع مسجد دہلی" تھا۔ مولانا نے تصویر دیکھ کر فرمایا کہ اگر اس کا عنوان بدل کر یہ لکھ دو کہ "اس کے باپ دادا نے یہ مسجد تعمیر کی تھی" تو جو قیمت مانگو خوشی ادا کر دوں گا۔ محض عنوان کی تبدیلی نے تصویر کو کتنا عبرت انگیز و پُرتاثیر بنا دیا۔ تصویر کی علتِ غائی کچھ اور تھی لیکن مولانا محمد علی کی باریک بینی نے اس کی محض ضمنیات میں سلطنتِ مغلیہ کا پُر درد مرثیہ مضمر پایا۔ افسانہ خوانی کے لئے بھی ذہنِ رسا اور مذاقِ سلیم کی ضرورت ہے۔ مولانا محمد علی کا سا دل و دماغ رکھنے والا قاری افسانہ کے ضمنی و ماحولی عناصر میں ایسے نادر اور اچھوتے پہلو دریافت کر سکتا ہے۔ جن کے افادہ و دلچسپی کے آگے قصہ کے مرکزی واقعات بے حقیقت معلوم ہوں گے۔ چنانچہ ایک نکتہ شناس و سنجیدہ مذاق قاری کے نزدیک شرر کے افسانہ "ایامِ عرب" میں قدیم عربی تمدن کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ وہ عمرو و زبیر یا عبیدہ و حلیمہ کے مرکزی قصہ سے کہیں زیادہ اہم اور قیمتی ہیں۔ اسی طرح سید سجاد حیدر یلدرم کے افسانہ "قیس و لیلیٰ" میں ہیرو اور ہیروئن کے کارنامے اربابِ نظر کے دل و دماغ پر ویسے گہرے نقوشِ تاثر ثابت نہیں کرتے جیسے قدیم و جدید طرزِ زندگانی کا وہ دلچسپ و پُر از معلومات موازنہ جو محض ضمنی طور پر اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

(باقی)

محمد حسین ادیب

موت

(سانیٹ)

مرے محبوب، جانے دے، مجھے اُس پار جانے دے
اکیلا جاؤں گا، اور تیر کی مانند جاؤں گا،
کبھی اِس ساحلِ ویران پر میں پھر نہ آؤں گا،
گوارا کر خُدارا اِس قدر ایثار، جانے دے
نہ کر اب ساتھ جانے کے لئے اِصرار جانے دے
میں تنہا جاؤں گا، تنہا ہی تکلیفیں اُٹھاؤں گا،
مگر اُس پار جاؤں گا، تو آخر چین پاؤں گا،
نہیں مجھ میں زیادہ ہمتِ تکرار جانے دے

مجھے اُس خواب کی بستی سے کیا آواز آتی ہے؟
مجھے اُس پار لینے کے لئے وہ کون آیا ہے؟
خُدا جانے وہ اپنے ساتھ کیا پیغام لایا ہے؟
مجھے جانے دے، اب رہنے سے میری جان جاتی ہے
مرے محبوب میرے دوست، اب جانے بھی دے مجھ کو!
بس اب جانے بھی دے، اس ارضِ بے آباد سے مجھ کو!

ن۔م۔ راشد



میں اور وُہ اور کوئی اور

میں اپنے کمرے میں اکیلا اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ اُس نے پردے کی آڑ سے مجھے جھانکا اور وُہ چُپ چاپ اندر آگئی!

گھونگریالے بال ماتھے پر جھالر کئے ہوئے زلفیں رخساروں کی جدول بنی ہوئیں، گول چہرہ، گلاب کی سی رنگت، بادام سی آنکھیں، بھویں ذرا ملی ہوئیں، پلکیں لانبی لانبی تیز نوک دار برچھیاں تانے، چھوٹی غنچہ سی ناک، دانت کہ اوپر نیچے موتی رکھے ہوئے۔ ٹھوڑی کہ چاند سے مکھڑے کا سہارا، آنکھوں میں شوخی، چہرے میں شرارت، الھڑ، چنچل، پھولوں کی شہزادی، اُس کی چال ایک نئی راگنی، اُس کا سراپا ایک نوخیز سرورواں۔ وہ آئی، سیدھی میری طرف آئی اور بستر پر میرے پہلو میں بے تکلف بیٹھ گئی!

کیا جذبات میرے دل میں اُٹھے! ابھی کل رات میں لسان الغیب کے یہ شعر گنگنا رہا تھا:

زلف آشفتہ و خوے کردہ و خنداں لب مست	پیرہن چاک و غزل خوان و صراحی در دست
نرگسش عربدہ جو و لبش افسوس کناں	نیم شب مست ببالین من آمد بنشست
سر فراگوش من آورد و بآواز حزیں	گفت کاے عاشق شوریدۂ من خوابت ہست

بس بالکل یہی کیف تھی اور یہی سماں۔ سوائے اِس کے کہ اُس کے ہاتھ میں صُراحی نہ تھی بلکہ کوئی اور گول گول شئے اور آدھی رات کا وقت نہ تھا بلکہ دن دوپہر کا اور اُس کے نازک لبوں پر "عاشق" کا لفظ نہ تھا بلکہ ایک اور اس سے بھی (آج کل) عاجز "لفظ! اس کا پیرہن بھی چاک تھا اور وہ میرے ہی کچھ شعر گنگنا رہی تھی، بار بار سُنا کر گویا مجھے پھسلا رہی تھی:

جھن من جھن من جھن جھنکار

اپنے اپنے من کی سُنائیں	ناچیں کودیں گانے گائیں
جھن من جھن من جھن جھنکار	پیار کریں آ باہم پیار

اور اُس کی آواز "حزیں" نہ تھی بلکہ نشاط انگیز اور کیوں نہ ہوتی آخر چودھویں اور بیسویں صدی کا فرق حائل تھا، کہاں حافظ کے وہ پردہ نشین باحیا معشوق اور کہاں دورِ حاضر کی یہ میری بے پردہ شوخ دیدہ حسینہ!

وہ میری طرف لپکی اور صرف وہی نہیں بلکہ میں بھی! ——— اُس وقت کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

تھوڑی دیر کے لئے میں اپنی قدامت پسند پاکبازی کو بھول گیا ہوں۔ مدتوں سے نفسی ضبط اور زاہدانہ روک تھام نے میرے جذبات کو اپنے پاؤں کے نیچے روند ڈالا تھا، مرد میں نسوانیت کے لئے جو ایک ولولہ ہوتا ہے جس سے اُس کی مردانگی طاقت پکڑتی ہے اُسے برسوں سے ایک متانت بھرے زہد و اتقا نے میرے اندر مروڑ کر مسخ کر دیا تھا یہاں تک کہ اب میں تمام قسم کے جنسی تعلقات کو گناہِ کبیرہ سمجھنے لگ گیا تھا ـــ لیکن اس حُسن کی پُتلی۔ اس پیاری دلکشی نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے میرے دبے ہوئے جذبات کو اُبھار دیا ہے۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لئے اُبھرنا اُبلنا اُچھلنا چاہتا ہوں، اپنی مُردہ دلی کو خیرباد کہہ کر کم از کم چند ثانیوں کے لئے پھر زندہ و تابندہ ہو جانے کا تمنائی ہوں ـــ پتلے پتلے لال لال ہونٹ، کالی کالی گول گول آنکھیں، بھرے ہوئے نازک نازک گال ـــ میں نہ رہ سکا، اپنے اصولوں کو بھول کر، اپنی "پاکیزہ" ضد سے ہٹ کر، اپنی خاموش خشک مزاجی سے یکسر منہ پھیر کر میں نے پہلے اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور پھر پے در پے اُس کے بوسے لئے، اور اسی پر بس نہیں اُس حُسن کی دیوی نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا، میں نے اُس کے رخسار پر بوسے دئے تھے اُس نے میرے لبوں اور میری آنکھوں کو چُوما، میں نے اُسے سینے سے لپٹایا تھا اُس نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بھینچا بلکہ اِس مرحلے سے جلد گذر کر اُس نے میرے رخساروں کو کھینچا اور میرے بالوں کو نوچنا شروع کیا۔ بیسویں صدی کی ترقی یافتہ خاتونوں کی محبت سہہ سکنا ہر بھلے مانس آدمی کا کام نہیں، اِس کے لئے ایک مضبوط دل ایک قوی جگر اور ایک جنگجو رُوح کی ضرورت ہے ـــ پھر آفت پر آفت یہ کہ آخر کار اُس نے میرے کانوں میں میری گردن پر میرے پہلو میں غرض جہاں جہاں اُس سے بن پڑا مجھے گُدگُدانا شروع کیا۔ اور ستم ظریفی یہ کہ ساتھ ہی فی البدیہ فرمائش کی کہ آپ بھی مجھے گدگدائیں۔ ـــ میں بستر پر دم بدم پہلو بدل رہا تھا، لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، مگر وہ ظالم مجھے کب چھوڑتی تھی، نوبت باین جارسید کہ وہ میری چھاتی پر چڑھ بیٹھی اور شاید میرے سر کے روز بروز کم ہوتے ہوئے بالوں کی طرف اشارہ کر کے طنزاً مُسکرائی اور بولی "اباجی! گنجے کے منجے" ـــ کہ اتنے میں پردہ اُٹھا اور یہ چار برس کی بے وفا چھپکلی پلنگ سے پھاند کر "لُوجی لُوجی" (= امّی) کہتی کسی اور کی ٹانگوں سے لپٹ گئی!

ب۔ ل

غزل

ابتدا وہ تھی کہ میں ظالم بنا، جاہل بنا
انتہا یہ ہے کہ رازِ دوست کا حامل بنا

رہ سپارِ حق بنا یا پیروِ باطل بنا
جو بنانا ہو، بنا لیکن کسی قابل بنا

شوق کے لائق بنا، ارمان کے قابل بنا
اہلِ دل بننے کی حسرت ہے تو دل کو دل بنا

عقدہ تو بے شک کھلا لیکن بصد دقت کھلا
کام تو بے شک بنا لیکن بصد مشکل بنا

جب ابھارا ہی تو اپنے قرب کی حد تک ابھار
جب بنایا ہی تو اپنے لطف کے قابل بنا

سب جہانوں سے جدا اپنا جہاں تخلیق کر
سب مکانوں سے جدا اپنا مکانِ دل بنا

یادِ ماضی تازہ کر کے حال کی تخریب کر
اور اُس تخریب پر ایوانِ مستقبل بنا

یہ تو سمجھے، آج آزاد ایک کامل فرد ہی
یہ نہ سمجھے، ایک ناقص کس طرح کامل بنا

حکیم آزاد انصاری

چند مشرقی مفکّرینِ سیاست

(۱)

کہا جاتا ہے کہ علمِ سیاست کی داغ بیل قدیم یونان میں پڑی اور رفتہ رفتہ یہ علم ممالکِ یورپ میں ارتقائی نشو و نما پاکر تمام دنیا میں پھیل گیا۔ کم و بیش تمام مغربی مصنفین کا یہی عقیدہ ہے۔ مغربی مصنفین اگر اس نظریہ کو مانتے ہیں تو جہاں تک یورپ کا تعلق ہے چنداں ہرج نہیں اس لئے کہ یورپ میں یہ فخر یونان ہی کو حاصل ہے کہ اول اول وہاں سیاسی نظام و سیاسی نظریات کی بنیادیں پڑیں۔ اور یہ بنیادیں نہ صرف سیاسی معاملات سے تعلق رکھتی تھیں بلکہ ان کا اثر تمام تمدنی و معاشرتی نظام پر یکساں حاوی تھا اسی وجہ سے یورپی مصنفین یونان کو اپنا روحانی وطن مانتے ہیں جہاں سے اُن کے خیال کے مطابق اول اول علم کا چشمہ اُبلا۔ لیکن دوسرے علوم سے قطع نظر اگر صرف سیاست ہی کو لے لیا جائے اور تاریخ کی روشنی میں اُس کا مشاہدہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ سیاسی مفکرین یونان سے صدیوں پہلے دوسرے مشرقی ممالک میں گذر چکے ہیں اور یونان اس دوڑ میں بہت پیچھے ہے۔ آیئے ذرا دو ایک ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تاکہ یہ معاملہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی کے ایک مشہور ماہرِ الطبقات پروفیسر شلائمن نے شہر ٹرائے کے قدیم کھنڈروں میں کھدائی کا کام شروع کیا اور کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد انہوں نے قدیم ٹرائے کا پتہ لگایا۔ قدیم یونان کی تہذیب کا گہوارہ ایشیائے کوچک تھا۔ یہاں تک کہ یونانی زبان کا سب سے بڑا شاعر ہومر ایشیائے کوچک کا باشندہ بتایا جاتا ہے۔ قدیم یونانی تہذیب سے قبل جس کا خاکہ ہومر کی منظوم حکایتوں میں ملتا ہے۔ یونان کئی تہذیبوں کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ جن کا اب تک کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ پروفیسر موصوف نے اپنی محنت و کاوش سے دریافت کیا کہ یونانیوں کی تہذیب سے پہلے جو تہذیب وہاں رائج تھی وہ مائسینین (Mycaenean) زمانہ کے نام سے موسوم ہوسکتی ہے۔ اس کا تعین عہد ڈیڑھ ہزار سال قبلِ مسیح ہوسکتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۱ء کے قریب انگلستان کے ایک مشہور پروفیسر سر ایے۔ جے۔ ایونس نے جزیرۂ کریٹ واقع بحرِ روم میں کھدائی کا کام شروع کیا اور انہوں نے بھی اس جزیرہ میں جو جزیرہ نمائے یونان کے قریب

ہے ایک دوسری تہذیب کا پتہ چلایا جس کا عہد غالباً ڈیڑھ ہزار لغایت ایک ہزار سال قبلِ مسیح تھا۔ اب ہندوستان کا حال سنیئے۔ ابھی آٹھ نو سال کا عرصہ ہُوا کہ مسٹر بنرجی اور مسٹر دکشت کی رہنمائی میں سندھ اور پنجاب کی سرحد پر محکمۂ آثارِ قدیمہ کی سرپرستی میں کھدائی شروع ہوئی۔ کام شروع ہونے کے کچھ دنوں بعد معلوم ہونے لگا کہ محنت بیکار نہ جائے گی بلکہ اس تودۂ خاک کے پیچھے جو خزانہ پوشیدہ ہے وہ نہ صرف ہندوستان کی تاریخ کو بلکہ دنیا کی تاریخ کو مالامال کر دے گا۔ آخرکار کھدائی کے بعد ایک غارت شدہ شہر کے حدود اور مکانات کا پتہ چلا۔ یہ شہر موہنجو دارو تھا جس میں سے عورتوں کے مختلف قسم کے طلائی زیورات۔ سونے چاندی کے برتن انسانی سروں کا ایک کثیر ذخیرہ اور دیگر سازوسامانِ معیشت و خانہ داری نمودار ہُوا ہے۔ ان چیزوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اور جیسا کہ محققین کی رائے ہے کہ ہندوستان کو تین ہزار برس قبلِ مسیح کی کھوئی ہوئی تاریخ ہاتھ آئی۔ اب تک زیادہ سے زیادہ ہزار برس قبلِ مسیح کی تاریخ کا پتا چلتا تھا۔ مگر وہ بھی اسناد صندلا اور مذہبی روایات میں اتنا ملا جلا تھا کہ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے الگ کرنا بڑا مشکل ہو گیا تھا۔ اس گنجِ شایگاں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں تمدن نے کتنی ترقی کر لی تھی کہ نہ صرف مکان وغیرہ پختہ اور عمدہ اینٹ پتھر کے بنے ہوئے تھے بلکہ کھانے اور پینے کے برتن وغیرہ بھی سونے چاندی کے ہوتے تھے جن پر نقش وغیرہ کھدے ہوئے تھے۔

ماہرین الطبقات اس امر پر متفق نہیں ہیں کہ اول اول تہذیب کی بنیاد کہاں پڑی۔ کوئی بابل اور نینوا کی اینٹوں کو دیکھ کر حکم لگاتا ہے کہ انسان نے خانہ بدوشی اور جنگلی زندگی کو خیرباد کہہ کر یہیں بود و باش اختیار کی تھی اور یہیں سوسائٹی کی بنیاد پڑی تھی۔ دوسرا گروہ مصر کے متعلق اصرار کرتا ہے کہ تہذیب کی کرنیں پہلے پہل ٹوٹن خامن کے ملک میں چمکیں اور ثبوت میں اہرام مصری اور ابوالہول کی زندہ یادگاروں کو پیش کرتا ہے۔ اس لئے کہ تمام ملکوں کی قدیم عمارتوں کی ابتدا کا کچھ نہ کچھ پتہ چل جاتا ہے مگر اہرام کی صحیح تاریخ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ بعض امریکی کہتے ہیں کہ تہذیب کا پہلا گہوارہ ملکِ چین کا صحرائے گوبی ہے جہاں حال میں انسانوں کی کچھ ایسی ہڈیاں پائی گئی ہیں جو اس موہوم جانور سے مشابہ ہیں، جو ابوالبشر سمجھا جاتا ہے۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور اب تو اس بحث میں ہندوستان بھی برابر کا حصہ دار ہو گیا ہے۔ مندرجہ بالا واقعات کو دیکھ کر یہی رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ ماہرین کا نظریہ خواہ کچھ بھی ہو مشرق یورپ سے صدیوں قبل تمدن کا مرکز تھا اور مشرق کے لوگوں نے جو ترقیاں اس دور میں کی تھیں وہ اس زمانے میں مغرب کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں۔ سر سریندر ناتھ بنرجی اپنی مشہور کتاب "ایک قوم بحالتِ تعمیر" میں لکھتے ہیں کہ جب یورپ کے مہذب ترین ملک کے لوگوں کے آباؤ اجداد جنگلوں میں پھرتے تھے اس وقت ہندوستانیوں نے سلطنتیں

قائم کر رکھی تھیں۔ بڑے بڑے شہر آباد کر رکھے تھے اور مذہب، ادب اور اخلاقیات میں وہ ترقیاں کی تھیں کہ آج وہ مہذب دنیا کے لئے باعثِ حیرت ہیں۔"

یونانیوں کو تمام علوم مثلاً فلسفہ۔ ریاضی۔ تاریخ۔ طب و نجوم وغیرہ کا ابوالآبا کہتے ہیں۔ مغربی مصنفین تو اپنی خودستائیوں میں یہاں تک پرواز کرتے ہیں کہ ہندوستان کے ریاضی فلسفہ اور طب وغیرہ کو بھی یونانیوں کا مرہونِ منت بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ہندوستان میں علوم کا دور دورہ تھا وہ ان چند یونانی مفکرین کے طفیل ہے جو سکندرِ اعظم کے ساتھ اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً ہندوستان میں آتے رہے۔ یہ نظریہ جتنا لغو ہے اتنا ہی بے بنیاد بھی ہے اس لئے کہ سکندرِ اعظم کا حملہ چوتھی صدی قبلِ مسیح کے آخر میں ہؤا اور ہندوستان میں ریاضی فلسفہ وغیرہ کا دور دورہ اس سے صدیوں قبل شروع ہو چکا تھا۔ اپنی بحری زندگی کے قصوں کی وجہ سے جن کا ذکر ہومر اپنی اوڈیسی میں کرتا ہے یونانی جغرافیہ کے موجد مانے جاتے ہیں۔ لیکن اس امر کی پختہ شہادتیں موجود ہیں کہ فن جہاز رانی میں چینیوں نے یونانیوں اور فنیشیوں سے صدیوں قبل بہت کچھ ترقیاں حاصل کر لی تھیں اور سمندر کے سفر سے بخوبی آگاہ تھے۔ جرمنی کے مشہور عالم فان ہمبولٹ نے قطب نما کی ابتدا کے متعلق جو مضمون تحریر کیا ہے اور جو پیرس میں ۱۸۳۴ء میں چھپ گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اول اول قطب نما کا حوالہ چین کی تاریخ میں شاہ ہیون یون کے چونسٹھویں جلوس کی سالگرہ پر ملتا ہے۔ یہ واقعہ دو ہزار چھ سو چونتیس قبل مسیح کا ہے۔ شاہ ہیون یون نے جب چی یون پر حملہ کیا تو اس کی فوج ایک کہر میں گھر گئی۔ اس وقت شاہ نے ایک معمولی گھڑی بنانے کا حکم دیا جس سے جنوب کی سمت کے علاوہ اور سمتیں بھی دریافت ہوں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کے مضمون نویس کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ چینی جہاز کھینتے کھینتے ہندوستان کے ساحل تک چلے آئے تھے اور ان کے جہازوں کا رُخ سوئیوں کی نوک سے درست کیا جاتا تھا۔

ان تمام امور پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں مشرقی سوسائٹی نے خاص تمدنی ترقی کر لی تھی۔ عام طور پر لوگ گاؤں اور قصبوں میں رہتے تھے اور ان تمام مقامات میں ایک مستقل سیاسی نظام ہوتا تھا جو ملک کی ترقی اور امن کا ضامن تھا۔ ملک کی ترقی خود اس بات کی شاہد ہے کہ سوسائٹی میں کوئی باقاعدہ نظام ضرور ہوگا جس کو آج ہم حکومت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ ایک عمدہ حکومت تمام ترقیوں کی بنیاد ہوتی ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ مشرقی مفکرین نے حکومت کے سیاسی پہلو پر غور و فکر نہ کیا ہو۔

مشرق میں سیاسی بیداری پہلے پہل چین میں شروع ہوئی۔ پہلا معلم و مصنف سیاست ہونگ فوزی ہے جو پانچ سو پچاس برس قبل مسیح پیدا ہؤا اور چار سو اٹھتر قبلِ مسیح میں وفات پا گیا۔ اس کے متعلق ہماری جو کچھ معلومات ہیں ان کا سرچشمہ اُس کا ایک پیرو منسیوس ہے جو اُس کی وفات کے تقریباً سو برس بعد پیدا ہؤا۔ اس کے علاوہ

اس کی تصنیف "تاریخ لُو" سے بھی نہایت مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جب اس کی شہرت چاردانگِ عالم میں ہوئی تو ہونگ فوزی کا نام لاطینی زبان میں ڈھالا گیا جو بگڑتی ہوئی صورت میں کنفیوشس ہے کنفیوشس چین کے شہر لو میں اُس وقت پیدا ہوا جب ہر طرف خانہ جنگی کا بازار گرم تھا۔ امیروں اور رئیسوں نے زمین کے ٹکڑے کر لئے تھے اور ان پر قابض تھے۔ ظاہر ہے کہ ملک تباہ حال تھا اور آسودگی کوسوں دور۔ اس اختلال اور پریشان حالی میں نظام قائم کرنا سخت مشکل تھا۔ بالخصوص اس حالت میں کہ مرکزی حکومت خود اتنی کمزور تھی کہ امیروں اور نوابوں پر سختی نہیں کرسکتی تھی۔ امرا آپس میں خوب لڑتے تھے کنفیوشس نے ان تمام خرابیوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خون کے آنسو رویا مگر کیا کرسکتا تھا۔ منسیوس کا بیان ہے کہ کنفیوشس اس خانہ جنگی سے بہت پریشان ہوگیا تھا اور آخر میں اُس نے اصلاح و تعمیر کا مقصدِ عظیم اپنے سامنے رکھ کر کوشش شروع کی۔ اس سلسلہ میں اوّل اس نے چین کی سیاسی اور معاشرتی تاریخ کا مطالعہ کیا اور شاید وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ سمجھا کہ انسانوں پر کسی نظریہ کی بنا پر خواہ وہ قانونی ہو یا فلسفیانہ حکومت کرنا ناممکن ہے۔ اس کی نظر میں سیاست کا فن کوئی زبردستی کا قانون نہیں تھا جس کو ایک جماعت تمام ملک پر عائد کردیتی ہے۔ بلکہ سیاست اس فن کا نام ہے جس کی رو سے انسانوں کے عادات و اطوار۔ خصائل و اخلاق اور رسم و رواج کو تسلیم کر کے ان میں رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا کی جائے۔ اس باب میں وہ گویا آئرلینڈ کے مشہور سیاسی مصنف برک کا ہم زبان ہے۔

کامل پندرہ برس تک کنفیوشس مطالعہ میں مصروف رہا اور اپنے حجرے سے باہر نہ نکلا حالانکہ کسی نہ کسی طرف سے اس پر برابر شرکت کی خاطر دباؤ پڑتا رہا۔ اپنی عمر کے باونویں سال میں وہ شہر چنگ ٹو کا مجسٹریٹ مقرر ہوا۔ اور بعد ازاں وزیر عدالت ہوا۔ اس وقت اس نے اپنے نظریات کو بروئے کار لانا شروع کیا۔ وہ مجرموں کو سخت سزائیں دیتا تھا تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔

کنفیوشس کا قول تھا کہ سوسائٹی کا نظام پانچ جفت عناصر کی باہم ترکیب سے وضع ہوا ہے۔ سوسائٹی کا قیام انہیں عناصر کی منظم کارکردگی پر منحصر ہے۔ وہ پانچ جفت عناصر یہ ہیں۔ اول حاکم و رعایا۔ دوم شوہر و بیوی سوم باپ اور بیٹا۔ چہارم بڑا بھائی اور چھوٹا بھائی۔ پنجم دوست۔ اس کو پختہ یقین تھا کہ انسانی فطرت نیک ہے اور ہمیشہ نیکی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اور اس لئے اس نے سوسائٹی کے مجموعی آرام و امن کے لئے ہر جفت میں اول عنصر کی حکومت کو تسلیم کیا اور تلقین کی کہ اول عنصر کو چاہیئے کہ انصاف اور رحم کے ساتھ دوسرے عنصر پر حکومت کرے اور اس طرح دوسرے عنصر کو چاہیئے کہ وہ بھی کمال ایمانداری اخلاص اور وفاداری سے اول عنصر کی فرماں برداری کرے۔ رہے دوست تو ان کو آپس میں کمال محبت کا سلوک کرنا چاہئے۔ یعنی رعایا کو حاکم کی بیوی کو شوہر کی بیٹے کو باپ کی چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو

سوسائٹی کے نظام میں سخت خلل واقع ہوگا اور ساری زندگی تلخ ہو جائے گی۔

منصب شاہی کو وہ خدا کی طرف سے ودیعت کردہ منصب سمجھتا ہے لیکن اس منصب کے لئے اہلیت کی شرط کو ضروری قرار دیتا ہے اور اہلیت سے الطاف اور رحم مراد لیتا ہے۔ بادشاہ کو منصب اختیار کرنے کے بعد کبھی ذاتی اغراض اور منافع کے لئے کوئی کام نہ کرنا چاہیئے۔ رعایا کی ترقی اور ملک میں امن کا قیام یہ اس کے دو اہم فرض ہیں، اور جب تک وہ ان دو باتوں پر عمل پیرا ہے وہ شاہی منصب کی اہلیت رکھتا ہے لیکن جب وہ رعایا پر ظلم کرنا شروع کرے کسی وزیر یا اس کے کسی خاندان کے فرد کو یا پھر کسی خدائی طاقت کو چاہیئے کہ اس کو ہٹا دے۔ کنفیوشس اس خدائی طاقت کے مفہوم کو صاف اور واضح طور پر بیان نہیں کرتا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کا مطلب کسی ایسے طاقتور شخص سے ہو جو عام طور پر منظم سوسائٹی کے درہم برہم ہوتے وقت پیدا ہو کر سارے اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تاریخ میں اس کی صدہا مثالیں ہیں۔ نپولین نے خود اسی طرح برسر اقتدار ہو کر حکومت کی۔ آج مسولینی اور مصطفیٰ کمال پاشا کا یہی حال ہے۔ ایک طرف تو کنفیوشس کی تعلیم ہے کہ حکومت کی تعظیم کی جائے اور اس کے تمام احکام کی پابندی ہو یہاں تک کہ خود شاہ کی حکومت کا سرچشمہ خدا کی حکومت ہے، اور دوسری طرف وہ بادشاہوں کے لئے صحیح لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کی تعلیم میں جو بات نہایت اہم ہے وہ یہ ہے کہ جابر اور ظالم بادشاہ کے مقابلہ میں رعایا کی بغاوت کو جائز ٹھہراتا ہے اور اس لئے بادشاہ کے اختیارات کو رعایا کا تابع قرار دیتا ہے۔ اس کی تعلیم انصاف پسند اور رحم دل بادشاہ کی موافقت میں ہے۔ وہ مطلق العنانی اور خودسری کو بُرا کہتا ہے اس لئے کہ مطلق العنان کی حکومت رعایا کے فائدہ کے بجائے اس کے ذاتی مفاد کے لئے ہوتی ہے۔

کنفیوشس مدتوں چین کی مختلف ریاستوں میں پھرتا رہا اور کئی مقامات پر اس نے امرا سے اپنے نظریہ کو قبول کرا کے بروئے کار لانے کی التجا بھی کی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی امیر یا حاکم اپنی سلطنت کا انتظام صرف بارہ مہینوں کے لئے میرے ہاتھوں میں دے دے تو ملک کو میں بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہوں اور تین سال میں تو میری تمام آرزوئیں پوری ہو سکتی ہیں۔ کم و بیش تمام ریاستوں کے حاکموں نے اس کا بہت عزت و تکریم کے ساتھ استقبال کیا۔ مگر اس کی نصیحت پر کوئی بھی عمل کے لئے تیار نہ ہُوا۔

چین کی سماجی زندگی پر اُس کا اتنا اثر تھا کہ دو سو برس بعد جب چین سین کے ظالمانہ پنجوں میں گرفتار ہُوا اور اس گرفتاری میں سین نے تمام قدیم روایات کا خون کرنے کی انتہائی کوشش کی تو یہ صرف کنفیوشس ہی کی تعلیم تھی جو زندہ تھی اور زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی۔ چین میں باوجود پیہم انقلاب پر انقلاب آنے اور شاہنشاہی کا درجہ ختم ہونے کے بعد بھی آج کنفیوشس کا اثر باقی ہے۔

کنفیوشس سیاسی معلّم ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑا فلسفی اور ادیب بھی تھا۔ اُس کی کہاوتیں اب تک مشہور ہیں اور موسمِ بہار کی طرح تازہ ہیں۔ ذیل میں اس کی دو چار کہاوتیں قارئین کی دلچسپی کے لئے درج کی جاتی ہیں:-

عقلمند آدمی اپنی تلاش کرتا ہے، بیوقوف اور کم درجہ کا آدمی دوسروں کی جستجو میں رہتا ہے۔

حقیقی عظمت اور بزرگی یہ نہیں ہے کہ انسان کو حوادثِ زمانہ کے مقابلہ کا موقع ہی نہیں ملا۔ بلکہ اصلی عظمت مقابلہ کرنے، ہارنے اور پھر دوبارہ مقابلہ کی تیاری میں ہے۔

سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ تکلیف میں انسان اپنے نفس پر حاکم ہو اور درد اور مصیبت کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔

(باقی آئندہ) ـــــــ "قرہ خال"

غزل

نہیں کہتے اُسے آرام جو دولت سے مِلتا ہے
سکوں ہے نام اُس کا جو تہی قربت سے مِلتا ہے

دمِ رخصت تم اپنے مبتلا کا حال تو دیکھو
گلے سے وہ تمہارے ہائے کس حسرت سے مِلتا ہے

نصیب اُس کا ہے تو کرتا ہی جس سے پیار کی باتیں
مقدر اُس کا ہے جو تجھ سے مہ طلعت سے مِلتا ہے

کسی کو بدگمانی کیوں ہو میرے تجھ سے ملنے پر
کہ بُلبل پھول سے اک جذبۂ فطرت سے مِلتا ہے

نیا جلوہ نیا عالم نیا رنگ اُس کا جب دیکھو
یہ مانا ہم سے وہ دلدار اک مدت سے مِلتا ہے

نجیب امید ایسے سے وفا کی! باز آ ناداں
بھلا تیرا وہ کیا ہوگا جو اک خلقت سے مِلتا ہے

میر سعادت حسین نجیب

برکھا رین چاندنی

بھانت بھانت کے چھائے بادل ہلکی گہری بدلی وا لے	چھنلے[1] چھنلے صاف اور میلے بھورے بھورے کالے کالے

ہردے بیچ کوئی مُسکیا وے[2]

کچھ بادل ہیں اُون سی ملنے اور کچھ جیسے روئی کے گالے	چندر چھپے اُن میں اور نکلے چمک چمک مُکھ آنچل ڈالے

ہردے بیچ کوئی مُسکیا وے

دھیرے دھیرے ڈولے بدلی آئے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے	دھنک[3] رنگ سی چندر گھرا ہے اُتر دکھن کا ندھا لونکے[4]

ہردے بیچ کوئی مُسکیا وے

ڈوب ڈوب بدلی سے اُبھریں دوڑ دوڑ کے بھاگیں تارے	کوئی بڑا ہی کوئی چھوٹا ننھے مُنّے پیارے پیارے

ہردے بیچ کوئی مُسکیا وے

برکھا رین میں کوٹھے اوپر دور کہیں کوئی کجلی[5] گاوے	باہر گاؤں کھڑا ہروا ہا[6] اپنے ساتھی کو گُہراوے[7]

ہردے بیچ کوئی مُسکیا وے

دیا اُسی جگ داتا کی ہی جو سنسار کا بھار سنبھالے	نیچ اونچ کو ان پہونچا وے سارے جگ کو پوسے پالے

ہردے بیچ وُہی مُسکیا وے

---

[1] چھنلے بادلوں کے مجمع کو اودھ میں "تنُل بدریا" کہتے ہیں۔ [2] مُسکیا وے۔ یعنی مُسکرا وے۔ تبسم کرے [3] قاعدہ ہے کہ ہلکے بادلوں میں چاند کے چاروں طرف قوسی رنگ کے ہلکے پڑ جاتے ہیں [4] کاندھا لونکے۔ چمک ہوئے بجلی چمکے [5] کجلی۔ ایک موسمی گیت کا نام ہے۔ برسات کے زمانے میں یہ گیت عام ہے [6] ہرواہا۔ ہل چلانے والا۔ یعنی کسان [7] گہراوے یعنی آواز دے پکارے۔ قاعدہ ہے کہ کسان رات کے وقت کھیت وغیرہ کے انتظام کے لئے اپنے دوسرے ساتھی کو پکارنا اور آواز دیا کرتا ہے۔ وہ سین نہایت دلچسپ ہوتا ہے۔

بچّے اَور بُوڑھے

یہ افسانہ کیسنکر کی کتاب "مناظرِ رویا" سے ماخوذ ہے۔ یہ مصنف سلوفینی مصنفین کے نوجوان طبقے میں سب سے زیادہ ہونہار تھا اور اس کے ڈرامے ناول اور افسانے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ "مناظرِ رویا" اس کی آخری تصنیف ہے جو ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ اس افسانے کا ترجمہ انگریزی میں پہلے پہل ۱۹۲۶ء میں ہُوا اور اب میں نے وہیں سے لے کر اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔

ہر رات سونے سے پہلے بچے آپس میں باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ آتش دان کے سامنے بیٹھ جاتے اور جو کچھ اُن کے جی میں آتا کہے چلے جاتے۔ شام کے دُھندلکے میں شفق اپنی خواب آگیں آنکھوں کے ساتھ تنگ دریچے میں سے کمرے کے اندر جھانکتی اور گوشے گوشے سے تاریکی کے خاموش بادل خدا جانے کیا کیا عجیب وغریب داستانیں اپنے ساتھ لئے ہوئے اوپر کو اُٹھ اُٹھ کر فضا میں تیرنے لگتے۔

بچوں کے دل میں جو بات بھی آتی کہتے چلے جاتے، لیکن اُن کے پاکیزہ دلوں میں مسرت کے نُور میں سموئی ہوئی محبت اور امید کی داستانوں کے سوا اور تھا بھی کیا؟ مستقبل اُن کے نزدیک خوشی اور بے فکری کا ایک طویل خوشگوار عہد تھا اور زندگی ان کے خیال میں اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ کہیں کسی مشجّر پردے کے پیچھے پُرجوش دل اور پُرشوق نگاہوں کے ساتھ نور کے ایک دریا میں تیرتی چھینٹے اُڑاتی اور گاتی ہوئی نور کے کسی سمندر کی طرف بہے چلی جارہی تھی۔ بچے آہستہ آہستہ باتیں کرتے، ان کی آدھی باتیں سنی جاتیں اور آدھی اَن سُنی رہ جاتیں۔ ہر داستان بے سروپا ہوتی جس کا نہ کوئی آغاز ہوتا نہ انجام، اور پھر کبھی چاروں بچے یکبارگی بولنے لگتے، لیکن باوجود اس کے کسی کی بات میں بھی خلل نہ پڑتا۔ اُن کی نگاہیں ایک ایسے دل لبھا لینے والے آسمانی نور پر جمی ہوئی ہوتیں جس کے پرتو میں ہر لفظ سچا اور واضح ہو جاتا، ہر داستان بھی زندگی کا ایک دلکش مرقع بن جاتی اور ہر افسانے کا انجام شاندار نظر آنے لگتا۔

بچوں کی صورتوں میں باہم اس قدر قریبی مشابہت تھی کہ شفق کی دھندلی روشنی میں سب سے چھوٹے

بچے حسین پر جس کی عمر چار سال کی تھی زبیدہ کا گمان ہوتا۔ حالانکہ وہ اُس سے چھ سال بڑی تھی۔ سب کے چہرے نازک اور دُبلے پتلے اور آنکھیں بڑی بڑی اور کشادہ تھیں جن سے سوچ بچار کے آثار نمایاں تھے۔

اُس شام کو جس کا ذکر ہے کسی نامعلوم مقام سے کوئی نامعلوم چیز کسی تند ہاتھ نے اِس آسمانی فضا میں لا ڈالی تھی جس سے پر لطف کہانیوں اور معصوم دلچسپیوں کی یہ مسرور زندگی بُری طرح مجروح ہو گئی۔

ڈاک یہ خبر لائی تھی کہ ابّا اٹلی کے میدانِ جنگ میں کام آ گئے"۔ ایک عجیب وغریب نامعلوم اور ناقابلِ فہم بات اُن کے لئے پیدا ہو گئی تھی۔ ایک بلائے سرم سامنے کھڑی تھی جس کا نہ چہرہ تھا نہ آنکھیں اور نہ منہ۔ بس ایک طویل وعریض ہئیت تھی جس کا جامع مسجد کی چہل پہل، بازار کی گہما گہمی، شام کے دھندلکے میں آتشدان کی خوشگوار سرخ لَو اور دلچسپ کہانیوں سے کوئی ربط ہی معلوم نہ ہوتا تھا۔ نہ اس کا خوشی ہی سے کوئی واسطہ تھا اور نہ خاص طور پر غم ہی سے کوئی تعلق، کیونکہ یہ مردہ تھی۔ نہ اس کی آنکھیں تھیں کہ اس کی نگاہیں اس کا حال کھولتیں اور نہ اس کا منہ تھا کہ اس کی باتوں سے اس کی حقیقت معلوم ہوتی۔ سوچ بچار اس عظیم الہیئت دیو کے مقابل اس طرح عجز وہراس کی تصویر بن کر کھڑی تھی گویا سامنے کوئی بہت بڑی سیاہ، ڈراؤنی سنگلاخ دیوار کھینچ دی گئی ہو۔ یہ دیوار تک پہنچتی اور پھر حیران و ششدر کھڑی کی کھڑی رہ جاتی۔

حسین نے حیرت زدہ آنکھیں کھولے ہوئے پوچھا "لیکن ابا واپس کب آئیں گے؟"

زبیدہ نے کچھ بگڑ کر جواب دیا "جب وہ جنگ میں کام آ گئے تو واپس کس طرح آ سکتے ہیں"۔

کچھ دیر کے لئے سب چپ ہو گئے وہ پھر اُسی عظیم الشان سیاہ دیوار کے سامنے کھڑے تھے جس کے پرے اُن کی نظر کام نہ کر سکتی تھی۔

آخر زاہد جس کی عمر سات سال کی تھی یکایک بول اُٹھا "میں بھی جنگ میں جاتا ہوں" اس نے یہ بات اس انداز سے کہی گویا وہ دفعۃً صحیح فیصلے پر پہنچ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

پھر ننھے حسین نے اسے ناصحانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا "تم ابھی بہت چھوٹے ہو"۔ حسین نے خود ابھی ننھے بچوں کا گاؤن پہننا نہ چھوڑا تھا۔

خالدہ جو سب سے زیادہ نحیف اور کمزور تھی اور اپنی امّاں کی شال میں لپٹی ہوئی یوں معلوم ہوتی تھی گویا کسی راہگیر کے سامان کی گٹھڑی ہے کہیں تاریکی میں سے اپنی نرم اور دھیمی آواز سے بولی "جنگ ہوتی کس طرح کی ہے؟ زاہد تم بتاؤ۔ ہمیں آج اسی کی کہانی سناؤ"

زاہد بولا "سنو۔ جنگ یوں ہوتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے جسم میں چھریاں گھونپتے ہیں اور

تلوار سے ایک دوسرے کا سر کاٹ لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ بندوقیں بھی چلاتے جاتے ہیں بس یہ ہے جنگ"۔
خالدہ نے پوچھا" اور ایک دوسرے کو مار نے کس لئے ہیں ؟"
زاہد ۔" بادشاہ سلامت کے لئے" یہ سن کر سب خاموش ہو گئے۔
گھٹا ٹوپ اندھیری دوریوں میں اُن کی دُھندلی نگاہوں کے سامنے ایک عجیب پرشکوہ چیز نمودار تھی جس سے آسمانی نور کی برکھا لگ رہی تھی اور وہ بے حس و حرکت دم سادھے ہوئے بیٹھے تھے۔ گویا عبادت گزار اپنے معبود کے سامنے بیٹھے ہوں۔
اس کے بعد زاہد نے پھر بہ سرعت اپنے خیالات کو جمع کرتے ہوئے اُس خاموشی کا طلسم توڑا جو بے طرح ان پر چھا گئی تھی" نہیں میں ضرور دشمن سے لڑنے کے لئے جنگ میں جاؤں گا"
اس پر خالدہ نے دھیمی آواز سے پوچھا" دشمن ہوتا کس طرح کا ہے ؟" اس کے سینگ بھی ہوتے ہیں ؟"
حسین (پُرجوش انداز سے تقریباً برافروختہ ہو کر)" اور نہیں تو کیا؟ پھر وہ دشمن ہی کیا ہوا؟"
اب زاہد کو بھی کوئی قطعی جواب بن نہ پڑا۔ اس نے رُکتے رُکتے کہا" میرے خیال میں تو اس کے سینگ نہیں ہوتے"
زبیدہ نے بادل ناخواستہ دخل دیتے ہوئے کہا" سینگ اُس کے کس طرح ہو سکتے ہیں۔ وہ ہماری ہی طرح کا آدمی ہوتا ہے۔ پھر ذرا سوچ کر بولی" البتہ اس کی روح نہیں ہوتی"۔
طویل وقفے کے بعد حسین نے پوچھا" جنگ میں کس طرح کام آتے ہیں ؟" پھر اپنے بازو زور زور سے آگے پیچھے ہلا کر بولا" اِس طرح ؟"
زاہد نے کہا" نہیں آدمی کو جان سے مار ڈالتے ہیں"
پھر حسین کہنے لگا" ابا کہتے تھے ہم تمہارے لئے بندوق لائیں گے"
زبیدہ کسی قدر درشت لہجہ سے بولی" اگر وہ جنگ میں کام آ گئے ہیں تو وہ تمہاری بندوق کس طرح لا سکتے ہیں"۔
حسین" اور پھر دشمن نے اُن کو جان سے ——— مار ڈالا؟"
زبیدہ" ہاں جان سے"
بچوں کی کھلی ہوئی معصوم آنکھوں میں سے خاموشی اور غم نے تاریکی میں، کسی نامعلوم چیز پر جس کا دل و دماغ احاطہ نہیں کر سکتے، ٹکٹکی باندھ دی۔
دادی اماں اور دادا جان اُس وقت گھر کے دروازے کے سامنے ایک بنچ پر بیٹھے تھے باغ

کے گھنے پتوں میں سے شفق کی سُرخ روشنی چھن چھن کر نکل رہی تھی اور شام کی گہری خاموشی میں اصطبل سے رونے کی ایک دبی ہوئی اور گھٹی ہوئی آواز سنائی دیتی تھی جواب تقریباً ہچکیوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ یہ غالباً نوجوان ماں کے رونے کی آواز تھی جو وہاں جانوروں کی خبرگیری کے لئے گئی تھی۔

بوڑھا اور بڑھیا شدید غم میں سر جھکائے ہوئے ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے۔ آج مدتِ دراز کے بعد پھر ان دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں تھے اور اُن کی آنسوؤں سے محروم آنکھیں شفق کے نور پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بالکل چُپ چاپ تھے۔

حامد علی خاں

عزمِ سفر

وہ لوگ جن کا عمر بھر، رہے گا ایک مستقر ضرور پائیں گے ضرر۔ نہ ملک میں وُہ ذی اثر
نہ قوم ہی میں معتبر۔ چلو اٹھو کہاں کا گھر ابھی سے باندھ لو کمر، سفر سے ہوں گے بہرہ ور
وسیع تا کہ ہو نظر

سفر کو صورتِ سفر کہیں گے اب بھی ہم اگر ہنسیں گے سارے باخبر ہمارے اس خیال پر
زمانہ وہ گیا گذر، ٹھگوں کا اب ہے شور و شر نہ رہزنوں کا کچھ خطر۔ ذلیل ہو گئے خیرہ سر
خبر نہیں گئے کدھر

کسی پہ کیا ہے منحصر ہر ایک شاہِ خوش سیر ہے امن کا پیامبر۔ پُر امن راہِ بحر و بر
کہیں بھی کچھ نہیں ہے ڈر۔ برائے طالبِ گہر برائے کاسبِ ہنر، سفر وسیلۂ ظفر
کرو سفر کرو سفر

سید علی منظور
(حیدرآباد دکن)

احسن الکلام

دل ہے یکسو عاشقوں کا حال یکساں دیکھ کر
یعنی اطمینان ہے سب کو پریشاں دیکھ کر

تھی کسے تابِ تکلم روئے تاباں دیکھ کر
نکلے گویا کہنے سُننے کے بھی ارماں دیکھ کر

کم نہ ہوگا جوشِ وحشت، کیوں کیا ہے مجھ کو قید
اور چڑھتا ہے جنوں دیوارِ زنداں دیکھ کر

ایک دِل صدہا تمنائیں، ہزاروں حسرتیں
میہماں گھبرا گیا ہے اتنے مہماں دیکھ کر

دستِ وحشت کو یہ تھا حفظِ مراتب کا لحاظ
اُن کا دامن تہ کیا میرا گریباں دیکھ کر

پائے گا حد، وسعتِ دل کی تو کیا پائے خیال
آپ کھو جائے گا ذرّے میں بیاباں دیکھ کر

حسنِ عالم کا نگاہوں سے مرقع گِر گیا
دِل کے آئینے میں عکسِ روئے جاناں دیکھ کر

اُٹھ گیا دُنیا سے آنکھوں کا لحاظ و پاس بھی
بے مُروّت ہنس رہا ہے مجھ کو گریاں دیکھ کر

آئینہ خانے میں اوّل دیکھیے اپنا جمال
پھر تعجب کیجیے عاشق کو حیراں دیکھ کر

ہجر و وحشت کا اثر ہم دیکھتے ہیں ساتھ ساتھ
تم کو تنہا چھوڑ کر دل کو پریشاں دیکھ کر

ہو بُرا بیتابیوں کا پالیا غیروں نے بھید
نالۂ فریاد سُن کر چشمِ گریاں دیکھ کر

کھُل گیا روئے حقیقت وا ہوئی چشمِ مجاز
اپنی صورت دیکھ لی تصویرِ جاناں دیکھ کر

کیوں فریبِ حسن کی در پردہ ہو منّت کشی
ہم اُٹھائیں گے تو احسن بارِ احساں دیکھ کر

احسن مارہروی

مذہب

انگلستان سے ایک نوجوان ہندوستانی طالب العلم کا یہ مضمون اشاعت کی غرض سے ہمیں موصول ہوا ہے مضمون نگار کسی خاص مذہب پر معترض نہیں بلکہ اس نے مذہب پر بحیثیت مجموعی اصولی اعتراض کئے ہیں۔ آج کل کے نوجوانوں میں جو دہریہ پن پھیل رہا ہے یہ مضمون اس کا ایک نمونہ ہے۔ ہم نے یہ آواز سنی ہے اور اسے سن کر خاموش ہو جانا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ دوسروں کو سناتے ہیں تاکہ حامیانِ مذہب اس کا معقول جواب دے کر مخالفینِ مذہب کو مطمئن کر سکیں۔ الحاد کے اس انتباہ سے اہلِ مذہب کو یہ فائدہ ضرور اٹھانا چاہیئے کہ وہ تنگ نظرانہ توہمات کو جو غلط طور پر مذہب میں شامل ہو گئے ہیں مذہب سے خارج کر کے از سرِ نو اس کی اصلاح کریں۔ "ہمایوں"

علم اور جہالت کے درمیان ایک موہوم سرحد ہے جو ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ مگر سرزمین جہل پر ایک نشان ایک نہایت مستحکم کھونٹے کی طرح سے گڑا ہوا ہے جس کی مدد سے ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم کہاں ہیں۔ یہ نشان مذہب ہے۔ انسان کی ذہنی زندگی کے ارتقاء کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب قدرت کی ظالم اور بے درد اور اندھی طاقتوں سے وحشی انسان سامنا کرتا تھا تو اس کے دل میں طرح طرح کے خوف پیدا ہوتے تھے۔ ہر جنبش میں اسے زندگی معلوم ہوتی تھی۔ بادل کی گرج کسی دیوتا کی خفگی تھی۔ درختوں پر بھوت پریت بستے تھے۔ ہر چشمے اور ندی، نالے میں روح ہوتی تھی۔ انسان بیچارہ ان تمام ان دیکھی ہستیوں کو خوش کرنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کرتا تھا اور چونکہ ہر علم کی بنیاد طبعی تجربہ ہے اس وجہ سے جب وہ اپنے توہمات اور خوف کے جذبوں کو مادی لباس پہنانا چاہتا تھا تو اس کے دیوتاؤں میں بھی انسانی خوبیاں اور انسانی خصلتیں، یا حیوانوں کی خوبیاں اور حیوانوں کی خصلتیں پائی جاتی تھیں۔ چوہا، بلی، بندر، لنگور، کتا، بھیڑیا، مور، سانپ سب پوجے جا چکے ہیں یا ابھی تک پوجے جاتے ہیں۔ انسان کے دیوتاؤں اور خداؤں میں ابھی غصہ، نفرت، محبت، فیاضی، رحم، انصاف، چالاکی وغیرہ، غرض تمام وہ خصلتیں ملتی ہیں جو معمولی آدمیوں میں پائی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب ایک نوع کا معاشری مرض ہے جو زمانۂ جہالت میں اولیں انسانوں کے گوناگوں جذبۂ ہائے خوف و ہراس کا آفریدہ ہے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا انسان کے توہمات بھی کم ہوتے گئے۔ یہ توہمات کبھی تو بالکل بھلا دئے

گئے اور کبھی صرف ان کی شکل بدل گئی اور انسان کی ہزار شیوہ فطرت فرسودگی سے اکتا کر انہیں کی کسی دوسری نئی شکل کی پرستش کرنے لگی۔ مگر مختلف مذہبوں کی نوعیت پھر بھی وہی رہی جو ایام جاہلیت میں تھی۔

اب ایام جاہلیت میں وحشی انسانوں کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو دیکھئے۔ زندگی کی پہلی ضرورت کھانے پینے کے سامان کی فراہمی اور جسم کو جاڑے اور گرمی سے بچانا ہے۔ ان ضرورتوں کو مہیا کرنے کے لئے انسان کو سخت جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ قبائل کی آپس میں لڑائیاں۔ اہل قبیلہ کے باہمی فساد، زمین کے لئے لڑائی اور اسلحہ کے واسطے لڑائی۔ غرض انسان صرف ایک قانون کے مطیع تھے اور وہ طاقت کا قانون تھا۔ مگر زور بازو سے اپنے حریف کو چت کر دینا تو ممکن ہے اس کے سینے پر چوبیس گھنٹے بیٹھے رہنا دشوار بھی ہے اور نامناسب بھی۔ دشوار اس وجہ سے کہ نہ معلوم کب ہماری آنکھ جھپک جائے اور ہمارا دشمن اس بےخبری کے عالم میں الٹا ہم پر حاوی ہو جائے، نامناسب اس وجہ سے کہ دشمن کو نیچا دکھانے سے ہمارا مقصد نہ صرف اس کے مال و اسباب پر قبضہ کرنا تھا بلکہ اس کو اپنا غلام بنا کر اس سے کام لینا بھی تھا حاکموں کو ضرورت کسی ایسی چیز کی تھی جو محکوموں پر ان کا ایسا رعب بٹھا دے کہ محکوم حاکم کو اپنا خدا یا خدا نہیں تو کم از کم اس کا نائب ضرور ماننے لگیں۔ ذہنی غلامی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی غلامی نہیں۔ جب ایک فاتح گروہ دوسرے مفتوح گروہ پر ذہنی قبضہ قائم کر لیتا ہے تو جبری حکومت کی ساری مشکل حل ہو جاتی۔ اس ذہنی غلامی کے قائم کرنے میں مذہب کی زنجیر سب سے قوی ہوتی ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ مذہب کی جڑ خوف اور جہالت ہے۔ مگر ہم نے ابھی تک مذہب کی تعریف نہیں کی۔ ہر شخص چونکہ مذہب کی الگ تعریف کرتا تھا اس وجہ سے ہمارے خیال میں مذہب کے بارے میں بلاخوف تردید صرف یہ بات کہی جاسکتی کہ وہ کائنات کے متعلق ایک ایسا نظریہ ہے جس میں پہلے تو ایک مافوق الادراک طاقت کی حکومت ہر چیز پر مان لی گئی ہے، انسانوں کی نجات اس طاقت کی خوشنودی اور ان کا ابتلا اس کی ناخوشی پر منحصر ہے، دوسرے روح جو مادی جسم سے جدا ہو سکتی ہے اور تیسرے دنیاوی زندگی کے علاوہ ایک اور آنے والی زندگی میں اعتقاد۔ یہ تین چیزیں تقریباً ہر مذہب کا ضروری جزو ہیں۔

ظاہر ہے کہ مذہب اور جبر و استبداد کے درمیان ایسی صورتوں میں ضرور رشتہ بندی ہوگی محنت اور مزدوری کرنے والوں کو اگر یہ یقین دلایا جائے کہ ان کی محنت کی اصلی اُجرت انہیں اگلی دنیا میں ملے گی اور دنیاوی زندگی محض وہم اور مایا ہے۔ اگر ان کو یہ یقین دلایا جائے کہ اپنے مالکوں اور آقاؤں کا حکم ماننا ان کا فرض ہے اور ان کی عدول حکمی گناہ، تو ظلم و تشدد کی آدھی سے زیادہ لڑائی کا فیصلہ مظلوموں کے خلاف مقدر ہو چکا۔ دنیا میں دغابازی اور جھوٹ اور وحشیانہ طاقت اکثر اخلاق اور راستبازی کا جامہ پہن کر حکومت کرتی ہے۔ جو لوگ محنت اور مزدوری کر کے اپنے دست و بازو سے دولت پیدا کرتے ہیں ان کو دبا رکھنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ نہ صرف ان کے خلاف اسلحہ کا استعمال ہو بلکہ ان کے دل و دماغ اس قدر مجبول کر دیئے جائیں کہ وہ اپنے دشمنوں کی پوجا کرنے لگیں اور اندھی مشین

کی طرح سے اپنے دشمنوں کی خدمت گزاری کو اپنا فرض سمجھیں۔

اس کی کیا وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں مذہب ساری دنیا میں رجعت پسندوں اور امیروں اور رئیسوں کے حقوق کی طرفداری کرتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں مذاہب کے بڑے بڑے حامی اور حقوق کے لئے لڑنے والے پہلوان کونسلوں میں جاتے ہیں اور کسانوں کے خلاف مل کر ووٹ دیتے ہیں۔ سرکاری پولیس اور فوج کے ساتھ مل کر بھوکے کسانوں پر گولیاں چلاتے ہیں اور پھر جب اس سے فراغت پا چکتے ہیں تو سوائے مذہب کے اور کسی چیز کا نام نہیں لیتے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ تمام دنیا میں مذہب اور آزاد خیالی کے درمیان ہمیشہ سے جدوجہد ہے؟ گلیلیو کی آنکھیں کیوں نکالی گئیں؟ ڈاروِن پر کلیسا کا عتاب کیوں نازل ہوا؟ سرمد کی گردن کیوں اُڑائی گئی؟ ایسی ہی ہزاروں لاکھوں مثالیں مل سکتی ہیں۔

عقل اور جہالت کے درمیان ہمیشہ سے جدوجہد جاری ہے۔ جوں جوں انسان کی عقل اس کی جہالت پر غالب ہوتی جاتی ہے ظلم و استبداد اور وحشیانہ خصلتیں ہم میں کم ہوتی جاتی ہیں۔ جوں جوں سائنس کی مدد سے ہم اسبابِ زندگی کی فراہمی سہل پاتے جاتے ہیں، جوں جوں زندگی میں آرام کی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ جہالت کے سب سے بڑے قلعہ مذہب کی دیواروں میں شگاف بڑھتے جاتے ہیں۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ انسانوں کے سامنے زندگی کی بیش بہا لذتیں پڑی ہوئی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاتھ معلوم ہوتا ہے شل ہو گئے ہیں۔ ہمارے قدم منزلِ مقصود کی طرف اُٹھتے ہوئے لڑکھڑاتے ہیں۔ ہماری زبان حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے لکنت کرنے لگتی ہے اور ہمارے دل و دماغ پر سحرِ سامری کا سا اثر ہے۔ ہم رات کے اندھیرے میں بھوت پریت سے تو اب نہیں ڈرتے مگر ہماری آنکھیں عقل کی تیز روشنی سے چکا چوندھ ہو جاتی ہیں۔ جس دن مذہب کا بُت ٹوٹے گا۔ اُس دن انسانی تاریخ میں ایک سُنہرا عہد شروع ہو گا۔ یہ خوف کا منوں بھاری پتھر جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کو زندگی کی خوشیوں اور زندگی کے انعاموں سے محروم کئے ہوئے ہے۔ جب ہمارے دلوں سے اُٹھ جائے گا تو ہم عہدِ وحشت کے ایک نہایت مہلک اور مکروہ ترکے سے نجات پا جائیں گے۔

ظ

تصادمِ خیال

کسی فلسفی کا قول ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کے بعد قیدِ علائق کی جکڑ بندیوں کا وہ آپ ذمہ وار ہے۔ اور یہ کہ جس قدر عمر بڑھتی ہے اسی قدر زیادہ انسان معصیت کی گہری تاریکیوں میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ یہ قول بہ استثنائے چند قابلِ تسلیم ضرور ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسان کے مفہوم کو پھیلا کر جب ہم اُن ہستیوں پر حاوی کرتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں جستجوئے معرفت کے لئے وقف کردیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہستیاں افزائشِ عمر کے ساتھ نورِ معرفت میں غرق ہوتی جاتی ہیں۔ ان کے لئے پیرانہ سالی ایک نعمت ہے لیکن اسی فیصدی ایسے لوگ ہیں جو اس کُلیہ کے ماتحت آتے ہیں۔ جس کو ٹیگور اور ورڈز ورتھ نے ایک ہی مرکزِ خیال پر متصادم ہو کر نظم کیا ہے۔ ان دونوں نظموں کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے:۔

ٹیگور

اے وہ کہ جو میرے نام کے ساتھ | زندانیِ جسم خود بنا ہے
دل تیرے فرار کے خطر سے | اک قصرِ حصیں بنا رہا ہے
دیواریں ہیں مائلِ بلندی | دیواروں سے عمر مُدعا ہے
جتنی کہ بڑھی ہے پختہ مغزی | دِل اُتنا ہی ظلمت آشنا ہے

ورڈز ورتھ

ہر طفل کے سن و سال کے ساتھ | ہوتا ہے بلند اُس کا قد بھی
گھرتا ہے پھر اُن مصیبتوں میں | ہوتی نہیں جن کی کوئی حد بھی
ممکن نہیں انحراف اس سے | ممکن نہیں اِس کا کوئی رد بھی
ہے جتنی بھی زائد عمر جس کی | اتنی اُسے معرفت سے کد بھی ہے

شاد عارفی

عشق اور وطن

فرانسس ہارڈی، سر ونٹن جیمپٹن کے عالیشان بنگلہ میں کھڑی تھی۔ گھنٹی بجانے سے پہلے ایک لمحہ کچھ سوچتی رہی۔ خدمتگار نے دروازہ کھولا اور فرانسس کو گہری تیز نظروں سے گھورنے لگا۔

فرانسس بولی" میں سر ونٹن جیمپٹن سے ملنا چاہتی ہوں"۔

خدمتگار نے دروازہ کو اور زیادہ کھول دیا اور بڑے کمرے میں ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا" آپ وہاں تشریف رکھیئے اور مجھے اپنا کارڈ دے دیجئے۔ میں ابھی جواب لاتا ہوں کہ انہیں فرصت ہے یا نہیں"۔

گو وہ خالص انگریزی بول رہا تھا مگر انگریز معلوم نہ ہوتا تھا۔ اُس کی شکل وصورت غیر ملکیوں سے بہت کچھ مشابہ تھی۔ اونچے قد اور بھرے بھرے بدن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ فوجی ملازمت کر چکا ہے۔ فرانسس نے اُسے اپنا کارڈ دے دیا جو اُس نے قدرے جھک کر لیا اور پھر اس طرح اکڑ اکڑ کر چلنے لگا جیسے مغرور فوجی چلا کرتے ہیں۔ ایک منٹ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ وہ واپس آکر کہنے لگا" چلیئے یاد فرمارہے ہیں"۔ وہ فرانسس کو لائبریری میں لے گیا جو کتابوں سے اٹی پڑی تھی۔

سر ونٹن، جن کی عمر تقریباً پچاس برس کی تھی، اپنی کرسی سے اُٹھے اور پہلے زمانہ کی تہذیب کے مطابق خمیدہ ہو کر سلام کیا۔

انہوں نے کہا" مجھے آپ کا خط مل گیا تھا" کیا میں اب پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کیا بات تھی جسے آپ خط میں لکھنا پسند نہ کرتی تھیں"۔

" میں آپ سے ملنا خط لکھنے سے بہتر سمجھتی تھی اور جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ آپ کے لختِ جگر کپتان رابرٹ جیمپٹن کے متعلق ہے"۔

سر ونٹن نے کہا" لیکن میرا لختِ جگر تو مر چکا"۔

جی ہاں۔ اُن کے انتقال کے وقت میں اُن کے پاس موجود تھی"۔

سر ونٹن نے کچھ حیرت اور کچھ شبہ ظاہر کرتے ہوئے کہا" مگر وہ تو جرمنی کے قید خانہ میں

مرا تھا"۔

فرانسس بولی" بہتر یہی ہے کہ میں سب حالات کو تفصیل سے بیان کر دوں۔

"میں بھی جرمنی کے قید خانہ میں تھی۔ لیکن جب حکامِ بالا کو یہ معلوم ہوا کہ میں نرس ہوں تو انہوں نے مجھے افسروں کے ہسپتال میں تبدیل کر دیا۔ وہیں آپ کے لڑکے سے ملاقات ہوئی۔ ہم بہت جلد دوست بن گئے اور کچھ عرصہ کے بعد شادی کا اقرار بھی کر لیا۔ اُس وقت رابرٹ کی بیماری خطرناک نہ تھی اور ڈاکٹروں کو امید تھی کہ عنقریب صحت عود کر آئے گی لیکن بدقسمتی سے بہت سی بیماریاں ایک ساتھ ان کے لئے موت کا پیام لے آئیں"۔

فرانسس خاموش ہوگئی۔ بہ ظاہر رنج نے غلبہ پا لیا تھا۔

سر وٹن کہنے لگے" اپنے دل کو تسلی دیجئے"۔" آپ کی کیا خاطر کروں؟ . . . . شراب لاؤں؟"

"جی نہیں ـــــــــ شکریہ! بات تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ تجہیز و تکفین کے بعد میں ایک جرمن قیدی کے بدلہ میں رہا کر دی گئی۔ میں نے جیل خانہ کے کماندار سے، آپ کے لڑکے رابرٹ کی چیزیں لانے کی اجازت چاہی، تاکہ آپ کے پاس پہنچا سکوں۔ خدا کا شکر ہے اُس نے منظور کر لیا۔ آپ کے نام اس کا ایک خط بھی میرے پاس ہے۔ وہ مجھے ہالینڈ کی سرحد کے راستہ سے لائے جہاں راٹرڈم سے کشتی پر سوار کرا دیا کل لندن میں داخل ہوئی۔ رابرٹ کی چیزیں ہوٹل میں ہیں۔ میرے ساتھ اپنے کسی ملازم کو کر دیجئے، وہ لے آئے گا"۔

سر وٹن نے کہا" میں ایسا نہیں کر سکتا مجھے قوی امید ہے کہ آپ اس غریب خانے کو اپنا گھر سمجھیں گی، خاص طور پر جب تک لندن میں قیام ہے ـــــــ آپ نے میرے لڑکے کے لئے جو کچھ کیا ہے، اس کے صلہ میں ایک خدمت یہ بھی سہی ـــــــ" فقرہ کو نامکمل چھوڑ کر فرانسس بالکل قریب آ گئے اور اپنا ہاتھ آگے پھیلا کر کہنے لگے" سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں، اگر اجازت دیں تو لیڈی چیپلن کو بلا لاؤں"

"شکریہ! اور میں درخواست کرتی ہوں کہ آپ انہیں میرے آنے کی وجہ بتا دیں ـــــــ میں اس واقعہ کو بار بار بیان کرنا نہیں چاہتی"

"اچھی بات ہے ـــــــ میں خوب سمجھتا ہوں"

شام کو فرانسس کی چیمپٹن کے دولت کدہ میں ایک معزز مہمان کی طرح بہت خاطر و مدارات کی گئی کھانے پر دو مہمان اور موجود تھے۔ سر وٹن نے ان کا تعارف اس طرح کرایا کہ آپ جنرل ہیولیٹ ہیں اور آپ پالٹس ہیں لیکن یہ نہ بتایا کہ پالٹس سکاٹ لینڈ کا باشندہ اور محکمۂ سراغرسانی کا انسپکٹر تھا۔

سر وٹن امیر البحری کے ممتاز عہدہ پر فائز تھے۔ اُن کی دن رات حفاظت کی جاتی تھی۔ کیونکہ اہل جرمنی ان سے بہت خائف تھے اور بدگمان بھی۔ خاص طور پر جب سے انہوں نے انگریزی جہاز کے بیڑے کی حفاظت کے لئے ایسی تدابیر اختیار کی تھیں جن سے جرمنی کی آب دوز کشتیاں بجائے اوروں کے ڈبونے کے خود ہی ڈوب جاتی تھیں۔ سب تدبیریں ان کے اپنے دماغ کی ایجاد کردہ تھیں۔ لیڈی چیمپٹن ایک خوبصورت اور شریف خاتون تھیں جو بہت جلد فرانسس کی طرف مائل ہو گئیں۔ اور یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی کیونکہ فرانسس نہ صرف بہت ہی خوبصورت تھی بلکہ بہت اچھے اور دلکش اخلاق کی حامل بھی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد قہوہ کا دور چلا اور سر وٹن فرانسس کے قریب بیٹھ گئے۔ جب خدمت گار دروازہ بند کر کے چلا گیا تو بولے

"ہمارا خدمت گار بھی کتنا عجیب انسان ہے!"

فرانسس نے کہا "جی ہاں اسے دیکھ کر ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ یہ معمولی شخصیت کا آدمی نہیں ہے ــــــ دیکھئے تو فوجیوں کی طرح کیسا مضبوط اور توانا ہے"۔

سر وٹن مسکرانے لگے۔

"اس کا نام والڈر ہے، یہ بلجیم کا رہنے والا ہے۔ وہاں کے بادشاہ نے اسے ایک بہادری کا کام سرانجام دینے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی زخموں کی زیادتی کی وجہ سے یہ بیمار ہو گیا اور فوجی خدمات سے سبکدوش کر دیا گیا۔ پھر یہ بلجیم اور انگلستان کے درمیان خاص پیغام رساں کا کام دینے لگا لیکن اس مرتبہ بھی صحت نے دھوکا دیا اور یہ میرے پاس ملازمت کی تلاش میں آیا۔ میں نے اسے خدمت گار بننے کے لئے کہا کیونکہ بقولِ خود وہ پہلے بھی یہ ملازمت کر چکا تھا اور اُس نے منظور کر لیا۔ لیکن اس کی حیثیت خدمت گار سے بہت زیادہ ہے ــــــ تمام گھر کا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے"۔

فرانسس نے کہا "بے شک بہت کارآمد ہے"۔

جب فرانسس رات کو اپنے سونے کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا کہ ہر ایک چیز صفائی اور قرینہ سے اپنی اپنی جگہ رکھی ہے۔ دو ایک لمحے کھڑی ہوئی صفائی کرنے والے کی تعریف کرتی رہی۔

اپنے سوٹ کیس کو کھلا دیکھ کر اُسے تعجب ہوا۔ اُس کی بھی تمام چیزیں خوش اسلوبی سے سجا دی گئی تھیں

اور کپڑے بدلنے کی میز پر تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ رکھا تھا۔

فرانسس اپنے دل میں خیال کرنے لگی "مجھے یقیناً نہایت عجیب کنیز ملی ہے"۔

اسی اثنا میں دروازہ سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔

فرانسس نے کہا "اندر آجاؤ"۔ اس کا خیال تھا کہ وہی کنیز ہو گی۔

دروازہ کھلا اور والڈر نمودار ہوا۔ اُس کے لبوں پر ایک ایسا تبسم کھیل رہا تھا جو سمجھ میں نہ آتا تھا مگر دکھائی ضرور دیتا تھا۔ اور اُس کی نظریں مقابلہ کی دعوت دے رہی تھیں۔

اُس نے دریافت کیا "آپ کو اپنا کمرہ پسند ہے"؟

"ہاں۔ بے شک"۔ مجھے خادمہ کے اس حسنِ ذوق کی تعریف کرنی چاہیئے، جو اُس نے اس کمرے کے سجانے میں ظاہر کیا"

والڈر نے آہستہ سے کہا "کمرے کو سجایا تو ہے میں نے اور آپ تعریف کرتی ہیں خادمہ کے حسنِ ذوق کی"

"سچ؟ ——— واقعی؟" وہ اپنی رات کی پوشاک جو پلنگ پر قرینہ سے رکھی تھی، دیکھ کر حیران سی ہو گئی۔

"میرا فرض تھا کہ میں یہ سب کچھ کروں"۔

والڈر آہستہ آہستہ چارپائی کی طرف چلا اور تکیہ کے نیچے سے ایک خود بخود چلنے والا پستول نکال کر کہنے لگا "میرے خیال میں آپ شاید اسے پسند نہ کریں کہ اس پر خادمہ کی نظر پڑ جائے"۔

فرانسس چپ چاپ کھڑی، اُس کے چہرہ کی طرف تکتی رہی۔

"میں اسے سوٹ کیس میں بھول گئی تھی، لیکن آپ کو بغیر سوٹ کیس کھولے نہ مل سکتا تھا"۔

"برخلاف اس کے مجھے کامل توقع تھی کہ آپ کے پاس اس قسم کا کوئی ہتھیار ضرور ہو گا"۔

والڈر یہ کہہ رہا تھا اور اُس کی نظریں فرانسس کے دلفریب چہرہ پر جمی ہوئی تھیں ——— یہ نظریں صرف گستاخ ہی نہ تھیں بلکہ ایک خاص مقابلہ کی دعوت دے رہی تھیں۔

"میرے خیال میں اس پستول کا آپ کی خادمہ کو مل جانا اچھا نہ ہوتا۔ میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں، اس لئے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ضرور لیڈی چیپٹن کو بتا دیتی ———"

وہ بات کہتے کہتے رک گیا، گویا آگے فرانسس کو بولنا چاہیئے تھا۔

فرانسس نے کہا آپ بہت عجیب آدمی ہیں۔ سر وٹن آپ کی تعریف کر رہے تھے، لیکن مجھے یہ اُمید

نہ تھی کہ آپ اتنے ہوشیار بھی ہوں گے۔"

والڈر نے ایسی آواز میں جو جذبہ سے سراسر خالی معلوم ہوتی تھی کہا "سر وِلٹن بہت مہربان ہیں وہ ہمیشہ میرے معمولی سے معمولی کاموں کی تعریف کرتے رہتے ہیں لیکن دراصل بات یہ ہے کہ میں نے ایک خاتون کا سوٹ کیس کھولنے سے بہت زیادہ مشکل کام سر انجام دئے ہیں۔"

وہ بول رہا تھا اور فرانسس اُس کی شکل وصورت کا جائزہ لے رہی تھی، وہ اتنا زیادہ خوبصورت نہ تھا ــــ خوبصورت کیا معنی، بدصورت ضرور تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک خاص کشش تھی اور اُس کے چہرے کے نقوش میں ایک عجیب مقناطیسی طاقت تھی ــــ بہت سی عورتیں اس کشش اور مقناطیسی طاقت کو خوبصورتی پر ترجیح دیتی ہیں۔

آخر فرانسس نے کہا "مگر آپ نے مجھے اب تک نہیں بتایا کہ میرے صندوق میں سے اس قسم کا ہتھیار نکلنے کی آپ کیوں اُمید رکھتے تھے؟

اُس نے کہا "کیا اس کا سبب معلوم کرنا ضروری ہے؟ سبب؟ جس سے یہ پستول ملنے کی امید تھی ــــ شاید اس کے ساتھ آپ کو اور باتیں بھی معلوم ہو جائیں۔ خیر سبب تو مجھے معلوم نہیں، میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔"

لڑکی کے چہرہ پر حیرت برسنے لگی اور ایسا بھی معلوم ہوتا تھا کہ اُسے بہت کچھ علم ہے۔ پھر وہ ہنس پڑی۔

"بہت ہی زیادہ غیر معمولی آدمی ہیں آپ۔ آپ کی باتیں سن کر میرے دل میں ایک ناول کے کردار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جو میں نے مدت ہوئی پڑھا تھا۔"

اس مرتبہ فرانسس کی آنکھوں نے اسے مقابلہ کی دعوت دی۔ والڈر لگاتار پانچ سیکنڈ تک اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا رہا۔ پھر بہت ہلکی آواز میں کہنے لگا۔

"ناول کے کردار کی؟"

لڑکی نے کہا "آپ شیطان ہیں مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ بہت جلد مجھ سے گھُل مل جائیں گے، لیکن مجھے یہ اُمید قطعی نہ تھی کہ سر وِلٹن کے گھر کا سب انتظام آپ کرتے ہوں گے۔"

والڈر بولا "شاید آپ کو ہمارے جاسوسی کے محکمے کی طاقتوں کا اندازہ نہیں۔ وطن کے لئے کوئی کام ناممکن نہیں ــــ دشمنوں کو بھی معلوم ہو جائے گا ــــ جو کام میں نے یہاں کیا ہے یہ تو اُس کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا، جو میں نے بلجیم میں سر انجام دیا تھا اور اُس سے تو خاص طور پر

بہت ہی کم ہے جو میں یہاں پورا کرنا چاہتا ہوں ــــــ آپ کی مدد سے"

فرانسس نے دریافت کیا "کیا میرے کمرے میں اس قسم کی باتیں کرنا عقلمندی کا کام ہے"۔

کچھ خطرہ نہیں ــــــ میں جانتا ہوں اس وقت کون کس جگہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی برآمدے میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک کہ مجھے اس کا علم نہ ہو جائے اور پھر میں اس دروازہ سے غائب ہو جاؤں گا"

اُس نے یہ کہتے ہوئے ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا جو چارپائی کے دوسری جانب تھی۔

فرانسس نے کہا "مجھے تو کوئی دروازہ نظر نہیں آتا"۔

"یقین جانو ادہاں دروازہ ہے۔ اور بھی بہت سے ہیں ــــــ اب مجھے چلنا چاہیئے کیونکہ سرونٹن کو دارالمطالعہ میں میری ضرورت پڑے گی، انہیں گرم دودھ کا گلاس پلانا ہے ــــــ یہ اپنے وقت کے بہت پابند ہیں ــــــ یہ انگریز لوگ بہت پابند ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہیں اتنی آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے"۔

چند روز میں والڈر نے فرانسس کی دستاویز کی جو جرمنی کے خفیہ محکمے کی طرف سے ملی تھیں خوب جانچ پڑتال کر لی مگر اپنے متعلق کچھ نہ دکھایا البتہ یہ بتا دیا کہ کس طرح چور دروازے بنائے تھے ــــــ چند کیمیائی اشیاء کے استعمال سے مکانوں کے پرنالوں اور چھتوں میں سوراخ کر کے سرونٹن کو دکھا دئے کہ ان کی مرمت جلد ہونی چاہیئے۔ سرونٹن اپنی بیوی اور ملازموں کو لے کر لندن کے ایک ہوٹل میں چلے گئے اور والڈر کو کام کی دیکھ بھال کے لئے وہیں رہنے دیا۔ اُس نے جو آدمی کام پر لگائے وہ جرمن تھے جن کے متعلق عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ انگریزی نسل سے ہیں۔ اس طرح والڈر کے لئے اس قسم کا کام کرا لینا مشکل نہ رہا۔ فرانسس والڈر کے بتانے کے بغیر بھی یہ باتیں کسی نہ کسی طرح معلوم کر لیتی کیونکہ وہ سرونٹن کے یہ الفاظ سن چکی تھی کہ "والڈر اپنے کام میں بہت ہوشیار ہے اور گھر کا سب انتظام اسی کے سپرد ہے"۔

ایک مہینے کے بعد ہی والڈر نے فرانسس کو بتا دیا کہ وہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے بھیجی گئی ہے'

اُس نے کہا "ہمیں یہاں امریکہ کی فوجوں کو، جو فرانس جا رہی ہیں روکنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ عنقریب ہی امریکہ کی پہلی بحری مہم روانہ ہونے والی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ وہ راستہ جو امریکہ کے جہازوں کا بیڑا اختیار کرے گا معلوم کریں اور پھر ہماری آب دوز کشتیاں اس بیڑے کو برباد کر دیں گی ــــــ اس نقصان سے امریکہ چند مہینوں کے لئے خاموش ہو جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ لڑائی سے بالکل ہی کنارہ کش ہو جائے کیونکہ ریاستہائے متحدہ میں ایک بہت بڑی جماعت جنگ کے خلاف ہے۔ اگر ہم نے یہ کام خیر و خوبی کے ساتھ انجام کو پہنچا دیا تو ہماری خدمات اُن جرنیلوں کے کاموں سے زیادہ شمار کی جائیں گی جو دشمن سے جنگ کے میدانوں

میں لڑ رہے ہیں ـــــ امریکہ کی مدد کے بغیر دشمن لازمی طور پر شکست کھا جائیں گے"۔

فرانسس پوچھنے لگی لیکن ہم کس طرح یہ کام انجام کو پہنچا سکتے ہیں"۔

سر وِنٹن سے راستے کا خاکہ حاصل کر لینے سے۔ ایک نقل سر وِنٹن کے پاس بھی بھیجی جائے گی تاکہ وہ بہتر اور محفوظ تر تجاویز امریکہ کے راہبر کو بتا سکیں ـــــ اس معاملہ میں ہم بہت خوش قسمت نکلے۔ سر وِنٹن بھی اور انگریزوں کی طرح بے حد ضدی ہیں۔ انہوں نے حکومت کے کارکنوں سے کہہ دیا تھا کہ میں امیر البحری کے دفتر میں کام نہیں کر سکتا اس لئے سب کاغذات مکان پر بھیجے جانے لگے۔ اگر نقشے وغیرہ دفتر میں رکھے جاتے تو ہم کچھ بھی نہ کر سکتے۔ ایک اور بات بھی اہم اور قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ جنرل ہیولیٹ جنگجو سپاہی نہیں ہے بلکہ انگریزی خفیہ پولیس کے بڑے افسروں میں سے ایک ہے۔ اور یالٹس "سکاٹ لینڈ یارڈ" کا انسپکٹر ہے ـــــ میں یہ بات عرصۂ دراز سے جانتا ہوں مگر آپ سے بے موقع ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ آپ کو اپنی فکر پڑ جاتی"۔

فرانسس نے ذرا چڑ کر کہا" آپ میری چالاکی اور ہوشیاری کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے۔

اُس کے برعکس میں نے آپ کے متعلق بہت اعلیٰ اور بلند رائے قائم کر رکھی ہے"۔

"شکریہ!۔ مجھے فخر ہے کہ میں آپ کی خوشنودی حاصل کر رہی ہوں"۔

اُس کی آواز میں طنز تھی مگر اس کی وجہ والڈر کی سمجھ میں نہ آسکی۔

والڈر نے کہا "چھوڑیئے بھی اس قصہ کو ہمیں بچوں کی طرح فضول باتوں میں وقت نہیں کھونا چاہئیے، ہم یہاں وطن کی خدمت کرنے آئے ہیں یا اپنے متعلق سوچنے"؟

فرانسس اپنے کمرے میں چلی گئی اور بڑی دیر تک بیٹھی معاملات کی اہمیت پر غور کرتی رہی۔ پھر اپنے دل سے یوں باتیں کرنے لگی۔

"اگر اُسے صرف یہی معلوم ہوتا کہ اس کا مجھ پر کتنا زور ہے ـــــ محبت کا زور ـــــ وہ مجھے دنیا کے ہر حصے میں لے جا سکتا۔ لیکن وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ مجھے اُس سے محبت ہے اور میرا جیاں ہے ـــــ اُسے محبت کے لفظ کے معنی بھی نہیں آتے ـــــ وطن کے لئے ہر قربانی کرنے کے لئے تیار ہے یقیناً ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے، اور سب کچھ وطن کے لئے وقت پڑے پر قربان کر دے گا"

دوسرے دن والڈر نے اُسے بتایا کہ آج راستہ کے خاکے کی نقل دفتر امارت بحری سے سر وِنٹن کے پاس بھیجی جائے گی۔

فرانسس نے دریافت کیا" آپ کو کیونکر پتہ چلا"۔

"اس کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ــــــ میرا خیال تھا کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ ٹیلیفون کی گفتگو کو سمجھ لینا جب کوئی اور بات کر رہا ہو میرے لئے بچوں کے کھیل سے زیادہ نہیں۔ خیر ــــــ اب ذرا غور سے سنیئے آج کی رات میں آپ کو وہ حروف بتا دوں گا، جن کے ملانے سے آہنی تجوری کھل جاتی ہے ــــــ یہ بہت ضروری اور اہم کام ہے۔ اسے آپ سرانجام دیں آپ پر کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں اور مجھے پالٹس بہت مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔"

دوپہر کے بعد چپراسی دفتر سے آ کر خاکے کی نقل اور ضروری کاغذ دے گیا۔ سر وِلٹن نے غور سے پڑھ کر چند ایک نوٹ لکھے اور لوہے کی الماری میں بند کر دیئے اور خود دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

والٹر نے فرانسس کو وہ حروف بتا دیئے تھے جن کے ملانے سے محفوظ آہنی تجوری کھولی جا سکتی تھی اور اُس نے حفظ کر لئے تھے۔ وہ الماری میں سے نقشہ نکالنے لگی ہی تھی کہ ایک اجنبی کی آمد نے ان دونوں کے کام میں کچھ وقت کے لئے رکاوٹ ڈال دی۔ یہ اجنبی سر وِلٹن کا چھوٹا لڑکا تھا جو میدانِ جنگ سے بیماری کی چھٹی لے کر آیا تھا۔

والٹر نے جب وہ آرتھر کو لائبریری میں بٹھا کر سر وِلٹن کے پاس جا رہا تھا فرانسس کے کان میں کہا "ہمیں رات کے کھانے کے بعد تک انتظار کرنا پڑے گا۔" آپ چپ چاپ اور اچانک اس کمرے میں چلی جائیے اور خود کو مہمان ظاہر کیجئے۔"

جب فرانسس لائبریری میں داخل ہوئی تو آرتھر نے ہاتھ پھیلائے اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر کہا "آپ وہی نرس ہیں جو مجھے ڈیو اے ولی میں ملی تھیں۔"

فرانسس نے اسے پہچان تو لیا مگر اپنی کسی حرکت سے اس بات کو اُس پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

وہ بولی "آپ غلطی پر ہیں۔" میں کبھی ڈیو اے ولی نہیں گئی۔ ہاں البتہ جرمنی کی قیدی ضرور رہی ہوں۔"

خوش قسمتی سے ٹھیک اُس وقت سر وِلٹن آ گئے اور انھوں نے فرانسس کا تعارف اپنے لڑکے سے کرا دیا۔

آرتھر نے کہا "آپ سے ملنا اور بھی زیادہ باعثِ خوشی ہے۔ تعجب ہے جب بھائی صاحب اس جہان سے رخصت ہونے لگے تو اُن کے پاس ایک انگریز خاتون تھیں۔"

اُس رات کو کھانا کھاتے ہوئے آرتھر چیمپٹن، فرانسس سے بہت اچھی طرح پیش آیا اور فرانسس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کسی اور سے باتیں کرتے کرتے یک لخت گھبرا کر اُسے گھورنے لگ جاتا تھا۔

فرانسس نے دل میں خیال کیا "بالکل ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس بات کا یقین نہیں دلا سکا کہ اُس

مجھے کبھی ڈربو اے دلی میں نہیں دیکھا"

کھانا کھانے کے بعد سب مرد سوائے سرونٹن کے بلیرڈ کھیلنے کے کمرے میں چلے گئے اور سر ونٹن معمل میں چلے گئے۔ فرانسس اور لیڈی ونٹن بیٹھی ہوئی باتیں کرتی رہیں۔ دس بجے کے بعد وہ بھی حسب معمول اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئیں اور اُن کے کمرے سے نکلتے ہی والڈر آموجود ہوا۔

اُس نے فرانسس سے کہا" میں پالٹس کو دھوکا دے کر دوسری طرف لے جاتا ہوں۔ جنرل ہیولیٹ اور نوجوان افسر بلیرڈ میں محو ہیں۔ اُن کی طرف سے بھی کوئی خدشہ نہیں، ہاں پالٹس کمرے کے سامنے کسی کی تلاش میں دبے پاؤں پھر رہا ہے اور وہاں سے لائبریری کی ہر ایک چیز کو آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ میں کھڑکیاں بند نہیں کرسکتا اور اُن کے پردے بھی نہیں گرا سکتا کیونکہ اگر کوئی بُری بات خدا نہ کرے پیش آئی تو آپ صرف انہی کھڑکیوں سے بھاگ سکتی ہیں۔ اگر ایسا ہُوا تو کھڑکی سے کود کر اپنے کمرے میں چلی جائیے اور اگر حسب اُمید سب ٹھیک رہا تو معمولی طور پر بالاخانہ سے اپنے کمرے میں چلی جائیے۔ وہاں آکر میں آپ سے نقشہ لے لوں گا۔ اطمینان اور آہستگی سے کام کیجئے کامیابی عطا کرنے والا خُدا ہے۔ میں پالٹس کو کمرے کی دوسری طرف لے جارہا ہوں، جب آپ مجھے یہ کہتے ہوئے سنیں" وہ ہے وہاں جھاڑی میں" تو آپ خاموشی کے ساتھ لائبریری میں جاکر اپنا کام شروع کر دیجئے"۔

فرانسس بیٹھک میں بیٹھی رہی یہاں تک کہ اُس نے والڈر اور پالٹس کے ہال سے نیچے اترنے کی آواز سُنی اور جب وہ سامنے کے دروازہ سے نکل گئے تو چپکے سے لائبریری میں چلی گئی۔ آہنی تجوری کو دیکھنے کے لئے کمرے میں کافی روشنی تھی۔ اُس نے اپنا ہاتھ حروف کے ڈائل پر رکھ لیا اور والڈر کی آواز کا انتظار کرنے لگی۔ اُسے اندیشہ تھا کہ ڈائل پر انگلیوں کے نشان نہ رہ جائیں کیونکہ اس میں پہچانے جانے کا خوف تھا اس لئے اُس نے دستانے پہن رکھے تھے۔

والڈر کی آواز آئی اور فرانسس اپنا کام کرنے لگی، لیکن ابھی آہنی تجوری کو کھولا بھی نہ تھا کہ کسی کے ہال پر سے اترنے کی آواز کان میں آئی۔ فرانسس سمجھ گئی کہ پالٹس آرہا ہے اور فوراً کُھلی کھڑکی سے پھلانگ کر بالاخانہ پر چلی گئی۔ جب وہ دوڑ رہی تھی تو اُس کے جوتے کی ایڑی کسی چیز میں پھنس گئی اور وہ گرتے گرتے بچی۔ ایک جھٹکے سے اپنا پاؤں تو نکال لیا مگر جوتے کی ایڑی علیحدہ ہوگئی۔ ٹھہر کر ایڑی اُٹھانے کی جرات کیونکر کرتی تعاقب کرنے والا سر پر آموجود ہوتا وہ بھاگتی رہی حتےٰ کہ اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔

کسی کی پیچھے دوڑنے کی آواز سُن کر فرانسس سمجھ گئی تھی کہ یقیناً پالٹس ہے اور ڈرنے لگی تھی کہ خواہ اُس نے نہ بھی دیکھا ہو پھر بھی ایڑی میرا جرم ثابت کر دے گی۔ جوتا لئے حیران پھر رہی تھی کہ کہاں چھپائے۔ اتنے میں چور

دروازہ کھلا اور اُس میں سے والڈر آنکلا۔ اُس نے کہا۔

"یہ جُوتے مجھے دے دیجئے اور آپ دوسرا جوڑا پہن لیجئے۔" وہ دو ایک منٹ میں یہاں آنے والے ہیں۔

جُوتے لے کر والڈر اُسی چور دروازے سے غائب ہو گیا۔

فرانسس نے دوسرے جوتے پہنے ہی تھے کہ دروازہ سے کھٹ کھٹ کی آواز آنے لگی۔ جاکر دروازہ کھولا اور یالٹس کو کھڑے پایا۔

"کیوں کیا بات ہے، مسٹر یالٹس؟" اُس نے ایسی سنجیدہ آواز سے کہا جیسے سنجیدہ اس کے چہرے کے نقوش تھے "آپ ہانپ رہے ہیں!"

یالٹس نے اُسے سر سے پاؤں تک خوب تاڑ تاڑ کر دیکھا۔

"گھر میں چور تھا، مس ہارٹی! مگر تھی عورت ـــــ میرا خیال ہے وہ اس راستہ سے آئی ہے آپ نے تو نہیں دیکھی، نہ آواز سُنی ـــــ یا سُنی ہے؟"

"نہیں۔ میں تو کوئی دس منٹ ہوئے یہاں آئی ہوں ـــــ میں لیڈی چیمپٹن کے پاس گئی تھی یہ دریافت کرنے کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، مگر وہ سو رہی تھیں۔ ابھی وہاں سے آئی تھی کہ آپ نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا ـــــ"

یالٹس نے نہایت تیزی سے کہا "تو شاید آپ کے کمرے میں گھُس گئی ہو جب کہ آپ کمرے میں موجود نہ تھیں کہیں یہیں چھُپ رہی ہوگی۔"

فرانسس نے اُس کی عقلمندی کی دل ہی دل میں تعریف کی۔ یالٹس اُس کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ مگر چور کے لئے نہیں۔ بے ایڑی کے جُوتے کے لئے۔

اُس نے ایک خاص لہجہ میں کہا "اچھی طرح تلاش کر لیجئے، مسٹر یالٹس! اغلب ہے کہ چارپائی کے نیچے سے مل جائے۔"

وہ دل مضبوط کئے کھڑی رہی اور یالٹس کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ گو سب سے پہلے اُس نے جُوتوں پر نظر ڈالی جو فرانسس پہن رہی تھی کہ آیا دونوں کے ایڑیاں ہیں۔

جب یالٹس نے ایک چھوٹی سی الماری کھولی جس میں ایک کم سن بچہ بھی نہ چھُپ سکتا تھا تو وہ دل ہی دل میں ہنسنے لگی اور ساتھ ہی یہ خیال کرنے لگی کہ اگر والڈر جوتے نہ لے جاتا اور اسے مل جاتے تو کیا ہوتا ـــــ"

آخر یالٹس نے کہا "وہ کہیں بھی ہو مگر اس وقت اس کمرے میں نہیں۔ معاف کیجئے مس ہارٹی میں نے

بے وقت آپ کو بڑی تکلیف دی۔"

فرانسس پالٹس کی چالاکی پر ہنسنے لگی، کیونکہ اُس کے یہ الفاظ "جب آپ کمرے میں موجود نہ تھیں اور اس وقت" کچھ اور معنے بھی رکھتے تھے۔

اُس نے کہا "میں آپ کے تشریف لانے سے بہت خوش ہوئی۔ چور یہیں چھپا رہتا"

وہ کمرے سے باہر چلی گئی اور اس طرح پالٹس کو تلاشی لینے کا دوسرا موقع دے دیا اور اس نے کوشش بھی کی مگر جیسا کہ فرانسس کو یقین تھا اُسے کچھ نہ ملا، یہاں تک کہ پستول کو بھی والڈر نے زینہ کے نچلے حصہ میں چھپا رکھا تھا۔

فرانسس بیٹھک میں گئی فوراً ہی والڈر بھی بہ ظاہر کھڑکیاں بند کرنے اور پردے گرانے کے لئے وہاں آ گیا۔

اُس نے کہا "پالٹس کو ہم دونوں پر شبہ ہے"۔ وہ جنرل ہیولیٹ سے کہہ رہا تھا اس کے متعلق۔ ــــــ آدھی رات گذرنے پر آپ ایک مرتبہ پھر کوشش کیجئے۔ اس دفعہ آپ ضرور کامیاب ہو جائیں گی کیونکہ وہ دونوں میرا تعاقب کر رہے ہوں گے"۔

والڈر باہر گیا ہی تھا کہ آرتھر چیمپٹن داخل ہوا۔

اُس نے کہا "میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں مس ہارڈی" بہت ضروری باتیں"۔

فرانسس نے کہا "شوق سے فرمایئے"

"آپ کیوں نہیں مان لیتیں کہ آپ وہی نرس ہیں جسے میں نے ڈیولے ولی میں دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے اس انکار میں کوئی خاص راز ہے"

فرانسس معاملہ کی اہمیت پر بہت تیزی سے غور کرنے لگی۔ اُس نے خیال کیا کہ اگر اب بھی انکار کر دیا تو آرتھر کو یقین نہ آئے گا اور ممکن ہے اس کا شبہ اتنی ترقی کر جائے کہ یہ اپنے والد کو اور سب کو بتا دے اس لئے اقرار کر لینا ہی بہتر ہے۔

"جی ہاں میں وہی نرس ہوں جسے آپ نے ڈیولے ولی میں دیکھا تھا اور میں وہی نرس ہوں جو آپ کے بھائی کے پاس جب وہ زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے، موجود تھی۔ میں اب تک اس بات کے ماننے سے کیوں انکار کرتی رہی اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دراصل برطانی خفیہ پولیس کے محکمے کی ایجنٹ ہوں۔ اور اگر یہ بات ظاہر ہو جائے تو میری یہاں کی ساری محنت اکارت جائے گی ــــــ مجھے آپ کی نیک ذات سے قوی اُمید ہے کہ آپ ایک شریف آدمی اور سچے محب وطن کی حیثیت سے اس راز کو افشا نہ کریں گے"۔

فرانسس اُس کے قریب آگئی اور اپنی انگشتری دکھانے لگی۔

"یہ ہے میری ملازمت کی نشانی، اب تو اعتبار کرتے ہیں مجھ پر؟"

نوجوان افسر نے پرجوش انداز میں کہا "مجھے آپ پر اعتبار ہے"۔ اُس کی آنکھیں کچھ اس طرح چمکنے لگیں کہ فرانسس کو راز افشا ہونے کا خوف بالکل نہ رہا ——— صاف ظاہر تھا کہ اُسے فرانسس سے محبت ہوگئی تھی اور بے انتہا محبت۔

فرانسس نے پوچھا "آپ وعدہ کرتے ہیں کہ کسی کو نہ بتائیں گے"

"ہاں میں صدقِ دل سے وعدہ کرتا ہوں"

وہ اپنی محبت کا اظہار الفاظ میں کرنے سے باز رہنے کی بے سود کوشش کرتا رہا۔ اُس نے اپنے والد سے ملنے کے متعلق ہچکچاتے ہوئے کچھ کہا اور چلا گیا۔

جب دروازہ بند ہؤا والڈر پھر پردوں میں سے نکل آیا۔

اُس نے ترشی سے کہا "آپ اس نوجوان سے محبت کرتی ہیں اور اس کے لئے مادرِ وطن سے دغا کریں گی"

فرانسس والڈر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔

"بیوقوف نہ بنیئے والڈر! بیوقوف نہ بنیئے ——— تمام دنیا میں ایک آپ ہیں جس سے میں محبت کرتی ہوں ——— تعجب ہے کہ آپ میرے اس راز سے اب تک کیوں بے خبر رہے"۔

والڈر کی آواز میں نرمی آگئی اور نظر میں بھی۔

اُس نے کہا "مجھے اس بات کا اب یقین ہؤا ہے۔ میں آپ کی نظروں سے دھوکا نہ کھا سکا گو وہ سچی اور ———"

اُس نے فرانسس کو اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ بھی نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس سے لپٹ گئی۔

"مجھے بھی آپ سے محبت ہے۔ مجھے بھی آپ سے محبت ہے" وہ یہ الفاظ کہتا رہا اور اُس کی آنکھیں وفورِ مسرت سے چمکنے لگیں۔

کچھ دیر کے لئے اِس نئی دنیا میں جو صرف انہیں سے تعلق رکھتی تھی پہلی مرتبہ قدم رکھ کر وہ اپنے فرض کو بھی بھول گئے اور محبت کی کہانی ——— وہی پرانی کہانی دہرانے لگے جو ہمیشہ دو آدمیوں کو نئی معلوم ہوتی ہے پھر والڈر نے ایک آخری بوسہ لیا اور اپنے فرض کی تکمیل کی طرف لوٹا۔

اُس نے کہا "آدھی رات کو کوئی اندیشہ نہ کرنا اس مرتبہ آپ کے کام میں کوئی خلل انداز نہ ہوگا۔ وہ میری بکھ

بھال کر رہے ہوں گے اور میں انہیں لائبریری سے بہت دور لے جاؤں گا۔"

وہ حسبِ معمول کمرے سے خاموش رفوچکر ہوگیا۔

جب فرانسس اکیلی رہ گئی تو اس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا اور سامنے دیوار میں آنکھیں گاڑ دیں مگر کچھ دیکھ نہ رہی تھی۔

"مجھے اس سے محبت ہے ـــــ ضرور ہے" وہ خود کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "مگر یہ بات نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے بچنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کرنی چاہیئے۔"

یہ الفاظ ایک ایسی ہستی کے منہ سے نکلنا جو چند لمحے پہلے ـــــ ہاں صرف چند لمحے پہلے زمین کی اس بہترین بہشت کے مزے، جو صرف محبت عنایت کرسکتی ہے، لُوٹ چکی ہو کتنا تعجب خیز ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب فرانسس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے ہوتا تھا۔ وہ چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے فرطِ انبساط سے تمتما رہا تھا جب والڈر نے اُسے آغوش میں لے رکھا تھا اب مردہ اور زرد سا نظر آتا تھا۔ اور وہ آنکھیں جو محبت کے جوش سے چمک رہی تھیں اب خوف اور مایوسی کی وجہ سے ڈراؤنی اور سیاہ معلوم ہوتی تھیں۔

فرانسس کرسی پر سے اُٹھی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"یہاں سے ضرور چل دینا چاہیئے" وہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ "باغ میں سے ـــــ گلی میں پہنچنے کی دیر ہے، پھر میں محفوظ ہو جاؤں گی ـــــ ہاں بس ایک یہی راستہ ہے۔"

اُس نے گھنٹے پر نظر ڈالی۔ بارہ بجنے میں صرف چار منٹ باقی تھے۔ مکان سے کسی قسم کی کوئی آواز نہ آرہی تھی جس سے اُس نے یہ اندازہ کرلیا کہ والڈر جنرل ہیولیٹ اور پالٹس کو چکمہ دے کر دوسری طرف لے گیا ہے وہ ایک پراسرار اسٹول کے پاس گئی اور ایک سپرنگ کو ہلا کر اس کے تلے میں سے گیتوں اور غزلوں کی فہرست کو ایک طرف کیا اور اپنا پستول نکال لیا اور خوب غور سے دیکھ کر اپنے لباس میں چھپا لیا۔

ادھر گھنٹہ نے بارہ بجائے اور ادھر فوراً وہ لائبریری کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس مرتبہ جیسا کہ والڈر نے وعدہ کیا تھا کوئی اس کے کام میں حارج نہ ہُوا۔

چند لمحوں میں اُس نے راستے کے نقشہ کی نقل نکال لی اور بڑی احتیاط سے اپنی جیب میں چھپا کر آہنی الماری کو بند کر دیا اور خود تیزی سے ہال میں سے ہوتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہاں سے دو کھڑکیاں باغ میں کھلتی تھیں۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور بھاگنے لگی۔

چند گز دوڑنے کے بعد اسے محسوس ہُوا کہ کوئی اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اب فرانسس نے مُڑ کر دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی رفتار اور زیادہ تیز کردی۔ باغ کے چاروں طرف خاردار جھاڑیوں کی باڑ تھی

اُس نے خیال کیا کہ وہاں جھاڑیوں میں چھپ جاؤں گی اور تعاقب کرنے والے کو کچھ پتا نہ چل سکے گا لیکن وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچی ہی تھی کہ کسی نے اُس کے شانے کو پکڑ کر ہلانا شروع کیا۔

فرانسس اب سمجھی کہ یہ آرتھر چیمپٹن ہے۔

اُس نے ہانپتے ہوئے کہا "آپ اس طرح بچ کر نہیں جاسکتیں آپنے مجھے خوب دھوکا دیا تھا —— میں اب سمجھا کہ آپ کون ہیں —— آپ جرمنی کی جاسوس ہیں اور والڈر آپ کا ساتھی ہے۔

فرانسس اندرونی طور پر بہت خائف تھی مگر جب اُس کی آنکھیں نوجوان افسر سے چار ہوئیں اس نے اپنے بُشرے سے کسی قسم کے خوف کا اظہار نہ ہونے دیا۔

اُس نے نہایت حقارت آمیز لہجہ میں کہا "آپ نشہ میں ہیں یا پاگل ہو گئے"۔

"نہ میں نشہ میں ہوں اور نہ پاگل" آرتھر چیمپٹن نے غصہ میں کہا ہاں آپ کے حسن نے پاگل بنادیا تھا مگر اب میرے ہوش وحواس بالکل درست ہیں —— آپ کو میرے ساتھ مکان کو واپس چلنا ہوگا"

اُس نے یہ کہہ کر فرانسس کا بازو پکڑ لیا لیکن فوراً ہی والڈر جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔ اُس نے آتے ہی اپنا ہاتھ اُٹھایا اور پستول کی گولی آرتھر چیمپٹن کی پیشانی میں جا کر لگی۔ نوجوان افسر بغیر کسی چیخ پکار کے زمین پر گر پڑا۔ والڈر نے اُسے کھینچ کر جھاڑیوں میں چھپا دیا اور خود فرانسس کے قریب آکر کہنے لگا۔

"جلدی چلئے۔ وقت بہت کم ہے"

فرانسس کا ہاتھ پکڑ کر وہ گھر کے باہر والے دروازے سے اور پھر ایک چور دروازہ سے اندر لے گیا اور دونوں گودام میں پہنچ گئے۔

"آج کی رات کے کام سے ہم نے زندگی کی تمام مسرتوں کو اپنے قابو میں کر لیا" والڈر کہنے لگا "جرمنی میں پہنچ جانے پر فوراً ہماری شادی ہو جائے گی۔ پھر ہم آرام سے شادی کے بعد کا پُرلطف مہینہ اپنی "عشرت منزل" میں گزار دیں گے"۔

وہ باتیں کرتا جاتا تھا اور ساتھ ہی پوشیدہ اسپرنگوں کے بٹن بھی دبا رہا تھا۔ فوراً دیوار کا ایک حصہ سرک کر دوسری جگہ ہو گیا اور ایک غار بن گیا جس میں بے تار برقی کاسٹ لگا ہوا تھا۔

اُس نے کہا "وہ نقشہ لائیے —— مجھے دے دیجئے"۔

فرانسس نے کہا ایک منٹ ٹھہرئیے۔ اب تک میں نے جو کام کیا اُس میں ان ہدایات سے کام نہیں لیا جو مجھے بڑے دفتر سے دی گئی تھیں —— مجھ سے کہا گیا تھا کہ جو نقشہ وغیرہ تم حاصل کرو وہ ہیلر بلیکر کے

سوا جو خفیہ محکمہ کا ممتاز افسر ہے، کسی کو نہ دینا۔

والڈر مسکرانے لگا۔

"مجھے آپ کی عقلمندی اور ہوشیاری کا اعتراف ہے۔ آپ اب تک خود کو دلیر ایجنٹ ثابت کرتی رہی ہیں۔ اور اب آپ کی اس بات سے ظاہر ہے کہ آپ قابل اعتماد بھی ہیں اور چالاک بھی۔ یہاں تک کہ جس سے آپ کو بے حد اُنس ہے اُس کے لئے بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ——— اچھا میں ہی بلیکر ہوں"۔

اُس نے چاندی کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکال کر دکھائی اور کھول کر اندر سے لوہے کا ایک ٹکڑا نکالا جس پر ایک لفظ کندہ تھا۔

"اُس انگوٹھی سے کتنا مختلف ہے یہ جس سے آپ نے نوجوان افسر کو اُلّو بنایا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ اصلی ہے"۔

والڈر نے کہا "اب نقشہ لائیے۔ آپ کی جیب میں چپک رہا ہوگا۔ کھو تو نہیں گیا؟"

اُس نے خاکا لے کر بے تار برقی کے آلے پر اپنا کام شروع کر دیا۔

"والڈر! ٹھہریئے!" فرانسس چلائی۔

والڈر نے کچھ سختی سے کہا "وقت ضائع نہ کیجئے"۔

فرانسس نے زور دیتے ہوئے کہا "آپ کو ٹھہرنا پڑے گا یہ پیغام نہیں بھیجا جا سکتا"۔

"آپ کا مطلب کیا ہے؟"

"میرا مطلب ——— یہ ہے کہ مجھے آپ سے محبت ہے اور میں جانتی ہوں کہ آپ کو بھی مجھ سے محبت ہے۔ اس خاکے کو پھاڑ ڈالیئے اور آیئے اس جگہ سے دونوں بھاگ چلیں"۔

والڈر نے نفرت سے کہا "پاگل ہو گئی ہیں؟"

میں پاگل نہیں خدا کے لئے سُنیئے، مجھے آپ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں لیکن میں انگریزی نسل سے ہوں اور برٹش سیکریٹ سروس کی ممبر بھی۔ اگر آپ نے اس پیغام کے دینے کی ذرا بھی کوشش کی تو میں آپ کو جان سے مار ڈالوں گی"۔

فرانسس نے یہ کہتے ہی اپنا پستول نکال لیا اور والڈر کی طرف شست باندھ لی۔

والڈر نے کچھ جواب نہ دیا اور کسی کو مطلع کرنے کے طور پر اُس آلہ پر کچھ کہنے لگا۔

"خطرہ" جوش میں اُس کی زبان سے نکلا۔

فرانسس جانتی تھی کہ قریبی جگہ پر کسی جرمن نے اس کا مطلب سمجھ لیا ہے۔ اب حیل و حجت کرنے کا وقت

نہیں۔ایک طرف والڈر کی محبت ہے اور دوسری طرف وطن کا عشق۔

فرانس نے گولی چلادی۔

والڈر کی انگلیاں آلے پر سے پھسل گئیں۔ ایک لمحہ کے لئے وہ بے تار برقی کی مشین پر بہت مضحکہ خیز طریقہ سے جھک گیا اور پھر فرش پر گر پڑا۔ فرانس نے پستول کو جس میں سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا ایک طرف پھینک دیا اور خود والڈر کے قریب بیٹھ گئی۔ نہایت آہستگی سے اُس کا سر اُٹھایا اور اپنے زانو پر رکھ لیا اور روتے ہوئے بولی

"مجبوراً آپ سے ایسا سلوک کرنا پڑا"

والڈر کے لبوں پر ایک دلفریب تبسم کھیلنے لگا۔

اُس نے کہا "میں نے آپ کو معاف کیا۔ میں بھی ایسا ہی کرتا اگر آپ کی جگہ ہوتا ــــــــ میں آپ کا انتظار کروں گا ــــــــ عشرت منزل میں ــــــــ"

(ترجمہ)

ظفر واسطی
(شاہ آبادی)

مُغنّیہ

تیرے عشق افروز اور جاں سوز نغموں کی قسم ــ تیرے خوش آہنگ اور دِلدوز نغموں کی قسم
تیرے صہباریز، وجد آموز نغموں کی قسم ــ تیرے کیف آور طرب اندوز نغموں کی قسم

جب دِلوں کو سحرِ نغموں سے تڑپاتی ہے تُو ــ جب رگوں میں زندگی کا خون دوڑاتی ہے تُو
بزم کو جب راگ کی حدّت سے گرماتی ہے تُو ــ غرق ہو کر سحرِ موسیقی میں جب گاتی ہے تُو

گیت کے طوفاں میں بہہ جاتی ہے ساری کائنات
ایک نغمہ بن کے رہ جاتی ہے ساری کائنات

اختر انصاری دہلوی

غزل

وُہ الفت آفریں ہونگے نئے جب تیغ کیں ہونگے
جفاو جور کے انداز سارے دلنشیں ہونگے

کسی کے جانستاں غمزے کچھ ایسے دلنشیں ہونگے
کہ رفتہ رفتہ شمشیرِ قضا کے سب قریں ہونگے

ثبوت اپنی وفاداری کا دیں گے قابلِ تحسیں
وہی جو کوچۂ جاناں میں پیوندِ زمیں ہونگے

وجودِ اہلِ محفل پر عدم ہی کا گماں ہوگا
نہ ہوگا کوئی محفل میں جو وہ محفل نشیں ہونگے

بہارِ دامنِ گلچیں دکھائیں گے مرے آنسو
ٹپک کر خون کے قطرے طرازِ آستیں ہونگے

وفا کی قدر کیا ہو اُن کی چشمِ بے مروّت کو
جفا وہ کرتے جائیں گے مگر نادم نہیں ہونگے

تجلی اُن کی ہو محدود اگر مجھ تک تو بہتر ہے
کہ میں خلوت نشیں ہونگا جو وہ محفل نشیں ہونگے

سبکروحوں کو سیرِ عالمِ امکاں سے کیا مطلب
نہ زیرِ آسماں ہونگے نہ بالائے زمیں ہونگے

لبِ مشتاق عرضِ شوق میں طوفاں اُٹھائیں گے
اگر پرسش پہ مائل اُن کے پائے نازنیں ہونگے

غنابِ اُن کا نہ روکے گا ہمارے شوقِ سجدہ کو
ہمیں وہ اذن دیں گے اگرچیں بر جبیں ہونگے

کسی دن کوئی گستاخی کسی سے ہو ہی جائے گی
کسی کے عشوۂ پنہاں جو یوں شوق آفریں ہونگے

کلامِ حضرتِ غالب ہے وحشت فیض کا خرمن
جہاں اہلِ سخن ہونگے اُسی کے خوشہ چیں ہونگے

رضا علی
وحشت کلکتہ

کہکشاں

آسماں ہے محفلِ ہستی میں مے خانہ مرا　　　کہکشاں میری صراحی چاند پیمانہ مرا

آغا حشر کاشمیری

زمانہ قدیم میں ستاروں کے اُس عظیم الشان دُور و دراز مجموعے کے متعلق جسے ہم کہکشاں کہتے ہیں طرح طرح کے افسانے بیان کئے جاتے تھے۔ ستاروں اور سیّاروں کی حقیقت کو تخیّل کی بلند پروازیوں سے بیان کرنے میں یونانیوں کو کمال حاصل تھا۔ مظاہر قدرت کی ہر شئے کے لئے کوئی نہ کوئی رومانی افسانہ اُن کے پاس ضرور موجود تھا۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ کہکشاں آسمان میں ایک روزن ہے جس کے ذریعہ سے صفحۂ ہستی پر نور کی بارش کی جاتی ہے، یا یہ کہ کہکشاں فرشتوں کی آمد و رفت کے لئے ایک راستہ ہے جو بہشت کو جاتا ہے۔ خیالات کی یہ بلند پروازی یُونانیوں ہی تک محدود نہ تھی۔ ہر ملک میں قدرتی مناظر کے متعلق تخیلی افسانے موجود تھے۔ فرانسیسیوں کا خیال تھا کہ کہکشاں ان شعلوں کی روشنی ہے جنہیں فرشتے اپنے ہاتھوں میں لئے کھڑے رہتے ہیں اور انسان کو بہشت کا راستہ دکھاتے ہیں۔ سوئیڈن کے باشندوں کا ایک جدید شاعرانہ تخیّل ہے کہ سیلا مے اور ذُولامیتھ کا باہمی عشق کہکشاں کی بنیاد کا باعث ہُوا۔ یہ دونوں دو متفرق ستاروں پر رہتے تھے چنانچہ ایک ہزار سال کی محنت میں انھوں نے کہکشاں کا پُل تیار کر لیا تھا جس کے ذریعے سے وہ ایک دوسرے سے ملاقات کر سکتے تھے۔

چینیوں اور جاپانیوں کا خیال تھا کہ کہکشاں ایک دریا ہے۔ اِن مُلکوں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ لائبرا[1] اور اکوئیلا[2] نے اپنی شادی کے بعد اپنے فرضِ منصبی کی ادائی میں کوتاہی شروع کر دی۔ اُس کی سزا میں دیوتاؤں نے ان دونوں کے درمیان یہ دریا حائل کر دیا اور انہیں صرف سال کے ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کو ملاقات کرنے کی اجازت دی۔ یہ تاریخ جولائی کے مہینے میں واقع ہوتی ہے۔ اگر رات کے وقت مطلع صاف ہو تو کہکشاں کو ہم بہت وضاحت سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ ابابیلیں آسمان میں بہت بلندی تک اُڑ کے چلی جاتی ہیں اور اسی جانب کو اُڑتی ہیں جدھر کہکشاں

---

[1] و [2] ستاروں کے نام ہیں۔

کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ اِن چڑیوں کو کہکشاں کی نرم روشنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جاپانی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چڑیاں دریائے کہکشاں پر ایک پُل بنا لیتی ہیں جس کے ذریعہ سے لائرا اور اکوئلا میں ملاقات ہو سکتی ہے۔ مگر برسات کے زمانہ میں جب بارش ہوتی رہتی ہے اور آسمان پر گرد و غبار ہوتا ہے تو کہکشاں نظروں سے چھُپ جاتی ہے اور ابابیلیں آسمان کی جانب نہیں اُڑتیں۔ ایسے موقعہ پر جاپان اور جزیرہ کوریا کے باشندے ان چڑیوں کو ڈھیلے مار مار کر اُڑا دیتے ہیں گویا ان کو اپنا فرضِ منصبی یاد دلانے کے لئے۔

شاعروں نے بھی کہکشاں کے متعلق خیال آرائیاں کی ہیں۔ ملٹن کہکشاں کی یوں تعریف کرتا ہے:۔

"کشادہ سڑک جس کی خاک سونے کی ہے، اور جو ستاروں سے مل کر بنی ہے وُہ ستارے جنہیں تم ستارے سمجھتے ہو"۔

اووِڈ کہکشاں کو ایک شاہراہ سے مشابہت دیتا ہے۔ جس کی اینٹیں ستاروں سے بنی ہیں۔

اکثر صاف و شفاف راتوں کو میں اِس آسمانی دریا کی سیر کرنے لگتا ہُوں۔ ہاں محض جنبشِ نظر سے چشم زدن میں اِس پُر اسرار منظر کی گہرائیوں میں گُم ہو جاتا ہوں۔ آہ! لائیرا اور اکوئیلا ایک دوسرے کے لئے بیقرار ہوں گے۔ مگر سیلامے اور دولامینھ کا کیا حال ہوگا؟ ہزار سال کی محنت کے بعد اُنھوں نے یہ پل تیار کیا ہے! کہکشاں واقعی کوئی پُل ہے؟... فرشتوں کی آمد و رفت کا کوئی راستہ ہے؟ گُنبدِ گردُوں میں روزن ہے جس کے ذریعہ ہم عالمِ بالا کی سیر کرتے ہیں؟ یا شاعروں کے خیالاتِ پریشان کی وادی ہے؟ جذبات نورانی اجسام کی شکل میں مُبدّل ہو گئے ہیں؟..... تخیّل کا سرچشمہ؟ ...... نورانی دریا جس میں ستاروں کی کشتیاں بہہ رہی ہیں؟..... میں نہیں کہہ سکتا۔

ممکن ہے کہ کہکشاں فضائے بسیط میں ایک وسیع میدان ہو جس میں نقرئی پھُولوں کی کھیتیاں آباد ہوں اور اِن کھیتوں کا کِسان خود خدا ہو!

آرزُو جلیلی

اصلاحِ ادب

(۴)

بہ سلسلۂ اشاعت جولائی

نثر

فقرہ ـ میاں سائیس گاڑی کو کھڑی کرو۔
اصلاح ـ میاں سائیس! گاڑی کھڑی کرو۔
وجہ ـ گاڑی کو کھڑی کرو میں "کو" کا استعمال غلط ہے۔ اگر "کو" ضرور لکھنا ہو۔ تو "گاڑی کو کھڑا کرو" لکھیں گے۔ اسی طرح "ضروریات کو پورا کرو" اور "ضروریات پوری کرو" صحیح ہے۔
فقرہ ـ اجی قبلہ! میں آپ کا تابعدار ہوں۔
اصلاح ـ اجی قبلہ! میں آپ کا خادم ہوں۔
وجہ ـ "تابعدار کی ترکیب غلط ہے۔ لفظی معنوں پر قیاس کیا جائے تو اس کے معنی "آقا" یا "مخدوم" کے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خادم کا محل ہے۔
فقرہ ـ انجمن کے عہدہ داران اور دوسرے ملازمان کو ایثار سے کام لے کر حسب استطاعت اس کی مالی امداد کرنی چاہیئے۔
اصلاح ـ انجمن کے عہدہ داروں اور ملازموں کو ایثار سے کام لے کر حسب استطاعت اس کی مالی امداد کرنی چاہیئے یا عہدہ داران و ملازمانِ انجمن کو ایثار سے کام لے کر حسب استطاعت اس کی مالی امداد کرنی چاہیئے
وجہ ـ "عہدہ داران" اور "ملازمان" میں فارسی قاعدے سے جمع بنائی گئی ہے۔ اور اس جمع کو اردو میں فارسی ترکیب کے بغیر استعمال کرنا غلط ہے۔
فقرہ ـ میں اس مقدمے میں آپ کی باعزت بریت پر مبارکباد دیتا ہوں۔
اصلاح ـ میں اس مقدمے میں آپ کے باعزت بری ہونے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

وجہ۔ "بریت" کوئی لفظ نہیں البتہ "برات" صحیح ہے۔

فقرہ۔ ڈپٹی کمشنری کے عہدے پر آپ کی تقرری کا مژدہ سُن کر دلی خوشی حاصل ہوئی۔

اصلاح۔ ڈپٹی کمشنری کے عہدے پر آپ کے تقرر کا مژدہ سُن کر دلی خوشی حاصل ہوئی۔

وجہ۔ "تقرری میں "ی" کا اضافہ غلط ہے۔

فقرہ۔ وہ معترف ہے کہ اس نے یہ کتاب تالیف کرتے وقت عربی کی متعدد بیش بہا کتابوں سے استفادہ حاصل کیا ہے

اصلاح۔ وہ معترف ہے کہ اُس نے یہ کتاب تالیف کرتے وقت عربی کی متعدد بیش بہا کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

وجہ۔ استفادہ میں خود حصول کے معنی مضمر ہیں۔ لہذا اس کے آگے حاصل لکھنے کی ضرورت نہیں اسی طرح "استمداد حاصل کرنا" غلط اور "استمداد کرنا" صحیح ہے۔

فقرہ۔ دنیا کو عالمِ وجود میں آئے ہوئے لکھوکھا سال گزر چکے ہیں۔

اصلاح۔ دنیا کو عالمِ وجود میں آئے ہوئے لاکھوں سال گزر چکے ہیں۔

وجہ۔ لکھوکھا سراسر غلط ہے۔ جسے محض عوام بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس سے سخت احتراز چاہیئے۔

فقرہ۔ لندن انگلستان کا دارالخلافہ ہے

اصلاح۔ لندن انگلستان کا دارالحکومت ہے۔

وجہ۔ دارالخلافہ (دارالخلافت) ایک خاص لفظ ہے۔ جو خلافت اسلامیہ کے زمانے میں وضع کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں "دارالحکومت" "پایۂ تخت" وغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہونے لگا۔ اب خلافت تو قائم نہیں رہی اس لئے اگر یہ لفظ صرف اسلامی سلطنتوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے تو انسب ہے۔

یہ میری ذاتی رائے ہے باقی حضرات کو اختیار ہے

فقرہ۔ میں مدت سے اس کتاب کا متلاشی تھا۔ الحمدللہ کہ آج آپ کی بدولت اس کے مطالعے کا موقع مل گیا۔

اصلاح۔ میں مدّت سے اس کتاب کی تلاش میں تھا۔ الحمدللہ کہ آج آپ کی بدولت اس کے مطالعے کا موقع مل گیا۔

وجہ۔ عربی دان ہندیوں نے ترکی کے لفظ "تلاش" سے عربی قاعدے کے مطابق متلاشی بنا لیا۔ جسے عوام اندھادھند استعمال کرنے لگے۔

میں نے اردو کے صرف ایک مسلّم الثبوت ادیب و مستند انشا پرداز کی تحریر میں یہ لفظ دیکھا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسے غلط العام قرار دے کر فصیح ٹھہرا لیا جائے یا غلط العوام سمجھ کر ترک کر دیا جائے۔ اس

کے جواب میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر اس کی بجائے ایک ہی لفظ لکھنا ہو تو "تلاشی" یا "متجسس" حسب موقع لکھنا چاہیئے۔ مرزا داغ مرحوم فرماتے ہیں ؎

جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہو چشم شوق — خلوت میں اس طرح ہو۔ کہ خلوت گزیں نہیں

جب فصیح الملک مغفور جیسے مستند شاعر و زبان داں نے "تلاشی" کو "تلاش کرنے والا" کے معنوں میں لکھا ہے تو کسی کو اس کی فصاحت میں گنجائش کلام نہیں ہونی چاہیئے۔ میں بلا وجہ بعض الفاظ کو ترک کر کے زبان کا دائرہ تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ میری دلی آرزو ہے کہ ہماری زبان وسیع و عالمگیر ہو جائے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس کے بلند و برتر معیارِ فصاحت میں فرق نہ آنے پائے۔ لہٰذا جاہل عوام کے خود تراشیدہ لغو الفاظ و تراکیب کی سختی سے مخالفت کر رہا ہوں اور یہی میرے اس مضمون کی علت العلل ہے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ مہنّد الفاظ اردو قواعد کے سانچے میں ڈھال کر مختلف طریق پر استعمال نہ کئے جائیں بلکہ میں اس کا زبردست مؤید ہوں۔ جس طرح عربی دان فارسی والوں نے عربی قواعد کے خلاف "عتاب" سے "معتوب"۔ "خان" سے "خوانین" اور "خاتون" سے "خواتین" وغیرہ بنا لیا ہے۔ اسی طرح ہماری زبان کے عربی داں حضرات نے بھی "ارقام" اور "تہدیہ" وغیرہ کے الفاظ تراش لئے ہیں۔ جو اب بیش بہا جواہرات بن کر اردو کے خزانے میں جگمگا رہے ہیں۔ جب عربی والوں نے فارسی سے "ترزبان" کا لفظ لے کر اسے "ترجمان" بنا لیا۔ اور پھر اسے اپنے قواعدِ زبان کے سانچے میں اس طرح ڈھال لیا کہ اس پر تعریب کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یعنی باب دَحرَجَ یُدَحرِجُ پر لا کر اس سے ترجمہ اور مترجم جیسے لفظ بنا لئے۔ تو مستند اردو والوں کو "ارقام" اور "تہدیہ" جیسے الفاظ بنانے کا کیوں حق حاصل نہیں۔ بے شک پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن بات صرف یہ ہے کہ جو غلط الفاظ عوام ہی تک محدود رہے اور غلط العام کے درجے تک نہیں پہنچ سکے وہ بدستور غلط کے غلط رہے اور جنہیں غلط ہونے کے باوجود یہ درجہ مل گیا وہ درست و صحیح قرار پائے مثلاً "منشی"۔ "مجرّب" اور "مرغّن" غلط العوام ہونے کے باعث غلط اور "ارقام" اور "تہدیہ" غلط العام ہونے کی وجہ سے صحیح ہیں۔ اگر "تلاشی" کو بھی غلط العام کا درجہ دے دیا جائے تو یہ بھی بلا تامل صحیح و فصیح قرار پا سکتا ہے۔

نظم

شعر

مشتاق سب ہیں بدر سے زیادہ ہلال کے
دنیا میں قدر داں نہیں صاحب کمال کے

اصلاح

مشتاق سب ہیں بدر سے بڑھ کر ہلال کے

دنیا میں قدر داں نہیں صاحب کمال کے

وجہ۔ زیادہ (زیادۃ) عربی ہے۔ لہذا ہندی الفاظ کی طرح اس کی "یا" کا اخفا غلط ہے۔

شعر۔ وہ شوہر کے لئے قربان ہوئی تھی جوشِ الفت میں
اگرچہ رنج و غم سے ہو رہی تھی زرد سر تا پا

اصلاح۔ وہ شوہر کے لئے قربان ہوئی تھی جوشِ الفت میں غم و اندوہ سے گو ہو رہی تھی زرد سر تا پا

وجہ۔ "اگرچہ" میں "ہ" کا اعلان غلط ہے۔

شعر۔ کیوں حریصِ منتِ دو نان ہوں...
ہم نہیں مکھی ہیں دسترخوان کی

اصلاح۔ کیوں حریصِ منتِ دو نان ہوں...
ہم کوئی مکھی ہیں دسترخوان کی

دوسرے مصرع میں "ہیں" حشو ہے۔ اصلاح سے سارا شعر پر زور ہو گیا۔ جملۂ خبریہ سے جملہ انشائیہ کہیں بہتر ہوتا ہے۔

شعر مدرسہ یا دیر تھا۔ کعبہ تھا یا بُت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

غلطی۔ "بُت خانہ" اور "صاحب خانہ" میں ایطا رجلی ہے۔ لہذا قافیہ غلط ہے۔
اگرچہ "واں" اس لحاظ سے کہ یہ شعر شعرائے متقدمین میں سے ایک صاحب کا ہے۔ قابلِ گرفت نہیں۔ لیکن آج کل متروک ہے۔

شعر ٹوٹ کر شیشۂ دل کیونکہ جڑے مشکل ہے
نہ ادھر کا کوئی ٹکڑا نہ اُدھر کا ٹکڑا

غلطی۔ "کیونکر" کی بجائے "کیونکہ" لکھنا غلط ہے۔ اس کی جگہ "کیسے" بھی آ سکتا ہے۔ اگرچہ وہ "کیونکر" کے برابر فصیح نہیں۔

شعر سرفرازی فلک پست ہے اس کے آگے
چشمِ بد دُور بہت بالا ہے ایواں تیرا

غلطی۔ پہلے مصرع میں "سرفرازی" کی "یا" کا مشدد ہو جانا خلافِ فصاحت ہے۔ دوسرے مصرع میں "بالا" کا "الف" گر گیا ہے۔ جو سراسر غلط ہے۔

ہندی کے کسی لفظ کے آخر سے "واؤ" یا "یا" گرا دینا جائز مگر "الف" گرانا خلافِ فصاحت ہے لیکن ہندی کے سوا کسی دوسری زبان مثلاً فارسی یا عربی وغیرہ کے لفظ کے آخر سے "واؤ" یا "یا" گرانا ناجائز اور "الف" گرانا قطعاً غلط ہے۔

شعر
پیروی سنت نبوی کی میسر ہوتی
داغِ دل پھر تو مرا لالۂ گلشن ہوتا

غلطی۔ نبوی میں "با" مفتوح ہے۔ ساکن نہیں۔

شعر
یہ شوخ سی نگاہیں
یہ حسن کی شعاعیں
معذور ہیں ادائیں
مجبور ہیں جفائیں

غلطی "نگاہیں" اور "شعاعیں" میں ایطارجلی ہے۔ لہذا قافیہ غلط ہے۔ "ادائیں" اور "جفائیں" کا قافیہ درست ہے۔ لیکن یہاں چاروں قافیوں کا درست ہونا ضروری ہے۔

شعر
نظم عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے
ہنس کے رباب اُٹھالیا نغمہ زنِ الست نے

خامی۔ عبودیت کو یار مشدّد سے باندھنا چاہیئے۔

شعر
تمہارے لطف و عنایت کا واہ کیا کہنا
کہ جس کا درد کیا وہ ہی درمند ہُوا

خامی۔ "وہ ہی" کی جگہ "وہی" لکھنا فصیح ہے۔

شعر
اے تاجِ دلربائی
غارت گرِ خدائی
اے مستِ سکرزائی
وہ کیفیت ہے چھائی

خامی۔ اردو زبان اور علی الخصوص نظم کی لطافت۔ نزاکت اور متانت "مستِ سکرزئی" جیسی ثقیل و مضحکہ خیز تراکیب کی متحمل نہیں۔

نشتر جالندہری

راحت کدہ

(۱)

سخت بے پروا تھا آخر ناگہاں مارا گیا
عشق کی یورش میں قلبِ ناتواں مارا گیا

آہ! منزل تک نہ پہنچا کاروانِ آرزو
راہ ہی میں کارواں کا کارواں مارا گیا

تھا دلِ بے چارہ تنہا اور ہجومِ رنج و غم
جانے اس گھمسان میں اب وہ کہاں مارا گیا

سوزِ اُلفت ہی پہ تھا جس کا مدارِ زندگی
سوزِ اُلفت ہی سے وہ آتش بجاں مارا گیا

جس کے نغموں میں تھی رقصاں موجِ صہبائے نشاط
آہ! وہ رنگیں نوا جادو بیاں مارا گیا

جس کے دم سے محفلِ احباب تھی خلدِ نشاط
حیف ہے وہ جانِ بزمِ دوستاں مارا گیا

یاد ہے تم کو بھی وہ "صہبائی" رنگین مزاج
کارزارِ عشق میں وہ نوجواں مارا گیا

(۲)

اب کیا ہوئیں وہ حُسن کی رنگیں ادائیاں
چُپ ہو گئی ہیں عشق کی جادو نوائیاں

جانے وہ کیا ادا تھی کہ دل میں اُتر گئی
میرے لئے ہیں راز تری دلربائیاں

جب تیری بے وفائی پہ بھی تجھ پہ مر مٹے
پھر کیا کہیں کسی سے تری بے وفائیاں

تجھ پہ اثر نثار دل و جاں بھی کر دیا
پھر بھی غریب سے ہیں وہی کج ادائیاں

اثر صہبائی

غزل

ہر روز سیلِ اشک بہا کی مرے خدا | دولت مری تو مفت لٹا کی مرے خدا

دل اب بھی اُس کے قول و قسم بھولتا نہیں | ظالم نے اس پہ کتنی جفا کی مرے خدا

اچھا ہے اعتبار کسی کا نہیں رہا | اُس نے بھی آہ مجھ سے دغا کی مرے خدا

دیتی رہی وہ چشمِ فسوں گر مجھے فریب | در پردہ مجھ پہ تیغ چلا کی مرے خدا

یہ انتہائے جور و جفا آہ کیا کروں | یہ ابتدا ہے مہر و وفا کی مرے خدا

آنکھوں سے کیا لگاؤں کہ ملتی نہیں مجھے
ڈھونڈے سے خاک اُس کفِ پا کی مرے خدا

حامد علی خاںؔ

محفلِ ادب

نیندوں کی بستی

خاموش۔ خاموش
اے دوست خاموش

اے رونے والے اے فاتحہ خواں
یہ سرزمیں ہے شہرِ خموشاں
سوئے پڑے ہیں ہستی کے طوفاں
غم ہائے امروز فردا کے ارماں
ناکامی دوش
خاموش۔ خاموش

خاموش۔ خاموش
اے دوست خاموش

اے جنبشِ لب ہاں ہاں خبردار
باطل نہ ہو جائے یہ عہد زنہار
ہیں آج یک جا عجز اور پندار
پہلو بہ پہلو مجبور و مختار
ہشیار و مدہوش
خاموش۔ خاموش

خاموش۔ خاموش
اے دوست خاموش

بیٹھے ہیں مل کر سانجھ اور سویرا
دھندلی ضیا ہے ہلکا اندھیرا
اس وقت کوئی تیرا نہ میرا
اترا ہوا ہے رُوحوں کا ڈیرا
آنکھوں سے روپوش
خاموش۔ خاموش

خاموش خاموش
اے دوست خاموش

خاموشیوں ہیں گم ہیں صدائیں
بیکار ہیں سب یہ التجائیں
کس کو پکاریں کس کو بلائیں
یہ بیوی بچے یہ باپ مائیں
ہیں پنبہ در گوش
خاموش۔ خاموش

(نظام المشائخ)

بعض ساز اور اصطلاحاتِ موسیقی

ہم ذیل میں بعض عربی اور یوروپین سازوں کے نام درج کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ یوروپین سازوں کے نام عربی ناموں سے مشتق ہیں یا ان کی بگڑی ہوئی صورت ہیں۔

عربی نام	یوروپین	عربی نام	یوروپین
اَلعُودُ	A lute = (al-ud)	صنوج (مجیرہ یا جھانجھ) = (Sunuj)	Sonajas =
قِطارُ	Guitar = (qitar)	الدّف (مربع) = (Al-duff)	Adufe
رَبابَ	Rebec = (Rabab)	بندیر (مدور) = (Bandair)	Pandore
نَقّارَہ	Naker = (Naqqara)	قَصْعَۃ (ایک قسم کا عربی ڈھول)	Qasa
		سولھویں صدی میں فرانسیسی queece ہوا اور اب فی زمانہ caisse کہلاتا ہے	
طَبل	Taber, tabor, tabel, (Tabl)	النفیر (نفیری) (Nafir)	anafil
انفار (بہت سی نفیریوں کا یکدم بجنا)	Tanafore (anfar)	السرنائی (Al-surnay)	Dulcaya
قَانُونُ	Canon (Qanoon)	الشّقیرہ (Al-shaqira)	Eschaquiel
زَمرُ	Shawm (Zamr)		

معلوم ہوتا ہے کہ یوروپ میں جلترنگ کا نام بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ چنانچہ چھٹی صدی سے نویں صدی تک کا زمانہ ادبیات یوروپ میں (جلترنگ) کے ذکر سے خالی ہے مگر نویں صدی سے بارھویں صدی تک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے، کہ عربوں نے واقعی عربی اور ہوائی دونوں قسم کے ارغنوں بنائے تھے اور آبی ارگن سے مراد "جلترنگ" ہے (نگار)

اڈیسن اور اُس کا طریق عمل

اڈیسن کی ایجاد کا حال اس قول سے معلوم ہوگا کہ اس سے کسی نے ایجاد کرنے کا راز دریافت کیا اور خود ہی سائل نے کہا کہ غالباً الہام (انسپریشن) ہوتا ہے۔ اڈیسن نے جواب دیا کہ ایک حصّہ انسپریشن اور سو حصّہ پرسپیریشن (یعنی پسینہ) یعنی ایک خیال آنے سے ہی ایجاد نہیں ہوتی بلکہ سو حصہ پسینہ بہایا جائے تب ایجاد ہوتی ہے۔

اڈیسن اپنے ذہن میں ایک خیال پیدا کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعلق تجربات کیا کرتا تھا۔ اس کے دار العمل میں دن رات کام ہوتا تھا۔ یعنی اس کے اسسٹنٹ تجربات کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھتے تھے۔ رات کا کام کرنے والے صبح ہوتے ہی دن کے کام کرنے والوں کو تجربات سپرد کر دیتے تھے۔ صبح یہ خود آکر تمام مشاہدات کا مطالعہ کرتا تھا۔ بعض وقت کوئی اسسٹنٹ کوئی نئی تجویز پیش کرتا تو وہ اکثر یہ کہہ دیا کرتا تھا کہ فلاں زمانہ میں یہ تجربہ ہو چکا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا۔

اسے کھانے پینے کی کبھی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اگر یہ آخر عمر میں شادی نہ کرتا تو غالباً اب سے بہت پہلے محض اپنی صحت کی طرف بے توجہی کی وجہ سے مر چکا ہوتا۔ مگر اس کی بیوی اس کی ہر بات کا لحاظ رکھتی تھی اکثر یہ تجربہ خانہ میں ہی سو گیا

کرتا تھا۔ اگر کبھی گھر جاتا تھا تو صبح ۷ بجے ہمیشہ تجربہ خانہ میں آجایا کرتا تھا۔ آخری عمر میں سات بجے شام کو اکثر گھر چلا جاتا تھا۔ ۱۲ بجے ہلکا سا ناشتہ کرتا تھا اور اخبار وغیرہ پڑھ کر اور ملاقاتیوں سے مل کر ایک بجے پھر اپنے مطالعہ کے کمرے یا دارالعمل میں آجاتا تھا۔

مشرقی اقوام کے برخلاف ایڈیسن کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم لوگ اپنے اجداد سے یقیناً زیادہ عقلمند ہیں اور ہماری آئندہ نسلیں ہم سے زیادہ عقلمند ہوں گی۔ انسان کی عمر سائنس اور حفظانِ صحت کے ماتحت، اصول کی پیروی اور بے توجہی کی وجہ سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ انسان کی پیدائش کے وقت عمر مقرر نہیں ہوتی (جامعہ)

ترکی ملک الشعراء عبدالحق حامد

عبدالحق حامد صرف ایک پر زور تمثیل نگار نہ تھا بلکہ بیانیہ شاعری پر بھی اُسے اعلیٰ درجہ کی قدرت حاصل تھی۔ اپنی نظم صحرا اور بلدہ میں اس نے اُس عشق کا اظہار کیا ہے جو اُسے سبزہ زاروں، مرغزاروں دھیمی ہوائیں چلنے والے درختوں اور ان کی ترنم ریزیوں کے ساتھ تھا، ان چیزوں کو وہ خاص الہامات سمجھتا ہے اور ان کے مقابلے میں شہروں کے تصنعات اور زر پرستیوں کو نام دھرتا ہے۔ حامد سے پہلے کسی ترکی شاعر نے نہ تو دیہات کی فضا کا اتنا گہرا اثر اپنے قلب پر کیا تھا۔ اور نہ اس زور اور قدرتِ کلام کے ساتھ اسے بیان کیا تھا۔ ادبیات کی یہ صنف خالص مغربی الاصل ہے۔ اور اس کی خاطر حامد نے مشرقی عروض کو چھوڑ کر فرانسیسی طرز کے مخلوط قوافی استعمال کئے ہیں۔ حامد کا اس طرح لوچ کے ساتھ دیہاتی فضاؤں کی تصویریں آتارنا خاص کر اس وجہ سے اور زیادہ قابل توجہ ہے کہ وہ شہروں کی زندگی، ان کے شور شغب اور اُن کی دلچسپیوں کا بہت شوقین تھا چنانچہ اپنی نظموں کے ایک مجموعہ دیوانیلی کلیرم" (میرا جنون شباب) میں اس نے انہی چیزوں کو بیان کیا ہے۔

اس نے ایک منظوم قصہ غرام (الجذبۂ عشق) بھی لکھا ہے جس میں مذہب، تصوف، فنا وغیرہ کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

اپنی پہلی بیوی کی وفات کا جو بیروت میں واقع ہوئی تھی، حامد پر اتنا اثر ہُوا کہ
اور اس کے اعزہ و اقربا کو کامل چالیس دن تک اُس کی نگرانی اور دیکھ بھال کر
کے عنوان سے اپنی بیوی کا ایک نہایت پُر اثر اور دل ہلا دینے والا مرثیہ کہا
سوز و گداز کا عنصر بہت افراط سے تھا، اس زمانہ میں تو مقبول نہ ہو سکا بلکہ
اور معزز جگہ پیدا کرلی ہے۔

مطبوعات

نرالی اُردو۔ مصنفہ مسٹر ایم اے مغنی دہلوی بی اے۔ حجم ۱۲۸ صفحات چھوٹی تقطیع قیمت ۸؍
مینجر دفتر نرالی اردو" کوچہ دکھنی رائے دریا گنج دہلی سے طلب کیجئے

ہم جناب مغنی کو اس ادبی کارنامے پر مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے بازاری اور دیہاتی لوگوں کی زبان کتابی صورت میں جمع کر کے اردو ادب کی ایک اہم خدمت انجام دی۔ یہ اپنی طرز کا غالباً پہلا مجموعہ ہے اور اس سے قبل "کرخنداروں" کی زبان کہیں یکجا اور جامع صورت میں طبع نہیں ہوئی۔ نہ صرف زبان کے لحاظ سے یہ کتاب قابلِ قدر ہے بلکہ اس میں سوقیانہ معاشرت اور نفسیات کے جو مرقع مزاح کی چاشنی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں وہ بھی اپنی ایک الگ قیمت رکھتے ہیں۔ ذیل میں ہم ناظرین "ہمایوں" کے تفننِ طبع کے لئے اس کتاب سے ایک اقتباس درج کرتے ہیں:-

آگو آگو دیکھیو ہوتا ہے کیا

جَد سے کانگریس میں عورتوں نے شرکت کی ہَیگی بھی وِس کے ہر جلسہ میں جانا شروع کر دیا یار لوگ تو ہر وَخت یہی چھیڑ خانی کرتے ہیں کہ وئی خلیفہ تم تو آنکھیں سینکنے کے لئے کانگریس کے شوقین بنے ہو۔ مگر اصلیت میں بات یہ ہے کہ کتنے شرم کی بات ہے کہ اپنے ملک کو آزاد کروانے کے کارن عورتیں تو سب جتن کریں اور ہم مرد ہو کے وِن کے پیچھو رہ جائیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کسُو کو بھی میری بات کا اتین نئی آیا لیکن ناٹی سفہ والا تو بولا کہ وئی خلیفہ جبر تم چاہئے جو کہو میں تو وِسی دن جلسہ میں جاتا ہوں جبس دِنا کوئی عورت تقریر کرتی ہے اور میرے پہ ہی کیا منحصر ہے اب تو سب لوگ باگوں نے یہ معمول بنا رکھا ہے۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا جس دن جلسہ میں کوہی عورت نئی آتی وِس دِن بس خاجٹ میدان ہوتا ہے اور سوائے گنتی کے دو چار آدمیوں کے یا کچھ لٹھ بند سپاہیوں کے کوہی بھی نئی، ...ار لوگوں کے کانوں میں یہ بھنک پڑ جاتی ہے کہ آج کوہی عورت لکچر دے گی وِس دن جلسہ میں خوب ... خدا وِن سے سمجھے یہ پلیس والے سارا مزا کر کرا کر دیتے ہیں نئی تو ہر روز جلسہ ہُوا کرے ... ہو جائے۔ میں نے کہا کہ بے ناٹی میں تو تجھے السیانی سمجھتا تھا مگر اب معلوم ... بی حایا پیدا ہوا ہوگا۔ وہ بولا خلیفہ میں تو بے حایا ہی سہی مگر وِن کو کیا ... س جا بیٹھتے ہیں اور جَد وہ بیچاریاں بولتی ہیں تو وہ وِن کو ٹکٹکی باندھے ... رے کہ وئی جلسہ میں کیا کیا سُنا تو جُواب دیں گے کہ ہنگامہ میں کچھ

سنائی ہی نہ دیا ہاں بولنے والیاں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر تھیں اور زرد ساڑھی والی سب سے پر بین تھی وِس کے ناک نخشہ کی عورت تو ہم نے آج تو ڑی دیکھی بھی نئی اور سچ پوچھو تو وِسی کی وجہ سے جلسہ میں ہمارا دل بھی لگ گیا ورنہ ہمیں اِتّا وخت کہاں . . . . . میں نے کہا دیکھ وئی ناٹی تجھے اوروں سے کیا غرض۔ وہ اپنی قبر میں سوئیں گے تو اپنی قبر میں۔ وہ بولا خلیفہ کچھ بھی ہو ہم تو محظ دیکھنے کے گنے گار ہیں۔ میں نے کہا اچھا وائی جو مجاز چاہئے کر مگر یہ سمجھ لے کہ تیری حرکتوں کا انجام کار ٹھیک نئی۔

خیر وِسے خوب وصیّت کر کے میں گھر پونچا واں جا کے خبر لگی کہ صُبو کو جو کانگریس کے پچاس ساٹھ آدمی پکڑے گئے تھے وِن کا ماتم کرنے کے لئے آج شام کو جلسہ ہوگا۔ شام ہوتے ہی میں بھی جلسہ میں جا پونچا۔ آدمی پہ آدمی ٹوٹے پڑ رہا تھا اور ایک عورت اشٹیج پر کھڑی بول رئی تھی۔ جاں چک میری نظر ناٹی پہ پڑی جو وئیں برابر میں کھڑا وِس بچاری کو بُری طریوں گھور رہا تھا۔ اِتنے میں واں پلیس بھی آن دھمکی میں نے دل میں کہا کہ وئی اب کام بھاری ہے یہ سوچ میں تو فولدی سے واں سے کھسک گیا اور گھر پونچ کر کوئی آدھ گھنٹے بھی بمشکل سے کمر لگائی تھی کہ اِتّے میں ناٹی کے باوا چیختے وے آئے اور بولے کہ ذری چل کے دیکھو تو تمارے یار کی کیا حالت ہو رہی ہے میں منادی کرتا تھا کہ بے جلسہ میں مت جایا کر مگر نئی مانا اور اپنا مغز پھڑوا کے ہی چین لیا میں وِن کے ساتھ ہو لیا۔ ناٹی اپنی بیٹھک میں سر باندھے پڑے لیٹا تھا مجھے دیکھ کے بولا جس درونہ نے میرے لاٹھی ماری ہے میں وِس کو جانتا ہوں ذرا اچھا ہو جاؤں پھر اگر میں نے بھی درو غہ جی کو سرِ بازار پٹخنا نہ سُنایا تو میں بھی اصل کا جنا نئی۔ میں نے کہا وئی ناٹی جانے دو یہ فضول باتیں مت کرو۔ جو ہونا تھا ہو لیا آئندہ کو کان پکڑو۔ چلتے وخت میں نے چپکے سے کہا دیکھا پیارے میں نئی کہتا تھا کہ کسی کو بُری نیّت سے نہ دیکھے اور کی ماں بہن کو اپنی ماں بہن سمجھے۔ ناٹی ہے تو ایک ہی ملالی بولا کہ جیسے اور کی ماں بہن اپنی ماں بہن ویسے اور کی بیوی اپنی بیوی۔ یہ بھی تو کہو۔ میں نے کہا پیارے تیری اسی نیت نے تو تجھے آج یہ پھل دیا ہے کہ تو سر باندھے پڑا ہے اور ابھی تو بقول کسو شاعر کے آگو آگو دیکھیو ہوتا ہے کیا۔

یورپ میں دکھنی مخطوطات ۔ مولفہ مولینا نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ حجم سات سو صفحات اور طباعت نفیس۔ قیمت غیر مجلد للعہ۔ مجلد عہ روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔ جناب مولف سے ملیگا گوڑا۔

ہاشمی صاحب نے یہ کتاب لکھ کر تاریخ ادب اردو کی بیش بہا خدمت یورپ میں مشہور کتب خانوں سے استفادہ کیا اور جہاں کہیں کسی دکھنی مصنف بیش بہا تاریخی مرقع (یورپ میں دکھنی مخطوطات) میں شامل کر لیا۔ مقد جناب مولف کا پیش نامہ کتاب کے متعلق ضروری معلومات کا حامل ہے۔

منفرق اردو اور فارسی نسخوں کے اختلافات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ شائقین ادب کو مولف کی اس جاں کاہ محنت کی داد دینی چاہیئے۔ پانچ روپے میں تاریخ وادب کے یہ جواہرات گویا کوڑیوں کے مول ہیں۔

مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی کی کتابیں

ذیل کی کتابیں جامعۂ ملیہ دہلی نے نہایت حسن اہتمام سے شائع کی ہیں۔ معنوی محاسن اور ظاہری حسن جامعہ کی کتابوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

دنیا کے بسنے والے۔ چھوٹی تقطیع حجم بہتر صفحات۔ دنیا کے مختلف اقطاع کی قوموں کے حالات سید بشیر حسین زیدی بی اے (کینٹب) نے نہایت دلاویز پیرائے اور سلیس زبان میں لکھے ہیں۔ بچوں کی معلومات میں اس سے بیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔ قیمت ۸/

محنت۔ بچوں کے لئے سبق آموز اخلاقی ڈراما حجم ۷۴ صفحات قیمت ۴/

کھیتی۔ اسی صفحات کا یہ اخلاقی ڈراما پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن نے لکھا ہے "محنت" کی طرح یہ بھی نہایت سلیس اور پر لطف زبان میں لکھا گیا ہے۔

گناہ کی دیوار۔ یہ ڈراما اشتیاق حسین صاحب قریشی ایم اے نے لکھا ہے۔ یہ بھی اخلاقی اصلاح کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اور مصنف نے اپنا نقطۂ نظر نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ طلبہ کے علاوہ عام شائقین بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ قیمت ۸/

ہمزاد۔ یہ بھی جناب قریشی کا ڈراما ہے۔ گناہ کی دیوار کی طرح یہ ڈراما بھی نہایت کامیاب ہے۔ پلاٹ سادہ ہے اور ڈرامے کو غیر ضروری عناصر سے پاک کر کے اردو میں ایک عمدہ مثال قائم کی گئی ہے۔ بہت دلچسپ ہے۔ قیمت ۶/

کلام جوہر۔ یہ مولانا محمد علی مرحوم (بانئ جامعۂ ملیہ) کا مجموعۂ کلام ہے۔ مقدمہ مولوی عبدالماجد نے لکھا ہے۔ مولانا کا سچے درد میں ڈوبا ہوا کلام کسی تنقید کا محتاج نہیں ہیں ... ہے کہ اس نے مولانا ئے مرحوم کا کلام یکجا شائع کر کے ایک اہم ادبی ...
صفحات چھوٹی تقطیع قیمت ۸/

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ نومبر ۱۹۳۲ء





تصاویر: (۱) ایک مصری کنیز (۲) بابل کا ایک "شادی بازار" (۳) ماں اور بچہ (۴) محنت

قیمت فی پرچہ ۶ر — ڈیلر بک سٹال پر ۸ر — چندہ سالانہ للعہ مع محصول ڈاک

جہاں نما

مرزا اعجاز حسین مرحوم

"ہمایوں" کا گزشتہ پرچہ پریس میں جاچکا تھا کہ ہمیں مرزا اعجاز حسین کے انتقال کی اندوہناک خبر موصول ہوئی۔ مرزا اعجاز حسین ایک مرنجاں مرنج بزرگ تھے۔ صاحب کمال ہونے کے باوجود انہیں شہرت طلبی کی ہوس نہ تھی۔ ان کے دل میں سچا اسلامی درد تھا۔ انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور اس لحاظ سے اہلِ پنجاب ان کا جتنا ماتم بھی کریں بجا ہے۔ گزشتہ صدی کے اواخر ہی میں جب مرحوم لاہور میں بحیثیتِ متعلم مقیم تھے اُن کی شخصیت شہر میں نمایاں ہوگئی تھی۔ ہر مجلس میں لوگ اس نوجوان کی پُرخلوص اور صادقانہ جذبات میں ڈوبی ہوئی تقریر سننے کے لئے بے تابی سے منتظر نظر آتے تھے۔

ڈگری حاصل کرنے کے بعد مرحوم نے انبالہ میں وکالت شروع کی اور اس کے ساتھ ہی قومی خدمت کے لئے تعلیمی کام کا آغاز بھی کیا۔ مسئلۂ تعلیم سے انہیں خاص دلچسپی تھی چنانچہ اس باب میں انہوں نے نہایت مفید کام کیا۔ ابتداً میں انہوں نے انبالہ میں ایک متحدہ ہندو مسلم سکول کی بنیاد ڈالی جو غیر متوقع طور پر کامیاب ہؤا۔ اس کے بعد اُن کی کوششوں سے انبالہ میں ایک کامیاب اسلامی سکول اور بورڈنگ ہؤس بھی قائم ہوگیا۔

مرزا اعجاز حسین غیر معمولی طور پر شریف الطبع واقع ہوئے تھے۔ جو لوگ اُن سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے انہیں یقین ہے کہ ان کی شرافت کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔ انہوں نے اپنے خاندان اور اپنے دوستوں کی خدمت میں ذاتی آرام کے خیال کو کبھی حائل نہ ہونے دیا۔ ۷ اکتوبر کا دن نہایت منحوس تھا جب مسلمانوں سے ایک ایسا بے ریا کام کرنے والا چھن گیا جس کا ہر قول اس کے عمل کا شرمندۂ احسان ہوتا تھا۔ اب امید نہیں کہ اُن کی جگہ پُر ہو سکے۔ مسلم لیگ کے سلسلے میں اُن کی خدمات زبان زدِ خاص وعام ہیں۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں وہ دہلی میں اشاعتِ تعلیم کے کام کے لئے وقف ہوگئے تھے۔

اگر اُن کی طبیعت شہرت پسندی کی طرف راغب ہوتی اور وہ دوسروں کی طرح اپنا اشتہار دینا چاہتے تو آج یقیناً اُن کا نام آسمانِ شہرت کے درخشاں ترین ستاروں میں نظر آتا۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ دوسروں کو آگے کئے رکھا اور خود اُن فی الواقع مفید کاموں میں لگے رہے جو حقیقی ترقی کی بنیاد ہوتے ہیں۔

وہ نہ صرف ایک فصیح البیان مقرر تھے بلکہ ادیب اور شاعر بھی تھے۔ مخزن کے پہلے دور میں انہوں نے اردو ادب

کی نمایاں خدمت انجام دی ۔ آخری زمانے میں اُن کی تمام تر توجہ تعلیمی و اصلاحی کاموں کے لئے وقف ہوگئی تھی اور مدت سے انہوں نے عملی طور پر شعر کہنا ترک کر دیا تھا ۔ مگر اُن کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل ہمیں اُن کی ایک تازہ غزل ہمایوں کے آئندہ سالگرہ نمبر کے لئے موصول ہوئی تھی ۔ ہمیں اُس وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ اس نیک نفس انسان کا آخری عطیہ ہے ۔

اِنا للہ و اِنا الیہ راجعُون ۔

"دارالمصنفین" اعظم گڈھ

ہمیں مولانا سلیمان ندوی ناظمِ "دارالمصنفین" اعظم گڈھ نے ایک مطبوعہ رسالہ بھیجا ہے جس میں دارالمصنفین کے تخیل، اُس کی گزشتہ تاریخ، اُس کے کارناموں اور اس کی موجودہ ضروریات کا ذکر کیا گیا ہے ۔ "دارالمصنفین" سے ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ اچھی طرح واقف ہے اور جو علمی اور مذہبی خدمت یہ ادارہ انجام دے رہا ہے اس کا ذکر تحصیلِ حاصل ہے ۔ مگر پھر بھی یہ رسالہ دارالمصنفین کے متعلق بعض نئی معلومات کا حامل ہے ۔ اس کے علاوہ اس کے دیکھنے سے جب دارالمصنفین کا کام یکجا اور مجموعی طور پر سامنے آ جاتا ہے تو بے اختیار دل سے تحسین و آفرین کی صدا اُٹھتی ہے، اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک جماعت اپنے مذہب، اپنے تمدن، اپنی تاریخ اپنی زبان اور اپنے ادب کی حفاظت کے لئے موجود ہے ۔ "دارالمصنفین" کا کام اس کے بانی شبلی اعظم کے خواب کی تعبیر ہے ۔ مولانا شبلی مرحوم نے جب دیکھا کہ مغرب کا سیلاب ہر کہنہ و فرسودہ چیز کو خس و خاشاک بنا کر بہائے لئے جا رہا ہے تو انہیں اسلامی علوم کی حفاظت کا خیال پیدا ہُوا اور اس کے لئے ضروری معلوم ہُوا کہ قدیم علوم و فنون کو زمانۂ جدید کے مذاق کے مطابق از سرِ نو ترتیب دیا جائے ۔ مسلمانوں کی کیمسٹری، مسلمانوں کی طبیعیات، مسلمانوں کا جغرافیہ، مسلمانوں کی تاریخ، مسلمانوں کا فلسفہ اور ان کی تحقیق سب گئے گزرے زمانے کی باتیں ہو چکی تھیں ۔ مسلمانوں کو زندہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا کرنے کے لئے ان کے علوم کی نشاۃ الثانیہ کا خیال سب سے پہلے اعظم گڈھ کے اس مرحوم بزرگ کے دل میں پیدا ہُوا جس کی نیت کا خلوص آج کامیابی سے ہم کنار نظر آتا ہے ۔

دارالمصنفین نے اب تک کئی بلند پایہ کتابیں شائع کی ہیں جن کی وقعت کا یہ عالم ہے کہ ان میں سے بعض کے ترجمے مشرق و مغرب کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں ۔ اور دارالمصنفین مستشرقینِ یورپ کے نزدیک ایک نہایت وقیع مشرقی ادارہ تسلیم کیا گیا ہے

ہم ناظرینِ "ہمایوں" سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ دارالمصنفین سے یہ رسالہ (جس کی قیمت کچھ بھی نہیں) منگوا کر ضرور دیکھیں گے اور اگر ان کی نگاہوں میں دارالمصنفین کا کام مستحقِ ستائش ہو (اور کوئی وجہ نہیں کہ نہ ہو) تو دارالمصنفین کی سرپرستی قبول کر کے اپنے علم و ادب کی مدد فرمائیں کہ یہی زندہ قوموں کی پہچان ہے ۔

دارالمصنفین کی باقاعدہ سرکاری رجسٹری ہو چکی ہے، اس کے علاوہ اس کے کام نے ایسا اعتبار پیدا کر لیا ہے جس کی مثال موجودہ اسلامی اداروں میں بہت کم ہے ۔ اس وقت تک دارالمصنفین تقریباً پندرہ ہزار صفحات کی

مطبوعات شائع کر چکا ہے اور یہ سب کی سب مستند اور قابلِ قدر ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایسا کوئی مرکز نہ تھا جو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد علمی تحقیق و تجسس کے شائقین کی دستگیری کرتا۔ دارالمصنفین نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا ہے اور اسے بوجہِ احسن انجام دے رہا ہے۔

اس وقت دارالمصنفین کو بعض ضروریات کے لئے کم از کم پچاس ہزار روپیہ درکار ہے جس کے صرف کی تفصیل یہ ہے:۔ موجودہ رفقائے دارالمصنفین کے لئے سکونتی مکانوں اور کتب خانہ کی عمارت کی تعمیر۔ رفقائے دارالمصنفین کے ناکافی مشاہروں میں ترقی۔ کتب خانہ کی توسیع۔ عربی کتابوں کی طباعت واشاعت اور اہم کتابوں کی خرید۔ موجودہ پریس کی توسیع وغیرہ۔

آپ دارالمصنفین کی مدد کیونکر کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب مولانا سلیمان ندوی کے الفاظ میں حسبِ ذیل ہے۔

"(۱) یکمشت سرپرستانہ عطیے ہمیں عنایت فرما کر مجلس کا مربّی بننا قبول فرمائیں، مربیوں کے لئے ہمارے قواعدِ اساسی میں حسبِ ذیل تشریح ہے:۔

مُربیان

۱۔ مربّیِ علم دوست رؤسا جو مجلس کے ساتھ ہمدردی رکھیں اور اُس کی معقول مالی اعانت فرماتے رہیں۔

۲۔ یا ہمارے قواعد کی رُو سے ہماری مجلس کی رُکنیت قبول فرمائیں جن کی حسبِ ذیل تفصیل ہے،

مُعاونین

ا۔ معاونِ دائمی، ہر شخص جو یکمشت دوسو روپیہ مجلس کو ادا کرے گا اس کو اور کوئی فیس کبھی ادا نہیں کرنی پڑے گی اور وقتِ معاونت سے مجلس کی تمام مطبوعات مع رسالۂ معارف اُس کو ہدیۃً دی جائیں گی،

ب۔ معاونِ اول ہر شخص جو مجلس کو بیس روپیہ سالانہ ادا کرے گا، اس کو مجلس کی تمام مطبوعات و رسالۂ معارف سال بھر تک بلاقیمت نذر ہوں گے۔

ج۔ معاونِ دوم ہر شخص جو مجلس کو بارہ۱۲ روپیہ سالانہ ادا کرے گا، اُس کو ایک سال تک مجلس کا رسالہ معارف اور بقیہ مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ ہماری کتابیں خود خریدئیے اور ان کے حلقۂ اشاعت کی توسیع کیجئے۔

۴۔ بہت سے قدیم خاندانوں میں کتابوں کے قلمی ذخیرے بیکار پڑے ہوئے کیڑوں کی خوراک بن رہے ہیں انہیں ہمارے سپرد کیجئے کہ ہم اپنی تصنیف و تالیف میں اُن سے مدد لیں کہ اُن کا فیض ہمیشہ جاری رہے اور آپ کی خاندانی یادگار بحفاظت تمام قائم رہے۔"

تصاویر

مصری کنیز

تاریخ کا کوئی قدیم ترین دور بھی غلامی کے رواج سے خالی نظر نہیں آتا۔ دجلے فرات اور نیل کی وادیوں کے آثارِ قدیمہ اور وہاں کے اساطیر و حکایات میں ہر جگہ غلامی کا سراغ ملتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں جنگ کے قیدی عموماً غلام بنائے جاتے تھے۔ ان میں بعض اوقات غیر معمولی طور پر قابل آدمی بھی ہوتے تھے۔ جیسے یونانی حکایت گو ایسب۔ (بقول بعض لقمان)

رومی غلاموں پر اُن کے آقاؤں کو ہر طرح کا اختیار حاصل تھا۔ چنانچہ بعض اوقات انہیں بغاوت و غداری کے شبہ کی بنا پر موت کی سزا بھی دے دی جاتی تھی۔

اسلام کے زمانے میں غلاموں کی حالت بہتر ہوگئی۔ اسلامی ممالک میں وہ گھر کے رکن سمجھے جاتے تھے۔ اگر آقا کنیز کی اولاد کا باپ ہو تو نہ صرف اولاد بلکہ وہ کنیز بھی آزاد سمجھی جاتی تھی۔ اور آقا اس سے نکاح کرکے اسے اپنی بی بی بنا لیتا تھا۔ ہندوستان کے غلام بادشاہ غلاموں کے اسلامی تصور کے ارتقائی مدارج کی کھلی ہوئی تفسیر ہیں۔

مصری کنیز کی یہ خوبصورت تصویر ایک قابل جرمن مصور ہرسیشل کے لطیف تصور کا نتیجہ ہے۔ اس کی ایک تصویر میڈیا اس سے قبل ہمایوں میں چھپ چکی ہے۔ یہ مصور ایشیائی حسن کے بہترین نمونے پیش کرتا ہے۔ ہرسیشل نے اس دلفریب چہرہ اور خوبصورت جسم میں محض جسمانی حسن سے ماورئی کوئی بات پیدا کی ہے۔

بابل کے "شادی بازار"

بابلی ذہین، محنت کش اور جہاں نورد لوگ تھے خشکی اور تری یکساں ان کی سرگرمیوں کا ہنگامہ زار تھی۔ وہ اپنے عہد کے کامیاب ترین تاجر تھے۔ ان کے عظیم الشان دارالسلطنت میں ہر قسم کی تجارت ہوتی تھی تجارت کے شوق نے آخر کار دولت کی حرص پیدا کی اور رفتہ رفتہ ان کی ہوسِ زراندوزی یہاں تک بڑھی کہ وہ ہر اس چیز کو جس سے دولت پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا تھا بازار میں لے آئے۔ دولت کے لالچ نے معاشرتی اور خانگی قیود بھی توڑ ڈالیں

ہر عورت کو اپنی عمر میں ایک دفعہ شہر کے بڑے معبد کے سامنے عوام کے روبرو پیش ہونا پڑتا تھا کیونکہ اس طرح اجنبیوں کے گروہ کے گروہ شہر کی طرف کھنچے آتے تھے۔ بعض خاص موقعوں پر کثیر التعداد کنواری لڑکیاں نیلام کے لئے بازار میں لائی جاتی تھیں تاکہ ہمسایہ اقوام کے امرا و دولتمندوں کو اس بے پرہیز رنگیلی منڈی میں آنے کی ترغیب ہو۔ باپ اپنی بیٹیوں کو اور بھائی اپنی بہنوں کو بازار میں لے کر آتے اور وہ مسرتیں جن کی جائز قیمت محبت کے سوا اور کچھ نہیں روپے کے بدلے فروخت کر دی جاتیں۔

موجودہ تصویر انگریز مصور سر ایڈون لانگ کی غالباً بہترین آفرینش ہے۔ یہ نہ صرف روایات کی بلکہ تاریخی حقائق کی تصویر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل کی لڑکیاں شادی کے لئے نیلام کے سامان کی طرح پیش کی جاتی تھیں۔ تصویر میں مختلف گروہوں کی تقسیم نہایت کامیابی سے کی گئی ہے۔ بالخصوص لڑکیوں کے بشرے حیرت انگیز طور پر ان کی مختلف ذہنی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں۔ دیکھنے والے پر اس تصویر کے ماحول کا مجموعی اثر ایسا ہوتا ہے کہ اس سے بہتر یہ مصور بھی کسی دوسری تصویر میں پیدا نہیں کر سکا۔

ماں اور بچہ

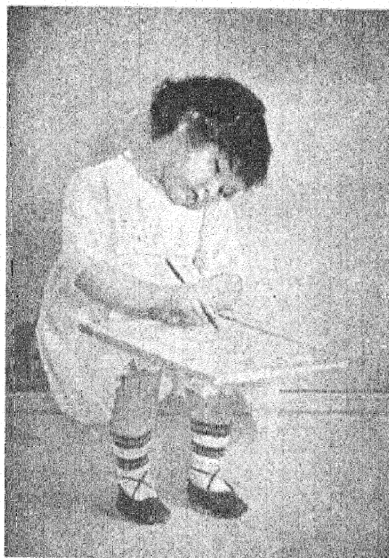
مس گلیڈیز کوپر اور ان کے بچے جان کی یہ تصویر امومت کے دلفریب حسن کی بہترین آئینہ دار ہے۔ کسی کے پاس اس کے اپنے بچوں کا ہونا زندگی کی ایک بہت بڑی مسرت ہے۔ بچے ہم پر نت نئی دلفریبیوں کے باب کھولتے رہتے ہیں۔ یہ پھول ہیں جن کی نئی نئی پنیاں ہر روز کھلتی ہیں اور آفتاب کے مسرت انگیز نور سے فروغ پاتی رہتی ہیں۔

محنت

مصور نے کامیاب طور پر بچپن کا مطالعہ کیا ہے۔ بچی کی نفسی کیفیات اُس کے چہرے سے عیاں ہیں۔ وہ سوال حل کرنے سے اکتا گئی ہے۔ لیکن استانی کے خیال سے ناچار مصروف ہے۔



ماں اور بچہ



صنّاع

ایک شام اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مسرّت کا ایک مجسمہ بنائے، اُس مسرّت کا جسے ایک لمحے سے زیادہ قرار نہیں۔

وہ گھر سے نکل پڑا، اور کانسے کی تلاش میں اُس نے ساری دنیا چھان ماری۔ کیونکہ بے ثبات مسرت کا مجسمہ بنانے کے لئے اُس کی رُوح بیقرار تھی۔

لیکن ساری دنیا میں کانسہ نایاب ہو چکا تھا۔ کانسہ کہیں ملتا ہی نہ تھا۔ صرف ایک مجسّمہ اس وقت کاروئے زمین پر موجود تھا اور وہ ابدقرار غم کا مجسمہ تھا۔

یہ مجسمہ خود اُسی کے قبضے میں تھا، اور اسے خود اُسی نے بنایا تھا اور پھر اس کو اُس کی قبر پر نصب کیا تھا جس سے اُس نے اس دُنیا میں محبت کی تھی۔

ہاں اُسی کی قبر پر جس سے اُس نے دنیا میں سب سے زیادہ محبت کی تھی اُس نے یہ مجسمہ نصب کیا تھا جسے اُس نے خود بنایا تھا، تاکہ انسان کی اُس محبت کی یادگار قائم رہے جو مرتی نہیں، اور اُس غم کا نشان باقی رہے جو مٹتا نہیں۔

مگر ساری دنیا میں کہیں کانسہ نہ تھا، سوائے اُس بُت کے۔

اُس نے اس بت کو لیا جسے خود اُسی نے بنایا تھا اور ایک بہت بڑی بھٹی میں جھونک دیا، آگ میں ڈال دیا۔

اور ابدقرار غم کے اس بُت سے اُس نے مسرت کا ایک اور بُت بنایا، اُس مسرت کا جسے ایک لمحے سے زیادہ قرار نہیں۔

(منثور نظمیں)

منصور احمد

رات کا ایک منظر

رات کے ڈر سے ہے سحر رُوپوش اور تو اور ہے قمر رُوپوش

جیسے بکھری ہوں پتیاں گُل کی ہے وہ صُورت مرے تخیل کی

ہیں بھی دل بھی خیال بھی گم ہے فکرِ ماضی و حال بھی گم ہے

وہم چاروں طرف سے آتا ہے

بھُوت بن کر مجھے ڈراتا ہے

کہ رہا ہے مرا سیہ خانہ چپکے چپکے مرا ہی افسانہ

ذرہ ذرہ ہے رازداں اپنا مل رہا ہے مجھے نشاں اپنا

جاں ہوں میں اِس سکوت کامل کی رات تصویر ہے مرے دل کی

دیکھ کر خود کو ڈر رہا ہوں میں

جیتے جی آہ مر رہا ہوں میں

ممتاز حسن

قصّہ نویسی و قصّہ خوانی

(۳)

بہرحال ایک یا دو بلند پایہ افسانوں یا ڈراموں کے خاکوں کی مدد سے پلاٹ۔ کردار اور ماحول کی اہمیت اور اُن کا باہمی ربط و تعلق آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ اردو زبان میں ناول نویسی یا ڈرامہ نگاری ابھی ارتقاء و ترقی کے ابتدائی منازل سے گزر رہی ہے۔ یوں تو افسانے کی کوئی صنف ایسی نہیں جس سے اردو کا دامن یکسر خالی ہو۔ بھاری بھرکم داستانوں سے لے کر ہلکے پھلکے قصوں کہانیوں تک ہر درجے کے افسانے موجود ہیں لیکن ان میں فنی خوبیاں اور باریکیاں بہت کم پائی جاتی ہیں۔ ابھی اردو کا افسانوی ادب نفسیاتی اصول پر فطرتِ بشری کے گہرے مطالعہ کے شواہد پیش کرنے سے قاصر ہے، البتہ انگریزی سے جو بلند پایہ افسانے یا ڈرامے اردو میں منتقل ہوئے ہیں وہ بڑی حد تک فنی نکات کے حامل ہیں۔ مغربی افسانوں اور ڈراموں میں دو متضاد و مخالف ماحول۔ فضا۔ کردار۔ اوصاف یا دوسرے عناصر کی کشمکش دکھا کر ہلچل۔ جوش۔ تحریک اور دلچسپی پیدا کرنے کا جو عام رواج ہے وہ بھی اردو ادبیات میں ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ یہاں شیکسپیئر کے دو ڈراموں "ہنری دی فورتھ" اور "ایز یو لائک اٹ" کے خاکے پیش کئے جاتے ہیں جو پروفیسر رچرڈ کی کتاب مقدمۂ تنقید سے ماخوذ ہیں اور جن سے پلاٹ۔ کردار نگاری اور متضاد عناصر کی کشمکش کی اہمیت بہ آسانی ذہن نشین ہوسکتی ہے۔ حسنِ اتفاق سے اول الذکر ڈراما کا "ہنری چہارم" کے نام سے اور ثانی الذکر کا "دلپسند" کے عنوان سے اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ لہٰذا غیر انگریزی داں حضرات بھی ان سے اچھی طرح استفادہ کرسکتے ہیں۔

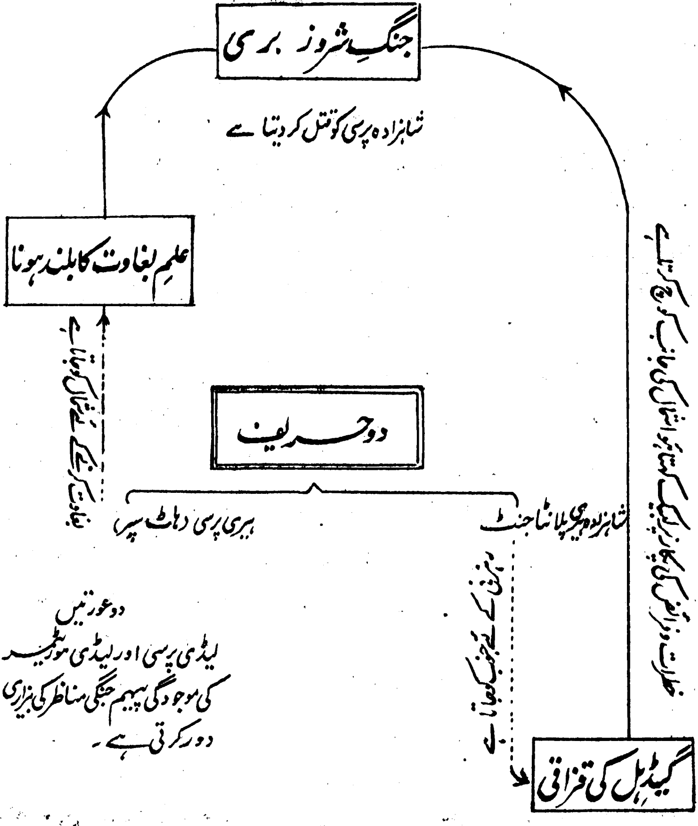
عام طور پر دو متضاد عناصر کی کشمکش قصہ میں جوش و تحریک اور ہنگامہ و ہیجان پیدا کرتی ہے۔ "ہنری چہارم" کے ڈراما میں قصہ کی اساس و بنیاد ہی دو حریفوں ہری پرسی اور شاہزادہ ہری پلانٹاجنٹ کے باہمی تصادم پر قائم ہے۔ اس تضاد و تخالف میں اس وقت اور ترقی ہوجاتی ہے جب ہری پرسی ڈگلس سے مل کر بغاوت کرنے کے لئے شمال کی جانب روانہ ہوتا ہے اور شاہزادہ ہری پلانٹاجنٹ جنوب کی طرف کوچ کرتا ہے تاکہ فالسٹاف کے ساتھ مل کر رہزنی و قزاقی کا شیوہ اختیار کرے۔

(۱)

ہنری چہارم کے پلاٹ کا خاکا

گلنڈوور کا فقدانِ ظرافت قصہ میں طربیہ عنصر کا محرک ہے۔

فالسٹاف کی غیر معمولی ظرافت قصہ میں طربیہ عنصر کی محرک ہے۔



اول الذکر کی جدوجہد کا نتیجہ علم بغاوت کی صورت میں نمودار ہوا اور ثانی الذکر کی گمرہی اور غلط کاری نے گیڈہل کی قزاقی کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں تک تو تمام واقعات شکسپیئر کے مفروضہ اصول اور ناظرین کی توقعات کے

عین مطابق پیش آتے ہیں لیکن حیرت انگیز اور غیر متوقع امر اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ پرسی کی بغاوت کی خبر گمراہ شاہزادے کو ملتی ہے۔ اُس کی سیرت میں یکایک تغیر واقع ہوتا ہے۔ وہ لااُبالی پن اور ہرزہ گردی کا شیوہ ترک کر دیتا ہے۔ اُس کے دل میں خودداری و ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ فرائض کی پکار پر لبیک کہتا ہے۔ مردانہ وار خطرات کے مقابلہ کے لئے آگے قدم بڑھاتا ہے اور لمبے لمبے دھاوے بولتا ہوا شروزبری کے میدان میں پہنچ جاتا ہے۔ یہاں دونوں فرزند ایک جگہ دکھائی دیتے ہیں، لیکن اُن کی حیثیت محض دو متضاد کرداروں ہی کی نہیں ہے بلکہ وہ دو نبرد آزما حریف ہیں جن کی وجاہت، حسن وصورت، دلاوری اور شجاعت دیکھ کر ناظرین کے دلوں میں دونوں کے ساتھ گہری محبت وہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ دونوں میں سے کسی پر کوئی آنچ نہ آئے دونوں صحیح وسالم رہیں۔ لیکن نتیجہ اُن کی خواہشات کے خلاف برآمد ہوتا ہے۔ دونوں بھائیوں میں جنگ ہوتی ہے ہر دو غیر معمولی شجاعت کے جوہر دکھاتے ہیں۔ بالآخر ہری پرسی بہادری سے لڑتا ہوا شاہزادے کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے اور ناظرین پر سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ابتدا میں مصنف کو انتخاب کا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ شیکسپیئر نے اپنی محصلہ آزادی اور حق سے اچھی طرح استفادہ کیا۔ اس نے حسب خواہش اصول بھی وضع کئے اور رقصہ کا ایک خاص پیمانہ بھی مقرر کر لیا، لیکن ان تمام مفروضات ومقامات کی تعیین کے بعد مصنف کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ اخیر تک اسے اپنے موضوعہ اصول پر کاربند رہنا پڑتا ہے اور عواقب ونتائج اس کے قابو سے باہر ہوتے ہیں۔ کمزور دل کے لوگ جن اشخاص قصہ سے ہمدردی رکھتے ہیں ان کا المناک حشر وہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ بعض ڈراما نگار کمزور ذہنیتوں کی تسکین وتشفی کے لئے مافوق البشری قوت کی استمداد سے مُردوں کو بھی زندہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ "ہریشچندر" کا ناٹک المیہ واقعات سے لبریز ہے۔ لیکن اخیر میں ست بچنی راجہ کو نہ صرف تخت وتاج واپس ملتا ہے بلکہ اس کا مارگزیدہ مردہ فرزند بھی جی اٹھتا ہے۔ لیکن شکسپیئر نے کمزور وحساس طبیعتوں کی تسلی کے لئے اصلیت وصداقت کا خون پسند نہیں کیا۔ پرسی کا قتل کتنا ہی رنجدہ سہی لیکن وہ حقیقتِ واقعہ تھا اس لئے شکسپیئر کی صداقت شعاری نے اس خونی منظر کے دکھانے سے دریغ نہیں کیا۔

متضاد ومخالف کردار کی دوسری مثال گلنڈورا اور فالسٹاف کی شخصیتوں میں پائی جاتی ہے۔ ایک کا مزاج نہایت خشک وسنجیدہ ہے اور دوسرا حد درجہ رنگین طبع وشگفتہ دل واقع ہوا ہے۔ دونوں کی طبیعتوں کا اختلاف ہمیں اُن عبارتوں سے روشناس کراتا ہے جو بے حد دلچسپ و پرلطف ہیں۔ الغرض قصہ کے جوش وتحریک کا اصلی سبب بھی کرداری اضداد ہے۔ فالسٹاف کا وجود ایک عجیب وغریب نفسیاتی واقعہ ہے۔ اس ظرافت کے بادشاہ کے اقوال وافعال کی منطقی توضیح وتعبیر کے لئے اس کے گذشتہ سوانحِ حیات کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت

ہے۔ شاہزادہ ہری ڈپلانٹاجنٹ، اپنی تشبیہ آفتاب سے دیتا ہے لیکن محض تشبیہ واستعارہ کے ذریعہ سے اس کے طرزِ عمل کی کافی تشریح نہیں ہوسکتی۔ اس کے لئے مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہے لیکن شکسپیئر ایسے مسائل میں اُلجھنا پسند نہیں کرتا کیونکہ ان سے بجز تھوڑی بہت تفریح و تفنن کے اور کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ ایک اور قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ جب جنگ وجدال کے پیہم خونی مناظر سے طبیعت مکدر و بیزار ہوجاتی ہے تو دو افرادِ جنس لطیف یعنی لیڈی پرسی اور لیڈی مارٹیمر کی شائستگی و شیریں مقالی ناظرین کے تھکے ہوئے دماغ کو تروتازگی و شگفتگی بخشتی ہے۔

(۲)

"ایز یو لائک اٹ" کے پلاٹ کا خاکا

(۱) ماحولی اضداد

قصہ میں متضاد عناصر کی کشمکش کا مطالعہ

(۱) دربار کی محدود مگر پُر فضا جہاں بغض و حسد کینہ و کدورت خوشامد و تملق کے نظارے دیکھنے میں آتے ہیں

(۲) صحرا کی وسیع اور کھلی ہوئی فضا جہاں خوشدلی و ہمدردی امن و صلح۔ عبرت و بصیرت کے سامان پائے جاتے ہیں

(۲) کرداری اضداد

(۱) دو حکمران
- ڈیوک سینئر — سہل انگار۔ بے پروا۔ فطرتاً فلسفی
- ڈیوک فریڈرک — جاہ طلب۔ حاسد۔ حریص

(۲) دو بھائی
- اولیور۔ لالچی و تنگ نظر
- اورلینڈو۔ طبعاً فیاض

(۳) دو مسخرے
- جیکس۔ قنوطی اور خشک مزاج جس کی عقلمندی نیم احمقانہ ہے۔
- ٹچ اسٹون۔ ظریف و رجائی جس کی حماقت نیم دانشمندانہ ہے۔

(۴) دو عم زادیاں
- روزالنڈ
- سیلیا

دونوں کے مزاج مختلف ہیں لیکن رشتۂ محبت نے انہیں باہم متحد کر رکھا ہے۔

(۵) دو جوڑ شادباں { اورلینڈو اور روزالنڈ ٹچ اسٹون اور آڈری

(۳) کرداری ارتقا { ڈیوک سنیر کی سہل انگاری و آرام طلبی — ڈیوک فریڈرک اور اولیور کی حرص و آز اور بغض و حسد

صحرا کا تربیتی و تعمیری اثر

صحرا کی سختیوں سے چشم عبرت کھلی۔ ہر شے اپنے اصلی و حقیقی رنگ میں نظر آنے لگی۔ رازِ حیات کا انکشاف ہوا۔ جنگل کے حجر و شجر اور سبزہ و چشمہ سب کے سب درسِ معرفت کا دفتر بن گئے۔

"ایز یو لائک اٹ" کے ڈرامے میں پلاٹ نہایت سادہ اور بے مزہ ہے۔ اس قصہ کی دلچسپیاں زیادہ تر کردار سے وابستہ ہیں۔ یہاں متضاد و مخالف عناصر کی کشمکش کے نظارے جس کثرت سے دیکھے جاتے ہیں اس کی مثال بہت کم پائی جاتی ہے۔ ماحولی و کرداری اضداد ہی نے قصہ میں غیر معمولی ہلچل۔ ہیجان۔ جوش و تحریک اور چہل پہل پیدا کر دی ہے۔ مختلف طبائع پر درباری اور صحرائی ماحول کے تضاد کا عجیب و غریب اثر پڑا ہے۔ دربار کی محدود و عیش پرور فضا بدمزاجوں میں بغض و حسد او کینہ و سازش کا مادہ اور نیک مزاجوں میں آرام طلبی و سہل انگاری اور تسلیم و اطاعت کی عادت پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس صحرا کی کھلی فضا کے نہایت مفید اثرات جسم و روح پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہاں خوشدلی۔ ہمدردی اور صلح و آشتی کی خوبیاں وجود میں آتی ہیں۔ دربار کے مصنوعی آداب مراسم اور درباریوں کی خوشامد اور چاپلوسی کسی شے کو اصلی رنگ میں نمایاں ہونے نہیں دیتی۔ لیکن جب عیش و تنعم کے دامن میں پرورش پانے والے جنگل میں جاتے ہیں تو قدرت کی سختیاں اُن کی آنکھوں پر سے غفلت کا پردہ اُٹھا دیتی ہیں وہاں اُنہیں اپنی انسانی خامیوں اور کمزوریوں کا علم ہوتا ہے وہ ہر شے کا اس کے اصلی رنگ میں مشاہدہ و مطالعہ کرتے ہیں۔

بہرکیف دربار اور صحرا کے ماحولی تفاوت کی اہمیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا لیکن اس سے کہیں زیادہ پُرلطف و دلچسپ وہ کرداری اضداد ہیں جو قصہ کے ہر زینہ پر پائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے ہماری توجہ

دو حکمرانوں کی طرف منعطف ہوتی ہے جن میں سے ایک نہایت آرام طلب بے پروا اور سادہ مزاج ہے لیکن قوت و اقتدار اور دولت و اختیار کے سلب ہو جانے پر وہ متفکر، مدبّر اور فلسفی بن جاتا ہے۔ دوسرا جاہ و ثروت کا حریص ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے وہ ہر قسم کے جائز و ناجائز ذرائع سے کام لیتا ہے اور حکومت غصب کر لینے کے بعد وہ اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ ڈرامہ میں ان دونوں حکمرانوں کو مرکزی کرداری حیثیت حاصل ہے۔ ان کے گرد کئی مساوی لیکن متضاد جوڑ کے اشخاصِ قصہ دیکھنے میں آتے ہیں جن میں سے سب سے زیادہ جاذب نظر شخصیتیں دو مسخروں یعنی جیکیس اور ٹچ اسٹون کی ہیں۔ ایک قنوطی اور خبطی سا ہے ظاہر پرست دنیا اسے عقلمند خیال کرتی ہے لیکن حقیقت میں اس کا ہر قول و فعل حماقت پر مبنی ہوتا ہے۔ دوسرے کو سب لوگ مسخرہ سمجھتے ہیں۔ اُس کو متانت و سنجیدگی سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کی تمام باتیں ہنسی میں اُڑا دی جاتی ہیں۔ لیکن دراصل وہ مذاق ہی مذاق میں پتے کی باتیں کہہ جاتا ہے۔ اُس کی ظرافت آمیز گفتگو میں دانشمندی کے اصول پائے جاتے ہیں۔

اس ڈراما کا سب سے اہم عنصر وہ کرداری ارتقا ہے جسے صحرا کی تمرین و تربیت کے زیر اثر نمایاں کیا گیا ہے۔ آرام طلب ڈیوک سنیئر، غاصب ڈیوک فریڈرک اور حریص اولیور سب کی اصلاحِ اخلاق کے لئے جنگل کی فضا بہترین مکتب ثابت ہوئی۔ شدائدِ موسمی نے انہیں ان کی اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔ ہوا کی سنسناہٹ چڑیوں کے چہچہے اور جھرنے کی آواز میں اُن کو حیاتِ انسانی پر خطبہ سنائی دینے لگا۔ اُن کے باہمی بغض و حسد اور شر و فساد کی جگہ خوشدلی و ہمدردی اور صلح و آشتی نے لے لی۔ غاصب ڈیوک اپنی حرکات پر نادم ہو کر تخت و تاج حقدار کے حوالے کرتا ہے۔ ڈیوک سنیئر بھی سہل انگاری و بے پروائی ترک کر کے پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ عنانِ حکومت دوبارہ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔

پلاٹ، کردار اور ماحول سے قطع نظر قصہ کی تمہید و اختتام کے مختلف طریقوں کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے ذہن کو اس قدیم زمانہ کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ جب انسان طرزِ تحریر سے ناآشنا تھا اور قصے زبانی بیان کئے جاتے تھے۔ آج کل گھر کی بوڑھی عورتیں بچوں کو سوتے وقت جو دلچسپ کہانیاں سناتی ہیں وہ پُرانے زمانہ کی بہترین یادگار ہیں۔ سننے والوں کی توجہ مبذول کرنے کے لئے وہ بالعموم قصہ کی ابتدا چند معین و مقرر جملوں سے اس طرح کرتی ہیں کہ "سونا سنسار جاگتا پاک پروردگار۔ کہانی ایسی جھوٹی بات ایسی میٹھی۔ کہنے والا جھوٹا سننے والا سچا۔ کانوں سُنی کہتے ہیں۔ آنکھوں دیکھی نہیں کہتے"۔ تحریری قصوں میں تمہید کے مختلف طریقے ہیں لیکن سب کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ سامع نہایت دلچسپی اور شوق کے ساتھ قصہ سننے کے لئے تیار ہو جائے۔ ختمِ کتاب پر مصنف بالعموم قصہ سے مرتب ہونے والے مرکزی اثرات کو مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کر دیتا ہے تاکہ قصہ کی تفصیلات و جزئیات بھول جانے پر بھی اس کے مرکزی نقوش تا ثر پڑھنے والوں کی لوحِ دماغ سے محو نہ ہونے پائیں

"فردوس گم شدہ" کے ابتدائی اشعار میں ملٹن سروش سخن (پوئٹک میوز) سے اپنے تخیل کے لئے فلک پیمائی کی قوت طلب کرتا ہے لیکن ہمارے شعرا ایسے موقع پر عموماً صرف خدا سے اس قسم کی استعانت کرتے ہیں۔ چنانچہ میر انیس اپنے شہرۂ آفاق مرثیہ کی ابتدا حسب ذیل اشعار سے کرتے ہیں۔

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر | اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
توفیق کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر | گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے | اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اسی طرح صاحبِ "گلزار نسیم" اپنا دلچسپ قصہ اس شعر سے شروع کرتے ہیں

یارب میرے خامہ کو زباں دے | منقار ہزار داستاں دے

بعض شعرا نے عشقیہ مثنویوں کے تمہیدی اشعار میں عشق کے کارنامے بیان کئے ہیں چنانچہ میر تقی میر اپنی مثنوی "دریائے عشق" کا آغاز یوں کرتے ہیں

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال | ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
کہیں آنکھوں سے خوں ہو کے بہا | کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا | کہیں سینہ میں آہ سرد ہوا
کسی چہرہ کا رنگ زرد ہوا | کسی محمل کے آگے گرد ہوا

مثنوی "سحر المحبت" اور "زہر عشق" کے تمہیدی اشعار بھی اسی رنگ کے ہیں۔ میر حسن نے اپنی مشہور مثنوی "سحر البیان" کو متعدد داستانوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ ہر داستان کو ساقی نامے سے شروع کرتے ہیں ہر ساقی نامہ داستان کے موضوع اور واقعات سے گہرا تعلق رکھتا ہے جس سے شاعر کی سلیقہ مندی و خوش مذاقی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً شہزادہ بے نظیر کے تولد ہونے کی داستان بیان کرتے وقت وہ ساقی کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں ؎

خوشی سے پلا مجھ کو ساقی شراب | کوئی دن میں بجتا ہے چنگ و رباب
کروں نغمۂ تہنیت کو شروع | کہ اک نیک اختر کرے ہے طلوع

حمام میں نہانے کی داستان یوں شروع ہوتی ہے ؎

پلا آتشیں آب پیر مغاں | کہ ہووے مجھے گرم و سرد جہاں
کدورت مرے دل کی دھو ساقیا | ذرا شیشۂ مے کو دھو دھا کے لا

الغرض مشرقی فن کار بالعموم ایسی تمہید اختیار کرتے ہیں جو موضوع داستان سے خاص مناسبت و موزونیت

رکھتی ہو۔ لیکن مغربی صناع جو قصہ کے ہر زینہ پر متضاد و مخالف عناصر کی کشمکش کے اظہار سے جوش و تحریک پیدا کرنے کے عادی ہیں قاری کے جلبِ توجہ کے لئے بسا اوقات قصہ کا آغاز بھی بے تعلق و بے ربط یا متضاد و مختلف باتوں سے کرتے ہیں۔ مثلاً لی ہنٹ اپنی ایک تصویری نظم کا عنوان "زمستاں کی سحر خیزی" قرار دیتا ہے لیکن اس کی ابتدا ایک اطالوی شاعر کے ذکر سے کرتا ہے جو کیڑوں مکوڑوں پر اچھی نظمیں لکھا کرتا تھا۔ پڑھنے والا حیران ہوتا ہے کہ اس "کرمیاتی" واقعہ کو نظم کے موضوع سے کیا تعلق؟ لیکن یہی حیرانی قاری کے سمندِ شوق پر تازیانہ کا کام کرتی ہے اور وہ آگے پڑھتا چلا جاتا ہے تاکہ حقیقت حال کھلے۔ اس طرح شاعر کا مقصد خود بخود پورا ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے محض ترغیب و تشویق ہی کے لئے ایک بے تعلق بات کا ذکر چھیڑا تھا۔ ایسے موقعوں پر شاعر یا قصہ نویس کو اختصار ملحوظ رکھنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ بے ربط و بے تعلق بیان کی طوالت ایسی بیزاری پیدا کرے کہ قاری کتاب ہی بند کر کے رکھ دے۔ اسی طرح ونسٹن چرچل اپنی ایک تصنیف کا عنوان "پیالہ کا اندرونی حصہ" (انسائڈ آف اے کپ) قرار دیتا ہے۔ لیکن اوّل اوّل وہ ہماری توجہ نیویارک کے کلیسا کے گھنٹے کی جانب منعطف کرتا ہے۔ گھنٹہ چھ روز تک خاموش رہتا ہے لیکن اتوار کو صبح ہی سے بجنے لگتا ہے۔ گویا وہ مذہبی دنیا کا کاروباری دنیا کے نام مبارزت نامہ ہے۔ اتوار کے روز کلیسا اپنی فتح مندی کا اعلان کرتا ہے۔ کاروباری دنیا ایک روز کے لئے کلیسائی مذہب کے رسوم ظاہری کی سیادت خاموشی سے تسلیم کر لیتی ہے بشرطیکہ بقیہ چھ روز وہ کلیسا کی داروگیر سے آزاد رہے۔
غرض کہ دو متضاد امور کا باہمی مقابلہ کتاب کی تمہید کو نہایت دلچسپ بنا دیتا ہے۔ ڈکنز کا مشہور و معروف ناول "اے ٹیل آف ٹو سٹیز" (دو شہروں کا قصہ) جن متضاد باتوں سے شروع ہوتا ہے ان کی حیرت و دلچسپی سے مدرسہ کے متعلم بھی واقف ہیں۔ لیکن اردو کے طبع زاد افسانوں میں متضاد عناصر کی کشمکش کے ذریعے سے جوش و تحریک پیدا کرنے کی مثالیں شاذو نادر پائی جاتی ہیں۔ البتہ آغا حشر کا شاہکار ڈراما "خوبصورت بلا" استثنائی حیثیت رکھتا ہے۔
یہاں متعدد کرداری اضداد کے نمونوں نے ڈراما کے لطف و دلچسپی کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس ڈراما کا شاندار آغاز بھی نیکی اور بدی کے دلچسپ مکالمہ سے ہوا ہے۔

قصہ کا طریقۂ اختتام بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ یوں تو قصہ کے مختلف واقعات مختلف جذبات کے محرک ہوتے ہیں لیکن پورے قصہ کا ایک عام اثر بھی پڑھنے والوں پر پڑتا ہے۔ قاری کو مرکزی اشخاصِ قصہ سے ایسی گہری ہمدردی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنا ماحول بھول کر انہیں کے ساتھ مختلف مقامات کی سیر کرتا پھرتا ہے، اُن کی تمام مہموں میں شریک رہتا ہے۔ ان کے رنج و راحت اور غم و خوشی میں ان کا ساتھ دیتا ہے۔ ان پر جو جذبات طاری ہوتے ہیں وہی قاری کے دل میں بھی رونما ہوتے ہیں۔ یہ مختلف امور و مختلف واقعات کے اثرات ہیں جو موقع و محل کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن قصہ کا ایک مرکزی

عام اثر بھی قاری پر پڑتا ہے جو دیرپا ہوتا ہے اور قصہ کی تمام تفصیلات وجزئیات بھول جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ مصنف کو چاہئے کہ قصے کے اختتام پر انہیں دیرپا مرکزی نقوشِ تاثر کو ایسے اچھے پیرایہ میں ظاہر کرے کہ وہ حیاتِ انسانی کے اہم ثابت ہوں۔ طربیہ قصوں کا خاتمہ بالعموم بچھڑے ہوئے ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات یا شادی پر ہوتا ہے۔ ہمارے شعرا ایسے قصوں کو دعائیہ جملوں پر ختم کرتے ہیں کہ جس طرح اشخاصِ قصہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے ویسے ہی قاری و سامع بھی شادکام و فائز المرام ہوں۔ چنانچہ میر حسن اپنی مثنوی "سحرالبیان" کے اندر خاتمہ پر فرماتے ہیں ؎

ہمارے تمہارے پھریں ویسے دن ۔۔۔ اتھوں گے جہاں میں پھرے جیسے دن
بحقِ محمد علیہ السلام ۔۔۔ ملیں سب کے بچھڑے الٰہی تمام
رہیں شہر میں اپنے آباد ہم ۔۔۔ ہوئے جیسے وہ شاد ہوں شاد ہم

گلزارِ نسیم کا اختتامی شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

جس طرح اُنہیں بہم ملایا ۔۔۔ بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

"زہرِ عشق" ایک حزنیہ افسانہ ہے۔ ہیروئن زہر کھا کر مرجاتی ہے سخت جان ہیرو کو مدت العمر آلام ومصائب جھیلنے پڑے۔ اس لئے غمِ عشق کے بیان پر قصہ ختم ہوا ہے چنانچہ اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی ۔۔۔ دل دیا غم سے آشنائی کی

ایک قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ حقیقی زندگی میں بہت سے واقعات ہماری توقعات وخواہشات کے خلاف پیش آتے ہیں۔ بسا اوقات نیکی وپارسائی گرفتارِ آلام اور فسق وفجور شادکام و فائز المرام نظر آتا ہے۔ کیا بعض وقت دنیا نے حق وصداقت کی حمایت کو دار ورسن کا مستحق اور کذب وافترا کو عیش وتنعم کا اہل قرار نہیں دیا ہے؟ یہ قدرت کے معمے ہیں جو کبھی حل ہوئے ہیں نہ ہوں گے۔ اہلِ یونان نے معاملاتِ حیات کی صحیح ترجمانی کے لئے طربیہ اور المیہ دونوں قسم کے ڈرامے لکھے ہیں۔ لیکن مشرقی ذہنیت دنیائے افسانہ میں ہر شئے کو اپنی مرضی وخواہش یا اپنے مقرر کردہ اصولِ انصاف کے مطابق دیکھنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت کا وسیع لٹریچر ٹریجیڈی سے تہی دامن ہے۔ سنسکرت کے ڈراموں میں حزنیہ والمیہ عناصر کی کمی نہیں ہے لیکن قصہ کا انجام ہمیشہ شادکامی وکامرانی پر ہوتا ہے۔ قصہ کے ارتقائی منازل میں ہیرو پر غم والم کا پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے لیکن اخیر میں وہ ضرور تمام مصائب پر غالب آتا ہے اور اپنی محنتوں کا اچھا پھل پاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ دنیا صرف دارالعمل ہے دارالجزا نہیں۔ تاہم عوام کی تشفی ہوتی ہی نہیں جب تک دنیا ہی میں نیکی کو کامیاب اور بدی کو ناکام نہ دکھایا جائے۔ اصلی رامائن میں لنکا سے واپسی کے بعد بیچاری سیتا کو کبھی چین وآرام نصیب نہیں ہوا۔ وہ آخری دم تک دکھ درد

سہتی رہی بالآخر مادر گیتی کو اپنی دختر کی حالت پر رحم آیا۔ زمین شق ہوگئی اور سیتا کو اپنی آغوشِ محبت میں لے کر اس کی ساری مصیبتوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا لیکن جب بھاؤ بھوتی اپنے مشہور ڈراما "اُتر رام چرِتیا" کو "اسومیدھ" کے عظیم الشان جشن پر ختم کرتا ہے جس میں رام کا سارا کنبہ شریک ہے اور بیاس رشی رام کے دونوں فرزندوں کوس اور لوا کا لوگوں سے تعارف کرا کے جشن کی خوشی کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ایسے موقع پر بھاؤ بھوتی کا جذبۂ انصاف یہ گوارا نہیں کرتا کہ بیچاری سیتا اس خوشی کی تقریب کی شرکت سے محروم رہے۔ اس لئے وہ دھرتی ماتا سے سیتا کو اگلواتا ہے اور اس عصمت وعفت کی دیبی کو کامیابی کا زرنگار تاج پہنا کر بڑی شان سے راج سبھا میں داخل کرتا ہے۔ اجدھیا نگری کے مغرور دریدہ دہنوں کا سر ندامت وخجالت سے اس کے آگے جھک جاتا ہے اور تماشے کا خاتمہ عالمگیر خوشی وخرمی پر ہوتا ہے۔

سچا عشق کسی سے ہو عام طور پر پاک ومتبرک سمجھا جاتا ہے لیکن وادئ عشق سخت خاردار وخطرناک ہے۔ قدم قدم پر کانٹوں سے دامن الجھتا ہے۔ دن بادیہ پیمائی میں اور رات اختر شماری میں کاٹنی پڑتی ہے۔ بسا اوقات سوسائٹی کے بیرحمانہ رسوم عاشق ومعشوق کو خودکشی پر مجبور کرتے ہیں لیکن عوام کی ذہنیت انہیں بالکل نامراد و ناشاد دیکھنا پسند نہیں کرتی اس لئے بعض قصہ نویس حزنیہ والمیہ افسانوں میں بھی عوام کے جذبات کی تسکین کے لئے اگر زندگی میں نہیں تو کم ازکم بعدِ مرگ ہی عاشق ومعشوق کو یکجا کر دیتے ہیں۔ مثلاً مثنوی "بحر المحبت" میں عاشق ومعشوق دونوں ہفتہ عشرہ کے فصل سے غرقِ دریا ہوجاتے ہیں۔ عوام کی ذہنیت ایسے حسرتناک انجام کی تاب نہیں لاسکتی۔ لہٰذا اُن کی ایک گونہ تشفی کے لئے شاعر دریا میں جال ڈلوا کر ان کی نعشیں حالتِ وصال میں برآمد کرتا ہے۔ مصحفی نے اس منظر کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ حسب ذیل ہے ؎

وہ ہم آغوش دام میں نکلے	پکے اپنے وہ کام میں نکلے
لب سے لب آشنائے بوسہ بذوق	ہاتھ دونوں کے وہ گلوں کے طوق
ساق پا ساقِ پا سے پیچیدہ	یکدگر عضو عضو گرویدہ
سینہ سینے کے ساتھ شیر وشکر	جس میں خالی ذرا نہ جائے نظر
نظر آئے وہ دونوں ماہ منیر	جیسے اک آئینہ میں دو تصویر

ایک فلم کمپنی نے شیکسپیر کے المیہ ڈراما "رومیو اور جولیٹ" کا "شیریں اور خسرو" کے نام سے ترجمہ کرا کے اسے بالکل ایرانی رنگ ولباس میں پیش کیا ہے لیکن ناکامئ محبت کی تلخی کو کم کرنے اور تماشائیوں کے جذبات کو تسکین دینے کے لئے اخیر میں ایک منظر بڑھا دیا ہے کہ عاشق ومعشوق کی روحیں پرچھائیوں کی شکل میں قبر سے نکلتی ہیں اور ہاتھ میں ہاتھ ملا کر آسمان کی طرف پرواز کر جاتی ہیں۔ "شیریں اور فرہاد" کا بولتا فلم تیار ہوگیا ہے۔ ان کے عشق ومحبت کا

جو حسرتناک حشر ہوا اس سے ہر شخص واقف ہے۔ لیکن تماشائیوں کی تسکین کے لئے فلم کمپنی نے پرانے قصے میں یہ اضافہ کر دیا ہے کہ شیریں فرہاد کی قبر پر جا کر آہ و زاری کرتی ہے جس کے اثر سے قبر شق ہو جاتی ہے۔ شیریں فرہاد کے پہلو میں لیٹتی ہے۔ اس کے بعد قبر خود بخود بند ہو جاتی ہے۔ اس پر پھول برستے ہیں پھر عشق کا شعلہ بلند ہوتا ہے اور ساری قبر کو گھیر لیتا ہے۔ لیکن تماشا یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ اخیر میں جنت کا سین دکھایا جاتا ہے جہاں فرشتوں قدوسیوں۔ حوروں اور غلمانوں کے ایک شاندار جلوس میں شیریں اور فرہاد ہاتھ میں ہاتھ ملائے ہوئے آگے آگے چلتے ہیں۔ لیکن سنجیدہ مذاق کے لوگ ان باتوں کو محض توہم پرستی کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ ان کی دانست میں انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد و عزائم کی تکمیل یا حق و صداقت کی حمایت یا اپنے بلند اصول کی پابندی میں سب کچھ نثار کر دے بلکہ جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کرے۔ کسی دنیوی انعام یا اُخروی صلہ کے لالچ سے کوئی بڑا کام انجام دینا تعریف کی بات نہیں ہے۔ یہ تو کم ہمتی کا شیوہ ہے۔ بغیر عواقب و نتائج کا خیال کئے ہوئے فرائض کو محض فرائض کی خاطر انجام دینا اور اپنے اعلیٰ اصول پر عزیز سے عزیز شے کو تج دینا انسانیت کا جوہر ہے۔ دُنیا کے بلند پایہ المیہ ڈرامے ہمیں یہی سبق سکھاتے ہیں۔ سوفاکلس اور شکسپیر جیسے باکمال المیہ نویس کمزور ذہنیتوں کے احتجاج کی کچھ پروا نہیں کرتے اور نہ ان کی پست خواہشات و توقعات کی آسودگی کے لئے ہیرو کی قسمت کا ایسا فیصلہ کرتے ہیں جو حقائق زندگی کے منافی ہو۔ انگلستان کے مشہور ادیبوں میں ایک ڈکنس ہی ایسا شخص ہے جو اپنے افسانوں کے آخری سین (منظر) میں تمام رجال داستان کو التزاماً جمع کر کے انہیں اُن کے اعمال کے مطابق سزا و جزا دیتا ہے۔ لیکن ماہرین فن کے نزدیک یہ طریقہ بالکل غیر فطری و مصنوعی ہے۔ آج کل مغربی دنیا میں اعلیٰ صناعی یہ سمجھی جاتی ہے کہ قصہ کا انجام مذبذب حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ ہر قاری اپنی سمجھ۔ مذاق اور لیاقت کے مطابق جو نتیجہ چاہے اخذ کرے۔

گھر کی بوڑھی عورتیں جس انداز سے اپنی کہانی ختم کرتی ہیں وہ بھی اہمیت و دلچسپی سے خالی نہیں ہے جس طرح وہ قصہ کی ابتدا چند مقرر جملوں سے کرتی ہیں اسی طرح ان کے اختتام قصہ کا بھی طریقہ معین ہے۔ کہانی ختم کر کے وہ یہ فقرے دُہراتی ہیں "کتھا گئی بن میں سوچو اپنے من میں۔ کہانی پر پتھر سننے والے کے سر پر سونے کا چھتر"۔ کیا اچھی نصیحت ہے۔ گویا گھریلو کہانیاں بھی محض دل بہلاوے کی چیز نہیں ہیں بلکہ سامع کو غور و خوض کی دعوت دیتی ہیں قصہ کے واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ قصہ چولھے بھاڑ میں جائے یا اس پر پتھر پڑے کوئی مضائقہ نہیں۔ سامع اگر قصہ کی تمام تفصیلات و جزئیات بھول جائے تب بھی کوئی ہرج نہیں کیونکہ اصل شے وہ اخلاقی تعلیم حکیمانہ نکات اصول زندگی اور حقائق حیات ہیں جو قصہ میں مضمر ہوتے ہیں۔ اگر سننے والے غور و فکر سے کام لیں اور ان بیش بہا امور کو دریافت کر کے انہیں مشعل راہ بنائیں تو یقیناً وہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لائق بنیں گے اور دولت و اقبال

کا چتر اُن کے سروں پر سایۂ فگن ہوگا۔ غرض کہ سامع یا قاری کو اپنی انفعالی و مجہول حیثیت پر اکتفا نہیں کرنی چاہیئے۔ بہترین نتیجہ اسی وقت برآمد ہوسکتا ہے جبکہ قاری اور مصنف دونوں علمی و فنی مطالبات کے پورا کرنے کی کوشش کریں۔ مسٹر پین (Payne) کا قول ہے کہ "قصہ خواں کو آگے بڑھ کر آدھے راستہ پر قصہ نویس سے ملنا چاہیئے محض پیشکش قبول کرلینا قاری کا کام نہیں۔ اس طرح سے قصہ پڑھنا یا سُننا گویا ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگنا ہے"۔ کارلائل کہتا ہے کہ "قاری کا دماغ ایک ساکن و جامد حوض نہیں ہے جس میں پمپ سے پانی پہنچایا جائے۔ جو پانی، حوض کے استحکام و تقویت کے کام نہیں آتا۔ پڑھنے والے کا ذہن ایک زندہ نامیاتی ہستی ہے جس کی جڑیں کتاب کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر ایسی مفید غذا تلاش کرتی ہیں جو اُس کی بالیدگی نشوونما ترقی اور تقویت کی موجب ثابت ہو"۔ اگر مصنف کی جانب سے جانکاہی و دماغ سوزی کا اظہار ہو تو قاری کو بھی اپنے ذوقِ تلاش و شوقِ جستجو کا ثبوت بہم پہنچانا چاہیئے۔ جو قاری خود کوئی فاعلی حصہ نہیں لیتا بلکہ محض دلچسپی کے لئے قصہ پڑھتا ہے اُس کی حالت ٹھیک اس تماشائی کی سی ہوتی ہے جو بڑی حیرت و استعجاب اور لطف و دلچسپی کے ساتھ پہلوانوں کے ورزشی کرتب اور داؤ پیچ ملاحظہ کرتا ہے۔ لیکن کیا صرف تماشا دیکھ لینے سے خود تماشائی کے اعضاء و جوارح میں ذرہ برابر بھی قوت و توانائی پیدا ہوسکتی ہے؟ محض دلچسپی اور اوقات گذاری کے لئے قصہ و افسانہ پڑھنے سے قاری کے دل و دماغ میں نہ روشنی پیدا ہوسکتی ہے نہ قوت۔ آج کل اردو کے رسائل و جرائد میں بے شمار افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن قصہ نویس اور قصہ خواں دونوں ابھی پست سطح پر ہیں۔ جیسی مانگ ہے ویسی ہی رسد بھی ہے۔ اگر قارئین کرام کا مذاق بلند ہوگا تو مدیر صاحبوں کو بھی "خاصہ کی چیز" فراہم کرنے کی فکر ہوگی۔ طلب و رسد کا معاشیاتی مسئلہ صرف کاروباری اور تجارتی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ ادبی دنیا میں بھی رائج ہے۔

تـــــــــتـــــــــت

محمد حسین ادیب

یادِ ایّام

یاد ایّام کہ میں دلدادۂ جانانہ تھا — یار کے ہوتے غمِ اغیار سے بیگانہ تھا

یاد ایّام کہ عالم غیرتِ مے خانہ تھا — نظمِ ہستی تحتِ نظمِ نرگسِ مستانہ تھا

یاد ایّام کہ ایسے ایسے خوش رو جمع تھے — جن کے آگے قصۂ حور و پری افسانہ تھا

یاد ایّام کہ ایسے ایسے دلجو جمع تھے — جن کے ہوتے کچھ غمِ دنیا و مافیہا نہ تھا

جو جبیں تھی حاملِ انوارِ محبوبانہ تھی — جو حسیں تھا صاحبِ اندازِ معشوقانہ تھا

خشمگزارِ مہر و الفت نرگسِ مستانہ تھی — دوستدارِ رحم و رافت عشوۂ ترکانہ تھا

خوگرانِ قہر کے دل مہر سے لبریز تھے — دلبرانِ دہر کا برتاؤ دلدارانہ تھا

جملہ اسبابِ نشاطِ زندگی موجود تھے — جملہ سامانِ طرب زینت دہِ کاشانہ تھا

وہ امنگیں تھیں کہ بے شغلِ طرب بنتی نہ تھی — وہ ترنگیں تھیں کہ بے بادہ کشی چارا نہ تھا

دن کو فکرِ سرخوشی تھی اور بیباکانہ تھی — شب کو شغلِ مے کشی تھا اور آزادانہ تھا

ایک جانب مطربوں کے نغمہ ہائے مست تھے — ایک جانب مغبچوں کا رقصِ سرشارانہ تھا

کونسی وہ رات تھی جو کیف کی حامل نہ تھی — کونسا وہ روز تھا جو لطفِ سرتاپا نہ تھا

رات دن منجواریاں تھیں رانذن رقص و سرود رات دن گردش میں ساقی، دور میں پیمانہ تھا

اُس طرف اُس کی طبیعت مائل الطاف تھی اس طرف میں گرمِ خدماتِ وفادارانہ تھا

جو عطا تھی بے حد و عد، جو کرم تھا بیحساب ہر سلوک دوست میرے ساتھ فیاضانہ تھا

میری دم بھر بے مئے و ساغر بسر ہوتی نہ تھی مجھ کو پل بھر بے وصالِ یار چین آتا نہ تھا

عشق کو خود دار رہنے کا سبق دیتا تو کون حُسن کا برتاؤ خود ہی غیر خود دارانہ تھا

کیا کہوں، کیوں اُس بُتِ کافر کو میری چاہ تھی کیا کہوں، کیوں وہ عدوئے دیں مرا دیوانہ تھا

جب کوئی توجیہہِ عقلی داخلِ امکاں نہ ہو کیوں نہ یہ سمجھوں لباسِ شمع میں پروانہ تھا

اب کوئی کیونکر دکھا سکتا ہے، کیا کیا لُطف تھے اب کوئی کیونکر بتا سکتا ہے، کیا تھا کیا نہ تھا

ماحصل یہ ہے کہ میں تھا اور نشاطِ جاوداں مختصر یہ ہے کہ میں تھا اور غمِ جانانہ تھا

آپ فرمایا کریں، یہ سب خدا کی دین تھی میں سمجھتا ہوں کہ فیضِ مشربِ رندانہ تھا

آہ! آزاد۔ اب وہ ہم باقی نہ وہ لطفِ حیات
"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا"

حکیم آزاد انصاری

جنّتِ خیال

(ایک لطیف تصور)

کسی مقام پر ایک خوبصورت اور غیر آباد جزیرہ ہے ـــــ جو سیّال زمرد کے ایک سمندر میں واقع ہے ـــــ چاروں طرف کنول ہی کنول ہیں ـــــ اور پکھراج اور مرمر کے شفاف پہاڑ۔

اس ماحول میں میں نے تیرے لئے مرمر اور گوہر کا ایک خوبصورت محل تیار کیا ہے! ـــــ تیار کیا ہے ایک زریں اور زمردیں ساحل کے کنارے پر ایک قرمزی رنگ کا محل! ـــــ اس کے ایوانوں کے ستون ثابت نیلم کے بنے ہوئے ہیں ـــــ اس کی دیواریں بلوریں شیشہ کی ہیں ـــــ جن پر پیتل کے مجسّمے اور سنہرا سامانِ آرائش آویزاں ہے! ـــــ

اسی ایوان میں چند طلائی قفس بھی لٹکے ہوئے ہیں ـــــ سونے کی تیلیوں والی خوبصورت چیزیں ـــــ جن میں مینا، ہزار داستاں اور کوئلیں ہیں ـــــ پیٹھنے والی کوئلیں ـــــ بے بضاعت حیوان ـــــ زرپوش اور بلوریں "اشجار پر کاکاتو اور کلچڑیاں بیٹھی رہتی ہیں ـــــ جن کے شور سے جزیرہ ہمیشہ اس طرح گونجتا رہتا ہے جیسے کسی ربابِ زریں کی ایک آخری تھرتھراہٹ!

ایوان کے آگے مخملیں گھاس پر غیر تراشیدہ بلور کے تخت رکھے ہوئے ہیں ـــــ جن کے بیچ میں گہرے خلایا ہیں ـــــ ان میں موتی بھرے ہوئے ہیں ـــــ موٹے اور سڈول ـــــ چمکدار اور چکاچوند پیدا کرنے والے ـــــ جزیرہ کی نرم اور خنک ہوا ان خلایا میں چکر اکر ایک پُرنشاط نغمہ گاتی ہے ـــــ چاند کی شفاف کرنیں براہِ راست اُن پر چھنتی رہتی ہیں ـــــ وہیں ایک سیمیں صوفا ہے جس پر تم لیٹی رہتی ہو ـــــ اور ایک نادر الوجود بُلبُل سامنے بیٹھی ہوئی لوریاں گاتی رہتی ہے ـــــ یا کوئی پر حیات اور کیف آگیں نغمہ!

آفتاب کے طلوع ہوتے ہی میں تمہارے پاس آتا ہوں ـــــ اور تمہیں جگاتا ہوں ـــــ جگاتا ہوں محبت کا ایک گیت گا کر جسے سُن کر تم مسکراتی ہوا آنکھیں کھول دیتی ہو ـــــ پھر ہم نیچے اترتے ہیں ـــــ

اترتے ہیں ایک محتاط رقاصہ کی طرح آہستہ آہستہ پیر رکھتے ہوئے ان یاقوتی زینوں پر سے جن میں ہیرے جڑے ہوئے ہیں ـــــــ سفید مور اپنے چمکیلے پروں کی چھتریاں بنا کر ہمارے پیچھے پیچھے سینہ تانے ہوئے مستانہ وار آتے ہیں تاکہ سورج کی تیز روشنی سے ہمیں بچائیں ـــــــ!

جس زمردیں جھیل کے کنارہ پر آبی بنفشہ اُگا ہوا ہے اس میں ایک ہاتھی دانت کی کشتی ہے جو سطح پر پڑی ہچکولے کھاتی رہتی ہے ـــــــ ہم اس میں بیٹھ کر روانہ ہو جائیں گے اور ایک خواب میں محو ہو جائیں گے ـــــــ اور دیکھتے رہیں گے ایک نشاطِ سرمدی کا خواب ـــــــ خوبصورت اور بیان سے باہر ـــــــ اس وقت ہماری آنکھیں بھونروں اور بُطوں کے رقص کو دیکھتی رہیں گی ـــــــ بُلبلے نرم نرم موجوں کے تصادم سے بنتے اور ٹوٹتے رہیں گے ـــــــ غرض ہم کشتی میں بیٹھے ہوئے اس تابناک دن میں سوائے اس خواب آگیں سیر کے کچھ نہ کریں گے ـــــــ!

میرے محبوب! ـــــــ میں نے تیرے لئے ـــــــ آرزوؤں کی ایک کشتی بنائی ہے ـــــــ جو ماہ نو کی طرح خمیدہ ہے ـــــــ اور سفر کے لئے تیار ہے ـــــــ اُس کے چپو آبنوس اور صندل کے ہیں ـــــــ بادبان ریشمی اور زرکار ہیں ـــــــ ہم اس کشتی میں بیٹھ کر چاندنی کے سیمیں سمندر میں روانہ ہو جائیں گے اور ستارۂ شب کو اپنا رہنما بنائیں گے ـــــــ اور چلے جائیں گے ہم کشتی کھینتے ہوئے حتیٰ کہ دور ـــــــ بہت دور ـــــــ زمرد کے پہاڑ نظر آنے شروع ہو جائیں گے!!!

(ڈون بلانڈنگ)

ظفر دہلوی

دوست کو علیحدگی میں جھڑک لو لیکن اوروں کے سامنے اُس کی تعریف ہی کرو (رسولن)

جھوٹے دوست ہمارے سایے کی طرح ہیں کہ روشنی میں ہمارے ساتھ ساتھ ہیں لیکن جہاں ہم تاریکی میں آئے وہ غائب ہو گئے (ربوی)

قدرت نے کبھی دھوکا نہ دیا
اُس دل کو جس نے اُسے چاہا۔

ہنری باربوس

ہنری باربوس، جنگِ عظیم کا ایک سپاہی، آج ادبی حیثیت سے یورپ میں بالشویت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

وہ فرانسیسی اشتمالیت کے پُرجوش آرگن "لاہیومینٹی" کا ایڈیٹر ہے۔

اُس کی شاعری اُس کے پروپیگنڈا کے بوجھ تلے دب گئی ہے۔ باربوس لاطینی دنیا کا اپٹن سنکلیر ہے۔

"میں کوئی خیالی دنیا نہیں بسانا چاہتا۔ مجھے اُن لوگوں سے ایک قسم کا خوف معلوم ہوتا ہے جو حقیقت اور عمل سے دور رہ کر خیالات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

"نہ تو میں کوئی جنونی ہوں اور نہ فرقہ پرست۔ میں ہر فضا میں سُرخ جھنڈا لہرانے کا قائل نہیں۔ میں غریبوں کو امیروں کے خلاف برانگیختہ کر کے اول الذکر کو آخر الذکر پر مسلط نہیں کرتا، کیونکہ درحقیقت یہ کوئی تبدیلی نہیں!"

مسٹر جارج سلوسٹر ویرک جن کی کتاب سے پہلے بھی چند مضامین "ہمایوں" میں شائع ہو چکے ہیں لکھتے ہیں کہ ہنری باربوس نے یہ باتیں مجھ سے پیرس کے گرینڈ ہوٹل میں کیں۔ اُس کے زاہدانہ چہرے پر ایک دل میں کھُب جانے والی مسکراہٹ نمودار تھی۔ خون آشامی کی کوئی علامت اِس آتش نوا انسان کی صورت سے ظاہر نہ ہوتی تھی۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اُس کے خط وخال کی نرمی میں اضافہ کر رہی تھیں۔

ہنری باربوس ایک انگریز ماں اور ایک فرانسیسی باپ کا بیٹا ہے۔ وہ انگریزی زبان سمجھتا ہے، لیکن ذرا مشکل سے بول سکتا ہے۔ باربوس کو اس تبدیلی سے انتہا درجے کی دلچسپی ہے جو اُس کے خیالات نے انگریزی سیکسنی دنیا میں پیدا کر دی ہے۔ امریکن حکومت کا وہ کیسا ہی مخالف کیوں نہ ہو مگر وہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا گذشتہ جنگ کا فیصلہ امریکا نے کیا تھا۔ اُس کا خیال ہے کہ آئندہ جنگ کا فیصلہ بھی وہی کرے گا۔

باربوس کی تحریروں کا ترجمہ پچاس مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے جن میں اسپرانتو، چینی اور یہودی بھی شامل ہیں۔ اُس کی شہرت کا باعث سب سے بڑھ کر اُس کی کتاب "انڈر فائر" ہے جس میں اُس نے جنگ کی ایک حقیقی اور سچی تصویر کھینچی ہے۔ جب فرانس میں اس کتاب کی عام طور پر اشاعت ہو رہی تھی امریکن حکومت نے جو اُس وقت دُنیا میں جمہوریت کو سربلند دیکھنا چاہتی تھی اُس کا داخلہ اپنے ملک میں ممنوع قرار دیا تھا۔

میں نے اِس ذکر کو چھیڑا تو باربوس نے کہا "میں نے رضاکارانہ طور پر ایک سپاہی کی حیثیت سے اپنے آپ کو

جنگ میں پیش کر دیا تھا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو جنگ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ اپٹن سنکلیئر کی طرح میں بھی فصیح تقریروں سے متاثر ہو گیا تھا۔ کئی بار میں زخمی ہؤا اور دو دفعہ بہادری کے سلسلہ میں میرے نام کا اعلان کیا گیا۔ جنگ میرے نزدیک مقدس تھی، کیونکہ میں اسے استبداد کے خلاف آزادی کی جنگ سمجھتا تھا۔

"جب اپٹن سنکلیر اپنے خواب سے دردسرے کر بیدار ہؤا تو وہ اشتراکی جماعت سے مل گیا۔ جب مجھ پر استحادات اور اتحادیوں کا راز منکشف ہؤا، جب مجھے معلوم ہؤا کہ کیسے ہر جگہ جنگ کے دیوتا زحل کا ہاتھ قارون کے اشارے پر حرکت کر رہا ہے تو میں بالشویت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ذرا میرے ساتھ اُس عظیم الشان ڈرامے کا تصور سامنے لانے کی کوشش کیجئے جو کرۂ ارض کی سٹیج پر کھیلا جا رہا ہے ـــــ انسان انسان کے خلاف اور انسان اشیاء کے خلاف ایک کشمکش میں مُبتلا ہے۔

یہ افسوسناک کشمکش ایک معقول اور پُر حکمت تدبیر کے بغیر نہیں تھم سکتی۔

ہمیں حقیقت کے بجائے نمود پر نہ جانا چاہئے، نہ کُل کے بجائے جز پر نظر کرنی چاہئے۔ نہ ہمیں دلیل کی جگہ عذر قبول کرنا چاہئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں علامت کے بجائے سببِ مرض سے سروکار رکھنا چاہئے۔

نوعِ انسان بہت بیمار ہے۔ اگر کسی شخص کو کُل نظامِ جسمانی کے زہریلا ہو جانے کے باعث ناسور ہو گئے ہوں تو ہم کبھی اُس کو مقامی علاج سے اچھا نہیں کر سکتے۔ ہمیں مرض کی جڑ کو پکڑنا پڑے گا۔

اس لئے ہمیں انسان کی عام کیفیت اور حالت کو زیرِ بحث لانا ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ اُس کا مرض اُس کے جسم میں کس حد تک سرایت کر چکا ہے اور کس حد تک نمایاں ہو چکا ہے۔

کسی بہت بلند مقام سے زمین کو دیکھنے کی کوشش کیجئے۔ اپنے آپ کو ایک دیو قامت انسان فرض کیجئے جو چاند پر بیٹھ کر زمین کا مشاہدہ کر سکتا ہو۔

آپ کیا دیکھیں گے؟

ایک سیارہ جو سمندروں سے گھرا ہؤا ہے؛ ممالک جو پہلو بہ پہلو آباد ہیں، اور جن میں سے ہر ایک کا ایک مرکز ہے۔ جس میں سے اُس کی طاقت کا ایک چشمہ پھُوٹتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ اِن ممالک کے باشندے اپنی قومی سرحدوں کے تنگ دائرے میں مقید نہیں رہتے۔ وہ ان سرحدوں کے پار آ کر آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔

حیاتِ جدیدہ کی رو قومی بندشوں کے باوجود تمام اطراف میں بہتی ہے۔ یہ جنگ کے دوران میں اُن کو عبور کر جاتی ہے، یہ امن کی حالت میں اُن کو پامال کر دیتی ہے۔ یہ تجارت کے بہانے سے اُن کو اپنی موجوں میں غرق

کردیتی ہے، یہ اقوام کے مادّی اور روحانی ربط و ضبط میں اُن کی باہمی رکاوٹوں کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔

ہم شاد و ناشاد، حالات سے مجبور ہو کر، بین الاقوامیت کے جھنڈے تلے جمع رہتے ہیں۔ ایک قوم کی خوشحالی یا بدحالی ہر دوسری قوم پر اثر ڈالتی ہے۔

"یہی حقیقت ہے جس کو معاہدۂ صلح کے مرتبوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ انسانی یک جہتی صرف ایک عین نہیں ہے یہ ایک حقیقت ہے۔

چاند کی کرسی پر بیٹھے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ زمین پر سرمائے کے بین الاقوامی نظام، اور مستقل اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی آئین کا ایک جال پھیلا ہُوا ہے جس کی بنیاد مستقل ادارات، قوانین، دفتری طاقتوں اور اخلاقیات پر ہے۔

سرمایہ داری کا سب سے بڑا مقصد فرد کے گھر میں دولت کا انبار لگانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سرمایہ داری انسانی حرص سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بڑے حربے مقابلہ اور تخصیص ہیں۔ اس کا مطلب ہے تفریق، کشمکش، جنگ اس کے اولیں معنی خود غرضی ہیں۔ اِس کا انجام قومی اور انفرادی تباہی ہے۔

طاقت طاقت کو کھینچتی ہے اور دولت دولت کو جمع کرتی ہے۔ یہ قانون شدید ہے اور عالمگیر۔

ہمیشہ اور ہر زمانے کی معاشرت میں یہ قانون جاری و ساری ہے کہ چھوٹی مچھلی کو درمیانے پیٹ والی مچھلی کھا جاتی ہے اور درمیانے پیٹ والی مچھلی کو بڑی مچھلی لقمہ بنا لیتی ہے۔

لقمہ سازانہ تفرید کا یہ عمل جو بعض اوقات مفید نتائج بھی پیدا کرتا ہے ہم نے دیکھا ہے کہ سلطنتوں کے تاریخی ارتقا میں بھی کارفرما ہُوا ہے، شاہنشاہیوں کی تعمیر میں۔

ہم اسی عمل کو آج صنعت کے معاملے میں بھی کارفرما دیکھ رہے ہیں۔ حاکم طاقتوں، دولت کے مالکوں، قارون کے پرستاروں، وال سٹریٹ کے خداوندوں کے قبضے میں تمام صنعت اور مادی طاقتوں کی باگ ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ حد سے زیادہ ترقی ـــ حد سے زیادہ دولت۔ یہ حد سے بڑھی ہوئی دولت شہنشاہیت کا حقیقی حاصل ہے۔

دولت، میں پھر کہتا ہوں، انفرادی ہے اشتمالی نہیں۔ جان ڈی راک فیلر اور ہنری فورڈ کے زمانے میں امیر اور غریب کا تقابل ایک ناقابلِ فہم تناسب پیش کرتا ہے۔

دنیا کی تمام دولت سمیٹ لی گئی ہے۔ اسے سمیٹنے والی بڑی بڑی صنعتیں ہیں۔ پھر بڑے بڑے مالی ادارات اور پھر وہ لوگ جو ان مالی مخزنوں کے مالک ہیں، گویا امریکا کے سرمایہ دار۔

دنیا میں امریکا ہی ایک امیر ملک ہے، امیر ملک سے میری مراد وہ ملک ہے جہاں امیروں کی تعداد نسبتہً زیادہ ہے، اور جہاں کے امیر دنیا بھر میں زیادہ دولتمند ہیں۔ ورنہ یُوں تو ہر ملک امیروں اور غریبوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

سرمایہ جو معاشرہ کی زندگی کا سامان ہے نیویارک کے صرافہ میں آکر اُس کی حرکت رُک جاتی ہے۔ یہاں وال سٹریٹ اور براڈسٹریٹ کے درمیان اتفاق سے موجودہ تہذیب کا تخت ہے۔

"لیکن دوسری طرف ایک اور جال بھی بچھ رہا ہے۔ یہ وہ ہے جس کی تشکیل عوام کے ہاتھوں ہو رہی ہے۔ اب تک عوام کسی شمار قطار میں نہ تھے اور سرمایہ دار اقلیت کی شان برقرار رکھنے کے لئے میدانِ جنگ میں اور کارخانوں میں اُس کا خون پسینہ بہانے سے دریغ نہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اب ان کی تعداد شمار سے باہر ہو چکی ہے اور وہ ایک زبردست طاقت ہیں۔ اگر وہ متحد اور منظم ہو جائیں تو کوئی دوسری طاقت ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔

"اس امر کے لئے کہ یہ عجیب و غریب طاقت حقیقی اقتدار حاصل کرے بصیرت اور تنظیم کی ضرورت ہے۔

"عوام نہایت سُرعت کے ساتھ اس ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ اطاعتِ مجہول پر ہر جگہ اعتراض کیا جاتا ہے اِس جنگ کی مہلیت جس سے تجارتی مفاد وابستہ ہوں اور جو چند امرا کی خاطر برپا کی جائے، اُن معاہداتِ صلح کی لغویت جن سے امن بحال نہیں ہوتا بلکہ اِس کے برعکس ہر جگہ جنگ کے آثار نظر آتے ہیں، اور وہ خوفناک حالت جس میں تقریباً تمام قومیں اپنے آپ کو دیوالیہ پن اور تباہی کے کنارے پر پاتی ہیں، دلائل قاطع ہیں ایک ایسی صورتِ حالات کے خلاف جس سے عوام کا مفاد وابستہ نہ ہو بلکہ ذلیل اقلیتوں کی شان و شوکت مدِّ نظر ہو۔

اس عدم مساوات کے خلاف جسے تخریب اور غارتگری کے اقتدار نے نوعِ انسان پر صرف اس لئے مسلط کر رکھا ہے کہ اُن عظیم صندوقوں کو اور بھی پُر کیا جائے جو پہلے ہی سونے سے لبریز ہو رہے ہیں عوام کی جماعت نے ایک تجویز پیش کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ نسلِ انسانی کی از سرِ نو ایک ایسی تنظیم کی جائے جس کی بنا سیاسی حیثیت سے مطلق مساوات ہو، اور مزدور کا اقتدار اور بین الاقوامیت۔

"مختصر یہ کہ وہ دولتِ عامہ کے اصول کے حامی اور شخصی دولت کے اصول کے خلاف ہیں۔ ہم استبداد کی قارونیت کو شکست دینا چاہتے ہیں جو بڑے بلند بانگ دفتری اعلانات کے باوجود آج دنیا میں ہر جگہ کارفرما ہیں۔

"سرمایہ داری تمام قوتوں پر غالب آجاتی ہے، کیونکہ اُس کے قبضے میں نہ صرف روپیہ ہے بلکہ حکومت کے سارے نظامات بھی ہیں۔ فوج سے لے کر پولیس تک اور عدالتوں سے لے کر مدارس تک اور عبادت گاہوں تک اس کا اثر و اقتدار ہے۔

"موجودہ وقت میں سرمایہ داری پر ایسی آفت برپا ہے کہ وہ اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئی ہے۔ ایک عیارانہ پروپگنڈا کے ذریعہ سے اس نے جمہور کا ایک حصہ اُن سے الگ کر کے انقلابی تحریک کو روک دیا ہے۔ سرمایہ داری نے متوسط طبقے کا اغوا کر لیا ہے۔

"سرمایہ دارانہ پروپگنڈا نے انقلاب کے فطرتی اور احمقانہ خوف کے مدِ نظر جو اوسط درجے کے آدمی کی کمینوں میں سے

ایک کمی ہے، زائد پولیس اور زائد فوج بھرتی کی ہے جس میں زیادہ تر متوسط طبقے کے افراد ہیں۔ فاسیت کے معنی یہی ہیں۔

"فاسیت کے آغاز اور نشوونما کا باعث قطعی طور پر مستحکم طاقتوں کی امداد اور بین الاقوامی سرمائے کی مداخلت ہے انگریزی اور امریکن سرمایہ مسولینی کو مدد دے رہا ہے۔ یہ سرمایہ نہ صرف اُس کی ہستی کے قیام کا موجب ہے بلکہ اٹلی کی مالی مشکلات کو بھی کم کر رہا ہے۔

"اطالوی حکومت کو عقلمند کون کہہ سکتا ہے کہ اُس کی خوئے تسلیم نے انقلاب سے ڈر کر فاسیت کو اپنے ہی خلاف ہتھیار باندھنے کی اجازت دے دی ہے یا اُس کے سامنے اپنا سر خم کر دیا ہے۔

"تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں فاسیت کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ وطن پرست جماعتیں، سامیت کے دشمن، غیرملکیوں کی مخالف لیگیں، فوجی دستے اور ان تجربہ کار لوگوں کی انجمنیں جنہیں رشوت دے کر رام کر لیا گیا ہے اس "نیک دل" فوج کی ترکیب میں شامل ہیں۔

"میں جانتا ہوں کہ فاسیت کیا ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ جس وحشیانہ طریق سے یہ ریاستہائے بلقان میں کام کر رہی ہے اور کسی جگہ نہیں کر رہی۔ عمال پر وہاں اس تحریکِ عظیم کے ظلم خوب آشکار ہیں۔ نسبتہً بڑے ملکوں میں یہ تحریک کچھ زیادہ پیچیدہ اور مستور شکل میں پائی جاتی ہے۔ رومانیہ میں یہ اپنی پوری شان سے جلوہ گر ہے۔

"اٹلی کے فرمانرواؤں کے مقابلے میں جن کی ملکہ ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں گزری اپنے حقیقی آقاؤں کی آستاں بوسی کے لئے وال سٹریٹ میں حاضر ہوئی تھی، مسولینی بہ ذاتِ خود عمومی حکومت کا زیادہ ہوا خواہ ہے۔

"اپنی کتاب "لا انجین منٹ" میں میں نے تاریخی واقعات کے خطرناک توازن اور ہر زمانے میں انسانی مصائب کی مشابہت کو واضح کیا ہے۔ میں نے دکھایا ہے کہ کس طرح تاریخ ہمیشہ اپنے مضامین کا سرقہ کرتی ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ کس طرح معاشرہ کے آغاز سے لے کر اب تک انسان نے انسان کو ایک ہی طرح پر بہکایا ہے۔

"کتاب "لا لورپو" میں جسے شائع ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے میں نے فاسیت پر جسے عہدِ حاضر کی بربریت کہنا چاہیئے براہ راست اور شدید طور پر حملہ کیا ہے۔ میں نے بلقان کی مصیبت کا مطالعہ بغیر کسی تعصب کے کیا ہے۔ میری روش غیر جانبدارانہ ہے اور علمی اصول کے مطابق۔ میں نے اس کتاب میں اپنی تحقیقات کو نہایت محتاط اور آسان طریق پر بیان کر دیا ہے۔

"میری کتاب اُس جرمِ عظیم کا ثبوت مُہیا کرتی ہے جس کا ارتکاب یورپ میں عمّال اور فلاّحین کے خلاف ہو رہا ہے اور میں نے اس سلیقہ مندانہ جرم کے معنی اور اس کی حقیقی وجوہ بھی اس میں بیان کر دی ہے۔

"اس کی تخلیق کا موجب کوئی وحشیانہ جذبہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مستبدانہ سیاسی منصوبے کا نتیجہ ہے جس کی حقیقی

وجہ سرمایہ داری ہے۔ سرمائے اور انسانیت میں سے میں نے انسانیت کو انتخاب کیا ہے"۔

ویرک نے کہا "سرمایہ داری اور عمومیت کی کشمکش کا آپ کے خیال میں فیصلہ کب ہوگا؟"

باربوس نے جواب دیا "یہ فیصلہ کل بھی ہوسکتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ ایک صدی بھی لگ جائے"۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ان دو قوتوں میں نیکی اور بدی کی طرح یا ایرانیوں کے یزدان و اہرمن کی طرح توازن پیدا ہو جائے،

باربوس نے اپنے حساس ہاتھوں کو حرکت دے کر کہا "کون جانتا ہے؟ مگر میں پھر بھی ان میں سے ایک ہی کو انتخاب کروں گا"

ویرک نے کہا جب آپ فرانسیسی فوج میں شامل ہوئے تھے تو اُس وقت آپ کو یقین تھا کہ آپ عمومیت کے لئے لڑ رہے ہیں۔ آج آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ سے غلطی ہوئی تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کو پھر مغالطہ ہو گیا ہو؟"

باربوس نے کہا "میرا خیال صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی، مگر میں اسے صحیح سمجھتا ہوں۔ لیکن خواہ صحیح ہو یا غلط مجھے اپنے شعور کی پیروی کرنی ہے۔

منصور احمد

خُدا

اپنے جسم کے اعضا کو میں پوری طرح نہیں سمجھ سکتا تو خدا کو کیا خاک سمجھوں گا

(سینٹ برنارڈ)

خدا نے اپنی قوت کی حدود آپ مقرر کردی ہیں اور پھر وہ اُن حدود میں اپنے مقاصد پورے کرتا رہتا ہے

(پیلے)

خدا وہ روشنی ہے جو بغیر خود دکھائی دیئے ہمیں تمام چیزیں دکھاتی اور آپ رنگ برنگ کا لباس پہنتی رہتی ہے۔ تیری آنکھ اس کی کرن کو نہ دیکھے نہ دیکھے لیکن تیرا دل اُس کی گرمی کو محسوس کرلیتا ہے!

(رسکن)

"گلچیں"

شہرت

(سانیٹ)

کوئی دیتا ہے بہت دور سے آواز مجھے
چھپ کے بیٹھا ہے وہ شاید کسی سیّارے میں،
نغمہ و نور کے اک سرمدی گہوارے میں؛
دے اجازت جو تری چشم فسوں ساز مجھے،
اور ہو جائے محبّت پرِ پرواز مجھے،
اُڑ کے پہنچوں میں وہاں رُوح کے طیارے میں،
سُرعتِ نور سے یا آنکھ کے پلکارے[1] میں؛
آسماں بھی نظر آتا ہے درِ باز مجھے!

صدیوں تک ڈھونڈھتے رہ جائیں گے دُنیا کے مکیں،
دور بینیں بھی نشاں تک نہ مرا پائیں گی،
اور نہ پیکر ہی مرا آئے گا پھر سوئے زمیں،
عالمِ قدس سے آوازیں مری آئیں گی؛
بحرِ خمیازہ کشِ وقت کی امواجِ حسیں،
اک سفینہ مرے گیتوں سے بھر لائیں گی!

ن۔م۔راشد

[1] جھپک کا پنجابی مترادف

جنگ

اکتوبر کے ہمایوں میں آپ کا مترجمہ افسانہ "بچے اور بوڑھے" دیکھنے کے بعد مجھے انگریز شاعر سوؔدے کی ایک اسی ماحول کی نظم یاد آگئی۔ میرا خیال ہے کہ اگر نومبر میں یہ شائع ہو جائے تو آپ کا افسانہ مطالعہ کرنے والوں کو کچھ اور ہی لطف دے جائے گی۔ جلدی میں جیسا کچھ بھی ہو سکا ترجمہ کر کے روانہ کرتا ہوں مگر مجھے امید نہیں کہ ترجمہ آپ کے پسند آئے۔ اپنی علالت کے باعث نظر ثانی بھی نہیں کر سکا۔ افسانے اور نظم دونوں میں جنگ کے متعلق معصوم بچوں کے خیالات ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں جنگ کی نامطبوع اور نفرت انگیز صورت اپنی پوری کراہیت کے ساتھ نظر آتی ہے

موسم گرما کی ایک شام کو بوڑھا کاسپر اپنی جھونپڑی کے دروازے کے آگے بیٹھا سورج کے ڈوبنے کا منظر دیکھ رہا تھا اور ڈھلتی ہوئی نرم سنہری دھوپ سبزہ زار پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے روبرو اس کی پوتی ولہلمن کھیل رہی تھی۔

چھوٹی لڑکی نے دیکھا کہ اس کا بھائی پیٹرکن کسی گول اور بڑی سی چیز کو تعجب کی نظروں سے دیکھتا ہوا آرہا ہے جو اس نے نالے کے کنارے کھیلتے ہوئے پائی تھی اور اب وہ دادا سے پوچھنے آرہا تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔

بوڑھے کاسپر نے اس کو بچے کے ہاتھ سے لیا اور کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر غمگین انداز سے سر ہلاتے ہوئے ایک آہ سرد کے ساتھ کہنے لگا کہ یہ کسی بدنصیب انسان کی کھوپڑی معلوم ہوتی ہے جو جنگ بلنہم میں مارا گیا تھا۔

اس نے بتایا کہ ایسی لاتعداد کھوپڑیاں باز و کے کھیت میں مدفون ہیں۔ اور جب میں ہل چلاتا ہوں تو زمین سے مٹی الٹنے پر بہت سی باہر نکل آتی ہیں۔ کیونکہ کئی ہزار آدمی اس جنگ میں کام آئے تھے"

چھوٹا پیٹرکن شوق سے چلا اٹھا "دادا جان بتائیے یہ جنگ کیوں ہوئی" ولہلمن بھی منتظر نگاہوں سے دادا کے چہرے کو دیکھنے لگی اور بولی "دادا جان ہمیں اس جنگ کا پورا حال سنائیے"۔

بوڑھے کاسپر نے کہا "یہ لڑائی انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہوئی۔ مگر اس کا باعث کیا تھا، میں سمجھ نہیں سکتا۔ بہر حال جیت انگریزوں کی رہی۔

"تمہارے پردادا اس زمانے میں اسی گاؤں میں نالے کے قریب رہتے تھے۔ دشمنوں نے ان کا مکان جلا کر خاک کر دیا اور انہیں اپنے بیوی بچوں سمیت سر چھپانے کے ٹھکانے کی تلاش میں یہاں سے فرار ہونا پڑا۔

"ملک میں چاروں طرف آگ اور تلوار کے ساتھ بربادی پھیلی ہوئی تھی۔ دہشت اور تکالیف سے مرتو جدا کئی حاملہ عورتیں اور نوزائیدہ بچے مر گئے۔ لیکن ایسی باتیں تو جنگ کے وقت ہوا ہی کرتی ہیں

میدان جنگ کا منظر بڑا خوفناک تھا۔ لاکھوں نعشیں دھوپ میں پڑی سڑ رہی تھیں اور ان پر زاغ و زغن منڈلا رہے تھے۔ مگر خیر ایسی باتیں تو ہر جنگ کے بعد ہوا ہی کرتی ہیں

"ڈیوک آف مالبرو اور پرنس یوجین نے جو انگریزوں کے سپہ سالار تھے، فتح حاصل کی"۔

"واہ! جنگ تو بڑی خراب اور ڈراؤنی چیز ہے" ننھی ولہلمن بے اختیار یوں چلا اٹھی۔

"نہیں پیاری بچی۔ یہ ایک معرکۂ عظیم تھا اور ہر شخص کی زبان پر فاتح ڈیوک کی تعریف تھی"۔

چھوٹے پیٹرکن نے پوچھا "مگر آخر اس خونریزی سے کیا فائدہ ؟"

"فائدہ ؟ یہ میں خود نہیں کہہ سکتا۔ لیکن بہر صورت وہ ایک عظیم الشان فتح تھی"۔

تنویر قریشی

چند مشرقی مفکّرینِ سیاست

(۲)

قدیم مشرق کا دوسرا ممتاز مصنف کوتلیا ہے جو چندر گپت موریا کا وزیراعظم تھا۔ چندر گپت موریا چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں شہر پاٹلی پترا (موجودہ پٹنہ) میں حکومت کرتا تھا۔ اس کی سلطنت بہت وسیع تھی۔ یعنی ایک طرف تو اس کے ڈانڈے افغانستان اور بلوچستان سے ملے ہوئے تھے اور دوسری طرف اس کی سرحدیں حدود دکن تک پہنچتی تھیں۔ کوتلیا کی تاریخِ پیدائش اور وفات کا صحیح علم آج مشکل ہے۔ اس کے بچپن کے حالات بھی مشکل سے ملتے ہیں۔ تعلیمی کیفیت کا تو خیر پوچھنا ہی کیا۔ خلاصہ یہ کہ چندر گپت کا وزیراعظم مقرر ہونے سے قبل ہم کو اس کے حالات بالکل معلوم نہیں۔ ہاں نندا خاندان کی تباہی اور چندر گپت کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے ضمن میں اس کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ بعد کی کتابوں میں مثلاً کتھا گرت سگرہ میں اس کا ذکر موجود ہے مگر اسی زمانہ سے متعلق۔ ان کتابوں سے جو معلومات فراہم ہوئی ہیں اُن سے پتا چلتا ہے کہ کوتلیا (جس کو چانکیہ اور وشنو گپت بھی کہتے ہیں) ایک غریب برہمن گھر کا چشم و چراغ تھا اور پاٹلی پتر میں رہتا تھا جہاں نندا خاندان کی حکومت تھی۔ وقائع نگاروں کا بیان ہے کہ اس خاندان کے آخری بادشاہ کی دو بیویاں تھیں، جن میں ایک ذات کی شودر تھی اور اس کا نام مورا تھا۔ اس سے جو اولاد پیدا ہوئی اُس کا نام موریا رکھا گیا۔ لڑکا بہت خوبصورت ذہین اور چست و چالاک تھا۔ عنفوانِ شباب میں اس کی کوتلیا سے دوستی ہوگئی۔ نوجوان موریا کو کوتلیا کا بہ سبب اس کی علمی قابلیت اور ذہانت کے بڑا خیال تھا۔ شہزادے اور کوتلیا کے درمیان دوستی اور اخلاص کا رشتہ قائم ہوا تو دوسرے درباریوں کو ناگوار ہوا اور اس سلسلہ میں جو واقعہ پیش آیا وہ نندا خاندان کے زوال کا باعث ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ کسی تقریب میں کوتلیا کو دربار میں آنے کی دعوت دی گئی کوتلیا دربار میں گیا تو درباریوں نے سازش کر کے اس کو وہاں سے نکلوا دیا کوتلیا نے اس میں اپنی بہت ذلت محسوس کی اور فوراً نیت کر لی کہ نندا کی حکومت کو سرزمینِ مگدھ سے بیخ و بن سے اکھاڑ دے گا۔ ساتھ ہی اُس نے اپنے نوجوان دوست موریا سے اپنے ارادے کا اظہار کیا اور کہا کہ میں تم کو مگدھ کا راجہ بناؤں گا بشرطیکہ تم مجھ کو اپنا وزیراعظم مقرر کرو۔ چندر گپت موریا نے کوتلیا کی صلاح مان کر اس سے عہد کیا کہ راجہ ہونے پر تم وزیراعظم مقرر کئے جاؤ گے آخر کار جب زمانہ نے ورق اُلٹا اور نندا خاندان کی حکومت کا چراغ آناً فاناً گل ہوگیا تو چندر گپت موریا مگدھ کا راجہ ہوا اور اُس نے کوتلیا کو

اپنا وزیر اعظم مقرر کر کے اپنا وعدہ پورا کیا۔

کوتلیا نے اپنے عہدِ وزارت میں ایک کتاب لکھی جو آج قدیم ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی کیفیت کا آئینہ ہے۔ اس کتاب کا نام ارتھ شاستر ہے۔ اسمتھ صاحب اپنی تاریخ ہندوستان میں لکھتے ہیں کہ ارتھ شاستر میں شمالی ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستوں کا حال چندرگپت سے پہلے اور ان کی طرز حکومت نہایت وضاحت کے ساتھ درج ہے۔ ارتھ شاستر اس پایہ کی کتاب ہے جس سے قدیم ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی نظام پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کا شمار اب تک دنیا کی ان مشہور اور گم شدہ کتابوں میں تھا جن کے حوالے دوسرے مصنفین کی تصنیفات میں ملتے ہیں۔ سنسکرت کا مشہور مصنف کمندکا اور راجہ ہرش کا مشہور سوانح نگار بان اس کو کھوئی ہوئی کتابوں میں سمجھتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز تک اس کتاب کا ذکر اسی طرح آتا ہے۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں حکومت میسور کے مشرقی کتب خانہ کے مہتمم مسٹر شاما ستری نے اپنی انتھک کوششوں سے اس کتاب کا آخر پتہ چلا ہی لیا۔ جب انہوں نے اس کتاب کے برآمد ہونے کا اعلان کیا تو دنیا اچنبھے میں پڑ گئی اور کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی کتاب ہے۔ برسوں محققین میں خوب خوب قلمی زور آزمائیاں ہوتی رہیں کوئی کہتا تھا کہ یہ وہی کتاب ہے کوئی اس کے وجود سے سرے سے انکار کرتا تھا۔ بالآخر برسوں کے بحث اور مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ برآمد شدہ کتاب اصلی ارتھ شاستر ہے۔ اس کا پہلا انگریزی ترجمہ ۱۹۱۵ء شائع ہوا۔

ارتھ شاستر کے دو حصے ہیں۔ حصۂ اول میں کوتلیا مختلف ریاستوں کے دستور اساسی پر بحث کرتا ہے اور حصۂ دوم میں حکومت کا ذکر بحیثیت فن کرتا ہے اور اسی سلسلہ میں حکومت کی ابتدا کے متعلق وہ اپنا نظریہ پیش کرتا ہے اپنے اس نظریہ میں اس نے گویا انگلستان کے مشہور فلسفی ٹامس ہابس (۱۵۸۸ - ۱۶۷۹) کے نظریات کی پیش گوئی کی ہے۔ اپنے نظریہ کے اثبات میں اس کا طریقۂ بحث بالکل سقراط کا سا ہے۔ جس طرح ایک چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اسی طرح کوتلیا ریاست اور غیر ریاست میں امتیاز کرتا ہے۔ بارکر صاحب اپنی مشہور تصنیف "یونان کے سیاسی نظریات" میں فرماتے ہیں کہ سیاسی خیالات کی ابتدا کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ فرد اور ریاست کی ضد کا علم ہو اور پھر ہر سیاسی مفکر کا فرض ہے کہ وہ اس ضد کو جس کی قوت اثر کو وہ ابھی ابھی وجود میں لایا ہے اصل شئے سے ملا دے یا پھر اُس کو مٹا دے۔ اِس ضد کے تصور کے بغیر علم سیاست کے مسائل کا جو ریاست۔ اثر۔ قانون وغیرہ کے ماخذ ہیں حل ہونا مشکل ہے۔ ان میں یک رنگی اور مصالحت پیدا کئے بغیر کسی مسئلہ کا حل ناممکن ہے کوتلیا نے ان مسائل کے حل کے لئے ضد کو محسوس کیا اور تصور میں ایک غیر ریاست کی ترتیب دی جو ریاست کی ضد تھی۔ اگر ریاست امن وصلح۔ اور انسانی تعلقات کی بنا پر قائم ہے تو غیر ریاست بالکل اس کا الٹا نقشہ پیش کرتی ہے یعنی وہاں۔ جنگ خونریزی ابتری اور بے ترتیبی کا دور دورہ ہے۔ ہر شخص اپنا محافظ آپ ہے نفسی نفسی

گویا ہر فرد کی پیشانی پر کھدا ہوا ہے۔ یہاں جو قانون چلتا ہے وہ ریاست کے قانون سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں قوت کی جنگ ہر وقت جاری رہتی ہے جس کا نام متسیانیائے یا ماہی منطق ہے۔ یعنی جس طرح ایک بڑے تالاب میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو بے دست و پا پاکر ہڑپ کر لیتی ہیں بالکل اسی طرح غیر ریاست میں مضبوط اور طاقتور آدمی کمزوروں کو دباتا اور اُن پر ظلم کرتا ہے۔ وہاں کا قانون طاقت اور نظام شمشیر ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص خوف و ہراس کی زندگی بسر کرتا ہے اور ہر وقت موت سے ڈرتا رہتا ہے کہ نہ معلوم کس وقت موت کا تلخ پیالہ حلق سے اتارنا پڑے۔ خوف و ہراس کی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے ہر شخص کو مختلف پیمانہ سے قوت اور طاقت عطا کی ہے اور اس تنازع للبقا میں معلوم نہیں کون کس پر غالب آجائے۔ چونکہ آدمی جبلی طور پر خود غرض اور مطلب آشنا واقع ہوا ہے اس لئے لازمی ہے کہ ایک شخص کے مفاد دوسرے کے مخالف ہوں اور اس کشمکش مفاد میں جنگ کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی حالت کو ہابس بہیمانہ اور غیر مہذب کہتا ہے۔ کوٹلیا کہتا ہے کہ اس حالت کا قلع قمع کرنے کے لئے لوگوں نے منو کو جو سورج کا لڑکا تھا اپنا بادشاہ منتخب کیا اور غلہ کا چھٹا حصہ اور مالی تجارت کا دسواں حصہ اور کچھ سونا بادشاہ کو حق حفاظت میں دینا شروع کیا۔ بادشاہ کو یہ ذرائع حاصل ہونے کے بعد اتنی سہولت ہوگئی کہ وہ امن و امان قائم رکھ سکے۔ اور یہی ریاست کی ابتدا ہے۔ ریاست میں سب سے زیادہ ذی اختیار بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ ریاست کے شرفا میں اولیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ چونکہ وہ قانونی بادشاہ ہے۔ اس لئے اس کی ذات ہی قانون ہے۔ وہ نہ تو خراج ادا کرتا ہے اور نہ کسی طرح کے محصول کا دیندار ہے۔ ملک کی تمام غیر مدخولہ و غیر مقبوضہ جائداد کا وہ مالک ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ہی وقت میں منبع قانون بھی ہے اور صاحب اختیار بھی مجسٹریٹ بھی اور قانون ساز بھی۔

کوٹلیا کے مطابق ریاست کے سات اجزاء ترکیبی ہیں جن کو وہ سپتنگا کہتا ہے۔ یعنی بادشاہ۔ وزیر۔ ملک قلعہ۔ فوج۔ مال اور ریاست کے بہی خواہ۔ یہی سات اجزا ہیں جن پر ہند و فلاسفۂ سیاست اپنی آرا کا اظہار کرتے ہیں۔ ان اجزا کے باہمی تعلقات اور جداگانہ حیثیت پر نظر ڈالنا ایسے تمام شاستروں کا حصہ رہا ہے جو کوٹلیا کے ارتھ شاستر سے شروع ہو کر بھوج کی تصنیفات تک ختم ہوتے ہیں۔ عدل و انصاف کی بنیاد اس کے خیال میں کچھ تو اخلاقیات پر، کچھ مذہبی کتابوں پر اور کچھ رسم و رواج پر اور کچھ عقل پر قائم ہے۔ کوٹلیا عقل کو ایک ضروری جز قرار دیتا ہے اس لئے کہ بغیر عقل کے عدل ناممکن ہے۔ مگر سارا دارومدار اس کا عقل پر نہیں بلکہ تمام چیزوں کی مجموعی حالت پر ہے۔ آج بیسویں صدی میں یہ نکتہ صدیوں کے بعد حل ہوا ہے کہ انسانی زندگی پر اثر رکھنے والی صرف عقل ہی نہیں ہوتی بلکہ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں جو عقل کی دنیا سے کوسوں دور ہیں۔ دورِ حاضرہ کے ایک ممتاز مصنف مسٹر برٹرینڈ رسل کا قول ہے کہ انسانی زندگی کا رُخ بدلنے میں جذبۂ بے اختیار کا بہ نسبت عقل و فہم کے زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اپنی کتاب "سماجی زندگی

کے اصولِ تعمیر" میں آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ انسان کے تمام افعال کے دو سرچشمے ہیں۔ ایک جذبہ دوسرے خواہش اپنی خلقت کے بعض اثر پذیر اجزا میں جسم پر بجائے خواہش کے جذبہ کا زیادہ دخل ہوتا ہے اور اسی جذبہ کے تحت ہم چند افعال کے مرتکب ہوتے ہیں"۔ کوتلیا انسانی فطرت کے اس راز سے واقف تھا اور اسی لئے اس نے عدل وانصاف کی بنا صرف عقل پر رکھنے کے بجائے انسانی زندگی کی مجموعی حیثیت پر رکھی۔ عدالت کے سلسلہ میں اس نے مذہبی کتابوں کو بھی ایک درجہ دیا ہے۔ لیکن ایک موجودہ زمانہ کے پروفیسر بنے کمار سرکار کا خیال ہے کہ ہندو ریاست ایک لامذہب ریاست تھی۔ ملکی سیاست اور ملکی تاریخ پر مذہب کا کوئی قابلِ ذکر اثر نہ تھا۔ سیاست مذہب کی قید سے آزاد تھی۔ معاملات کے تصفیہ میں پروہتوں اور برہمنوں کا دخل مذہباً کچھ بھی نہ تھا۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں مذہبی حکومت کا سرے سے وجود ہی نہ تھا۔ اسی طرح کے خیالات کا اظہار الہ آباد کے پروفیسر ڈاکٹر بینی پرشاد نے اپنی کتاب "قدیم ہند میں ریاست" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کوتلیا کی آزادانہ تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروہتوں اور برہمنوں کا اتنا اثر نہیں تھا جتنا دھرم شاستر کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے"۔ میرے خیال میں یہ دونوں حضرات قدیم ہندوستان کو عہدِ حاضر کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور اس کو قدیم یونان کے پہلو بہ پہلو کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قدیم یونان میں مذہب کا اثر بہت کم تھا۔ فنونِ لطیفہ اور ادب نے مذہب کی قید سے آزاد ہو کر خاص ترقی کی تھی۔ مگر ہندوستان کی تاریخ اور ہی کچھ کہتی ہے۔ یہ ملک بے شمار دیوتاؤں کا مامن اور مرکز رہا ہے۔ مذہبیت یہاں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ممکن ہے کہ معدودے چند نفوس فلسفہ کی وسیع گھاٹیوں میں بھٹک کر کہیں سے کہیں چلے گئے ہوں مگر سوسائٹی مذہب کی قید سے کبھی آزاد نہ تھی۔ مذہب ہندوستان کا امتیازِ خصوصی رہا ہے اور مذہبی جذبہ ہمیشہ غالب رہا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں مندرجۂ بالا حضرات کی رائے صحیح نہیں ہے۔

بادشاہوں کے اخلاق وعادات کا ذکر کرتے ہوئے کوتلیا بادشاہوں کے لئے چند قواعد مقرر کرتا ہے مثلاً بادشاہ کو صاحبِ نفوذ و اثر اور حاملِ عدل وانصاف ہونا چاہئے اور اپنے دشمنوں کی سرکوبی کے لئے اس میں کافی قوت ہونی چاہئے۔ چونکہ بادشاہ کے فرائض بہت وسیع ہیں اور ایک زمانہ کی حفاظت اس کے ذمہ ہے اس لئے بادشاہ کو اخلاقی اور دماغی حیثیت سے بہت بلند ہونا چاہئے۔ نہ تو اس کو کسی کی جائداد ہڑپ کرنے کی اور نہ کسی کی بیوی پر دانت لگانے کی فکر ہونی چاہئے۔ بس عدل اور مکمل عدل اس کا شیوہ ہونا چاہئے۔

کوتلیا کا خیال ہے کہ ان تمام خصوصیتوں کے باوجود بادشاہ کو مطلق العنان نہ ہونا چاہئے بلکہ ریاست کے عہدہ داروں اور وزیروں سے مشورہ کر لینا چاہئے۔ اس لئے کہ گاڑی صرف ایک پہیہ سے نہیں چلتی۔ وزراء کا تقرر اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ بادشاہ کو امورِ سلطنت میں ہر ممکن طرح سے مدد دیں۔ لیکن کسی نازک موقع پر

یہ بالکل ضروری نہیں کہ وہ سب سے صلاح لے اس لئے کہ اکثر اوقات بہت سے آدمیوں سے صلاح لینے میں کام خراب ہوجاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کی ایک نہایت زبردست مثال ایامِ جنگ میں ملتی ہے۔ جب جنگ نے طول پکڑا اور برطانوی وزارت کے لئے ناممکن ہوگیا کہ ہر جزئی واقعہ پر نظر رکھے تو مسٹر لائڈ جارج نے ایک جنگی وزارت ترتیب دی جس میں انے گنے تھوڑے سے آدمی تھے اور جنگ کو کامیاب بنانے کا سہرا اسی مختصر جماعت کے سر ہے۔

کوتلیا بادشاہت یا شخصی حکومت کو پسند کرتا ہے جو صاحب قوت ہونے کے ساتھ صاحب عدل و انصاف بھی ہو۔ ممکن ہے کہ اس نے سکندرِ اعظم کے حملہ کے وقت چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ناگوار حشر دیکھ کر یہ رائے قائم کی ہو اس لئے کہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں عام طور پر ایک بڑی ریاست کے مقابلہ میں کمزور ہوتی ہیں۔ سلطنتِ موریا نے کوتلیا کے عہدِ وزارت میں کافی وسعت اختیار کرلی تھی یعنی شمال کی طرف تو اس کی سرحد ایران اور وسط ایشیا سے ملتی تھی اور جنوب کی جانب ساحلِ بحر ہند تک جا کر ختم ہوجاتی۔ کوتلیا پہلا شخص ہے جس نے جغرافیائی حیثیت سے ہندوستان کے لوگوں کی یک رنگی اور یکسانی کو تسلیم کیا اور شاید قومیت کا دھندلا سا خاکا اس کے ذہن میں تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جب تک تمام ہندوستان ایک ہی حکومت کے زیر نگین نہ ہو اس وقت تک ہندوستان کی یکسانی اور یکرنگی کا ذکر فضول ہے اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر اس نے سلطنت موریا کو وسعت دینے کی انتہائی کوشش کی۔ وہ جمہوریت کا مخالف تھا مگر اس نے گاؤں کی پنچایتوں کو ترقی دی اس کی اس پالیسی میں غیر مرکزی طرز حکومت کا کسی قدر خاکا ضرور ملتا ہے۔

سزا کے متعلق اس کا خیال ہے کہ بادشاہ کا یہ فرض ہے کہ وہ طاقتوروں کے مقابلہ میں کمزوروں کی مدد کرے۔ سزا کی حد مقرر ہونی چاہئے جو نہ تو اتنی سخت ہو کہ لوگوں کو بالکل دبا دے اور نہ اتنی نرم ہو کہ لوگ حکومت سے بے پرواہ ہوجائیں۔ سزا ہمیشہ جرم کے متناسب ہونی چاہئے اور سزا دیتے وقت حالات اور سوسائٹی کا بھی کافی خیال رکھنا چاہئے۔ کوتلیا کے اس نظریہ کی تائید یورپ کے مشہور مصنف مانٹیسکیو کی تصنیف روحِ قانون میں حرف بحرف ہوتی ہے مانٹیسکیو اس درجہ کا مصنف ہے جس نے سزا کے قدیم طرز کی سخت مخالفت کرکے سزا اور جرم میں تناسب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایسی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یورپ میں آج سزا اپنے بیرحمانہ اور بربری دور سے نکل چکی ہے۔

ملکی فتوحات کے متعلق کہتا ہے کہ بادشاہ کو چاہئے کہ ہر مفتوحہ ملک کے لوگوں کی نیکیاں جس طرح ممکن ہو دبا دے مگر ایسا طریقہ استعمال کرے جس سے عوام میں بدامنی یا ہلچل نہ پھیلے۔ علما کی عزت، غربا کی حمایت اس کے فرائض میں داخل ہونی چاہئے۔ عام عقائد کے خلاف اس کو کوئی نیا قانون جاری کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس سے ہنگامہ پیدا ہوجانے کا خطرہ ہے اور بادشاہ کی نئی حکومت لوگوں کے دلوں سے اٹھ جائے گی۔ ارسطو کی طرح وہ بھی بنی آدم کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرتا ہے یعنی آریہ اور ملیچھ۔ آریہ سے اس کی مراد مہذب لوگ ہیں جو اعلیٰ نظامِ معاشرت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں ملیچھ وہ لوگ ہیں جن پر ابھی تہذیب کی روشنی نہیں پڑی ہے۔ یہ عقیدہ کم و بیش ہر قوم میں رہا ہے کہ وہ اپنی قوم کو

اعلیٰ درجہ کا تہذیب یافتہ اور دوسری قوموں کو جاہل محض اور کندۂ ناتراش سمجھتی ہے۔ اہلِ عرب اسلام سے قبل عرب اور عجم بنی آدم کے دو حصے سمجھتے تھے۔ اسلام کے بعد یہ نشانِ امتیاز کفر و اسلام میں تبدیل ہوگیا۔ یونانی اپنی تہذیب کو بہترین سمجھتے تھے اور اپنے مقابلہ میں دوسروں کو بربری سمجھتے تھے۔ ہندوؤں کے یہاں بھی ایسا ہی عقیدہ تھا۔ کوتلیا کے نزدیک آریائی قوم کا ہر فرد آزاد ہے اور وہ کبھی غلامی کی زنجیر میں جکڑا نہیں جاسکتا۔ غلامی ملیچھ لوگوں کے لئے ہے

(۳)

ہمارے سلسلہ کی تیسری کڑی عربی کا مشہور مؤرخ ابوزید عبدالرحمٰن ابن خلدون ہے۔ جو شہر تیونس میں ۱۳۳۲ء میں پیدا ہؤا۔ کتبِ درسیہ اپنے ہی شہر کے نامور علما سے پڑھیں اور بچپن ہی سے ذہانت کا یہ حال تھا کہ تاریخی واقعات اور روایات ازبر ہوجاتیں۔ پھر کچھ عرصہ قرآن کے حفظ کرنے میں گزارا۔ پھر حدیث، فقہ، فلسفہ و شعر کی تعلیم حاصل کی گویا سارے علومِ عقلیہ ونقلیہ کا درس لیا۔ ۱۳۵۲ء میں سلطانِ فیض کے درباریوں میں مقرر ہؤا مگر ۱۳۵۶ء میں چند سیاسی مصیبتوں میں مبتلا ہو کر قید ہؤا۔ ۱۳۵۸ء میں جب رہائی ملی تو اس نے آبنائے طارق کو پار کرکے ہسپانیہ میں قدم رکھا اور وہیں اپنی مشہورِ عالم تصنیف "دیوان المبتدا و الخبر فی اعیان العرب والعجم والبربر" لکھنی شروع کی۔ ۱۳۸۲ء میں وہ حج کے لئے مکہ روانہ ہؤا اور مصر میں جب پہنچا تو اس کا نہایت پرزور خیر مقدم ہؤا۔ سلطان مصر نے بھی پرتپاک استقبال کیا اور ۱۳۸۴ء میں اس کو قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ ابن خلدون نے اب مصر ہی کو اپنا وطن بنالیا مصر ہی میں اس نے اپنی تاریخ سات جلدوں میں ختم کی۔ جس میں عرب، عجم اور بربر قوم کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ اس تاریخ کا اس نے تین باب میں مقدمہ لکھا ہے۔ یہ مقدمہ مدنیت حکومت اور فلسفۂ تاریخ پر ایک نہایت محققانہ مقالہ ہے اور اس میں تمدن کے مختلف شعبوں پر نہایت وضاحت کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ خیالات کی گہرائی اور بیان کی سلاست اور فیصلہ کی صحت کے لحاظ سے یہ مقدمہ اپنے زمانہ کی عجیب وغریب پیداوار ہے اور اتنا مشہور ہؤا کہ اب تک کوئی مسلمان مصنف اس سے بازی نہیں لے جاسکا۔

آرنلڈ صاحب اپنی کتاب "خلافت" میں لکھتے ہیں کہ اسلامی دنیا نے جتنے بلند پایہ مصنف پیدا کئے ہیں ان میں ابن خلدون کو بھی ایک خاص ممتاز مرتبہ حاصل ہے۔ ابن خلدون نے تمدن اور سوسائٹی کی ابتدا کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے۔ مقدمہ کے شروع میں اس نے تاریخی واقعات جانچنے اور پرکھنے کے لئے چند قواعد مرتب کئے ہیں۔ تاریخ صرف واقعات کی تفصیل کا نام نہیں بلکہ تاریخ کو سیاسی اخلاقی اور معاشرتی کیفیات و حالات کی روشنی میں دیکھنا ازبس ضروری ہے۔ اس ضمن میں وہ ملک کے طبعی، اقتصادی اور سیاسی حالات کے ان اثرات کا ذکر کرتا ہے جو ملک کے باشندوں پر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ عربوں کو پیش کرتا ہے جو بہادر، جری، جفاکش، مہمان نواز ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ تمام تر اُن کی مکانوں سے بے نیاز اور مسافرانہ زندگی قرار دیتا ہے۔ عرب اس لئے ذہین

ہیں کہ وہ ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں اور مختلف مقامات کی سیر کرتے ہیں۔ عجائباتِ عالم سے دوچار ہوتے ہیں جس سے اُن کی طباعی میں اور ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے۔ منطقہ معتدلہ کے رہنے والے بہ نسبت منطقہ حارّہ والوں کے زیادہ ذکی اور فہیم ہوتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں وہ جانوروں کی زندگی سے مثالیں پیش کرتا ہے اور پھر مختلف طبقوں کے جانوروں کی ساخت۔ قوت اور ذکاوت کا موازنہ کرتا ہے۔

ابن خلدون ریاست کو پانچ حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یعنی ملک، باشندے، سلطان، یکجہتی یا وحدت اور عصبیت۔ اس کے خیال میں عصبیت ایسی قوت ہے جو ریاست کی تقویم میں مدد دیتی ہے اور اسی عصبیت کی بدولت زندگی سادہ اور جفاکش ہوتی ہے اور تمام بیرونی حملوں کی مدافعت کرتی ہے۔ ایسی سادہ زندگی بسر کرنے والے لوگ تمدّن کی گندگیوں سے محفوظ رہتے ہیں اور ان میں عصبیت بھی کافی ہوتی ہے ایماندار اور نیک باطن ہوتے ہیں۔ عصبیت کے ساتھ ساتھ قومی اور ملکی وحدت کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے اور جب عصبیت اور ملکی وحدت مل جاتے ہیں تو قوت و اقتدار کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ اس اقتدار کی جدوجہد قبائلی زندگی سے شروع ہوتی ہے۔ اول اول ہر قبیلہ دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جو قبیلہ آخر میں تمام قبائل کو زیر کرکے برسرِ حکومت آتا ہے وہی شاہنشاہ ہوتا ہے اور اُسی وقت ریاست کی ابتدا ہوتی ہے۔ فتحیاب قبیلہ تمام قبائل کو زیر کرکے اُن پر حکومت کرتا ہے اور ان کے لئے قانون وضع کرتا ہے۔ لیکن یہ حالت بھی زیادہ دن تک قائم نہیں رہتی اس لئے کہ جب امن و امان کی زندگی شروع ہوتی ہے تو اسی وقت تمدن کی بھی بنیاد پڑتی ہے اور رفتہ رفتہ لوگ متمدن ہوتے جاتے ہیں پھر لوگوں کی وہ گذشتہ سادہ اور جفاکش زندگی رفتہ رفتہ بالکل غائب ہو جاتی ہے ان میں اگلی سی قوت باقی نہیں رہتی۔ سادہ پن کے بجائے عیش و عشرت کا دور دورہ ہوتا ہے اور ریاست میں انونی لگنی شروع ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کوئی دوسری طاقت اس کو بزورِ شمشیر زیر کرکے اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ لہذا قوموں کے ہبوط و زوال کے اسباب کی تلاش وحدت و عصبیت کے فقدان میں کرنی چاہیئے لیکن اگر کسی وجہ سے کوئی ریاست کسی دوسری ریاست کے زیرنگیں چلی گئی ہے مگر اُس کی وحدت اور عصبیت کو زوال نہیں آیا تو وہ جلد یا بدیر اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کرلے گی۔ آزادی کی جنگ اس وقت تک برابر کسی نہ کسی صورت میں جاری رہے گی۔ جب تک کہ کھوئی ہوئی آزادی نہیں مل جائے گی۔ قوموں کی زندگی کا راز عصبیت میں پوشیدہ ہے۔ دوسری مثال اس قوم کی لیجئے جو دوسری ریاست کے تحت میں اپنی عصبیت کھو چکی ہے۔ ایسی قوم کے لئے آزادی کی کوئی امید نہیں۔ کیونکہ اس کی روح سو جاتی ہے اور یہ لوگ اپنے فرمانرواؤں کی نقل اتارتے ہیں کبھی ان کی زبان سیکھتے ہیں کبھی ان کے وضع قطع اور طرزِ بود و ماند کا چربہ اتارتے ہیں اور زندگی کے میدان میں اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا کر دوسروں کے سہارے چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی یہاں تک قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھول کر اپنی فرمانروا قوم کے اسلاف کو یاد کرتے ہیں۔ غرض یہ لوگ نہ تو اپنی زبان

سے بولتے نہ اپنے کانوں سے سُنتے اور نہ اپنے دماغ سے سوچتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہمیشہ دوسروں کی غلامی کرنی ہے۔ ان تمام اثرات کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو دوسروں کے مقابلہ میں ذلیل کم ہمت اور ناکارہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اور یہی قوموں کا اصلی زوال ہے جو موت کے مرادف ہے۔ ابن خلدون ان تمام واقعات کے لئے زمان کی بھی قید لگاتا ہے جس طرح جاندار چیزوں کی ایک عمرِ طبعی ہوتی ہے جس میں وہ پیدا ہوتی بڑھتی اور مر جاتی ہیں۔ اسی طرح ریاست کی بھی عمرِ طبعی ہوتی ہے اور اس عمرِ طبعی کے اندر ریاستیں پیدا ہوتی بڑھتی اور زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ ابن خلدون اس عمرِ طبعی کا تعین ۱۲۰ برس کرتا ہے۔

ریاست میں سلطان کا وجود بالکل طبعی ہے۔ جس طرح شہد کی مکھیوں کا ایک سلطان ہوتا ہے جس کی فرماں برداری اور مکھیاں لاشعوری جذبہ کے ماتحت کرتی ہیں۔ اسی طرح انسان کی ریاست کے لئے ایک سلطان کا ہونا لازمی ہے اور اسی سلطان کی وجہ سے ملک میں امن اور خوشحالی ہوتی ہے۔ گو تلیا ریاست کی ابتدا ایک ایسی حالت سے کرتا ہے جس میں ہر شخص نفسی نفسی میں مبتلا ہے مگر ابن خلدون کے خیال میں دنیا خدا کے حکمِ کن سے وجود میں آئی۔ ریاست کی بنیاد مذہب ہے اس لئے کہ انسان کو اس دنیا میں دوسری دنیا کے لئے عمل کرنا ہے اور دوسری دنیا ہی اصلی چیز ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دنیاوی نظام مذہبی نظام کے ماتحت ہے تو ایک پیغمبر کا وجود لازمی ہے۔ جو لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھائے۔ پیغمبر کے بعد اس کے خلفاء کا ہونا بھی لازمی ہے۔ خلفاء کا وجود آیاتِ قرآنی اور اجماعِ امت پر مبنی ہے۔ یعنی خلیفہ کا انتخاب اجماعِ امت پر اور خود خلیفہ کے اعمال حدیث و قرآن پر۔ ابن خلدون تاریخی بنا پر خلافت کو قریش کے لئے ضروری قرار دیتا ہے مگر ابن خلدون سے پہلے ایک دوسرا مصنف باقلانی گذرا ہے جو خلافت میں قرشیت کی شرط بالکل نہیں لگاتا۔

خلافت کے متعلق ابن خلدون کے خیالات گویا جملہ معترضہ کی شکل میں یہاں درج ہیں۔ اب آگے چلئے اور سلطان کے متعلق اس کی تشریح سنیئے۔ کہتا ہے کہ سلطان کو عادل اتنا ہونا چاہیئے کہ لوگ اپنے اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے اس کی طرف رجوع کریں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو تمام حدود کی حفاظت کرنی اور ملک میں امن قائم رکھنا چاہیئے اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب سلطان کے پاس ایک جرار فوج ہو۔ سلطان کے لئے یہ ضروری ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں مگر وہ کسی کا مطیع نہ ہو۔ ملک کے تمام محاصل اس کے خزانہ میں جمع ہونے چاہیئں۔ اس کا ہر ہر قول قانون ہے اس واسطے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہی قانون ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے اقوال میں کسی کا دست نگر نہیں اور خود اپنے گذشتہ اقوال کو رد کر سکتا ہے اس لئے کہ جو کچھ کہتا ہے موجودہ زمانہ کے لئے وہی سند ہے۔ اگر یہ تمام اوصاف اس میں موجود ہیں تو وہ مکمل طور پر سلطان ہے لیکن اگر ان میں ذرا بھی نقص ہے تو وہ مکمل طور پر نہ تو سلطان ہے اور نہ سوسائٹی صحیح معنوں میں آزاد ہے مثال کے طور پر ابن خلدون چند عباسی حکمرانوں کا نام گنا تا ہے جو صرف برائے نام

خود مختار ہیں۔

سلطان اور رعایا کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے ابن خلدون کہتا ہے کہ سلطان کو رعایا کے رسم و رواج اور عقائد کی پاسداری لازم ہے ورنہ خانہ جنگی کا احتمال ہے اور بہت ممکن ہے کہ خانہ جنگی ریاست کے لئے مہلک ثابت ہو۔ اس لئے سلطان کو خود سری سے پرہیز کرنا چاہئے اور معاملات حکومت میں وزرا سے مشورہ لینا چاہئے۔ سلطان گویا تمام ملک کا منتظم ہے ابن خلدون کے خیال میں ریاست کی بقا اور مضبوطی کے لئے مندرجۂ ذیل اشیاء ضروری ہیں۔ علم جنگی۔ ناقوس۔ تخت ایک قومی نشان، سکہ مع دارالضرب، شاہی انگشتری، اور ایک بڑا خیمہ جو سفر میں سلطان کے ہمراہ رہے۔ ان چیزوں سے ملک میں یکرنگی اور وحدت ترقی کرتی ہے۔ مثلاً تخت اور سکہ حدود سلطنت کے اندر لوگوں میں اتحاد پیدا کرتے ہیں۔

ان چند مشرقی مصنفین کے حالات پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے نظریات میں خیالات کے بجائے اعمال پر کتنا زور دیتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان میں سے ہر ایک کو کبھی نہ کبھی سیاسی ذمہ داریوں سے دوچار ہونا پڑتا۔ کنفیوشس ایک حاکم عدالت تھا اور اس نے اپنے خیالات اس وقت قلمبند کئے جب یونانی افق پر سیاسی خیالات کی جگہ بالکل تاریک تھی۔ اس لئے کنفیوشس کو ہم بجا طور پر اہل سیاست کا ابوالآبا کہہ سکتے ہیں۔ کوتلیا بھی چندر گپت موریا کا وزیر اعظم تھا اور ایک وسیع سلطنت کا انتظام اس کے ہاتھوں میں تھا۔ ابن خلدون بھی مختلف عہدوں پر مامور رہا اور بالآخر مصر میں مالکی فقہ کا قاضی القضاۃ بنا۔ ان لوگوں کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ انسانی اعمال و افعال پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے اور اسی لئے آج ان کی تصانیف زندہ ہیں اور ان کو قبول دوام کی سند حاصل ہو چکی ہے۔ کیا مشرق صدیوں بعد اپنی گہری نیند سے پھر بیدار ہوگا؟

جس کے آوازے سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس اب کیا ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

"قرہ خاں"

وارداتِ شب

ایک اک ذرہ تھا رشکِ صد سحر کل رات کو　　تھا مسلسل نور تا حدِ نظر کل رات کو

جنبشِ انفاس پر تھا لرزشِ مے کا گماں　　ہر ہوا کی موج تھی صہبا اثر کل رات کو

چاندنی کی چھاؤں میں ذروں کی وہ انگڑائیاں　　ہو رہا تھا خاک پر رقصِ شرر کل رات کو

آگئی تھی جوش پر رفتارِ نبضِ کائنات　　کر رہی تھی زندگی اپنا اثر کل رات کو

اللہ اللہ ذرہ ہائے خاک کی تابندگی　　ہر طرف تھے منتشر لعل و گہر کل رات کو

جل رہی تھی ساری دنیا آتشِ انوار سے　　دیدنی تھا میری آہوں کا اثر کل رات کو

بڑھ گیا تھا اس قدر احساس لطفِ زیست کا　　مٹ گیا تھا امتیازِ خیر و شر کل رات کو

مستیوں میں غرق تھا سلمائے گیتی کا شباب　　مثلِ میکش جھومتے تھے بام و در کل رات کو

دن کا ڈھلنا تھا کہ غنچوں کو تبسم آگیا　　شام ہی سے تھا عیاں جوشِ سحر کل رات کو

موجِ سطحِ خاک سے پہنچی فضائے عرش پر　　ڈوب کر ابھری کہاں میری نظر کل رات کو

یہ نوازش حسن کی تھی گلستاں تو گلستاں　　گر رہی تھیں کلیاں ہر دشت پر کل رات کو

جس طرف دیکھو تجلی جس طرف جاؤ بہار　　حاصلِ صد زیست تھا لطفِ نظر کل رات کو

عمر بھر کے واسطے کافی تھا یہ ذوقِ نظر
جانِ ماہرؔ تو بھی آجاتا اگر کل رات کو

منظور حسین ماہر القادری

نوشتۂ تقدیر

جج اینڈرسے کی حسین بیوی صوفیا پٹرودنا جس کی عمر پچیس سال کی ہوگی اپنے دوست وکیل الین کے ساتھ جو اس کی ہمسائیگی میں موسم گرما بسر کر رہا تھا جنگل کے ایک راستے پر درختوں کی دو رویہ قطاروں کے درمیان ٹہل رہی تھی۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ روئی کے گالے کی طرح سفید بادلوں پر ایسا سکون طاری تھا گویا وہ چیڑ کے فلک بوس درختوں کی چوٹیوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ ہوا بند تھی اور سخت حبس ہو رہا تھا۔

سامنے کچھ فاصلے پر ریل کی پٹڑی جنگل کے راستے کو قطع کرتی ہوئی دائیں اور بائیں طرف نکل گئی تھی اور وہاں ایک سپاہی اپنی بندوق کندھے پر اُٹھا کر خبر نہیں کیوں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ اُس سے پرے ایک عظیم الشان سفید گرجا تھا جس کی پرانی چھت اور چھ بڑے بڑے گنبد نظر آرہے تھے۔

صوفیا نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے اور خزاں رسیدہ پتوں کو اپنی چھاتے کی نوک سے کچلتے ہوئے کہا "مجھے تم سے یہاں ملنے کی بالکل توقع نہ تھی"۔ اور اب میں خوش ہوں کہ ہم یہاں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ میں تم سے ایک نہایت اہم بات کہنا چاہتی ہوں اور سنو! قطعی طور پر کہنا چاہتی ہوں۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں آئی وَن مہیلووچ کہ اگر تم فی الحقیقت مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرا اس طرح پیچھا کرنا چھوڑ دو۔ تم سائے کی طرح ہر وقت میرے تعاقب میں رہتے ہو، ہر وقت میری طرف دیکھتے رہتے ہو اور میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تمہارے دیکھنے کا انداز اچھا نہیں ہوتا۔ تم طرح طرح سے اظہارِ محبت کرتے ہو اور عجیب عجیب مضمون کے خط لکھتے ہو، اور .... اور میں نہیں جانتی یہ سلسلہ کب اور کیسے ختم ہوگا! آخر اس سے کیا حاصل ہے؟

الین خاموش رہا۔ صوفیا نے چند قدم چلنے کے بعد سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اور یہ تمہاری پانچ سال کی دیرینہ دوستی دو یا تین ہفتوں کے مختصر سے عرصے میں کس طرح پوری تکمیل کے ساتھ محبت کی صورت اختیار کر گئی ہے؟ میں تمہاری اس ذہنیت کو سمجھنے سے قاصر ہوں" آئی وَن مہیلووچ"۔

صوفیا نے کنکھیوں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ الین سر اٹھا کر سفید بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس شخص کی طرح خشمناک، برہم اور مصروفِ تخیل معلوم ہوتا تھا جو کوئی غیر معقول، مہمل اور بیہودہ بات سننے پر مجبور ہو رہا ہو۔

صوفیا نے اپنے کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ تم خود کیوں اس بات کو محسوس نہیں کرتے

تمہیں ضرور محسوس کرنا چاہئے کہ یہ کھیل جو تم کھیل رہے ہو قطعاً درست نہیں ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے اور میں اپنے خاوند سے محبت کرتی ہوں اور اس کی ہر طرح سے عزت کرتی ہوں .... میری ایک بیٹی ہے .... کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سب بے معنی ہے؟ اس کے علاوہ میرے قدیم دوست ہونے کی وجہ سے تم بخوبی جانتے ہو کہ میں اپنے خاندان کی زندگی کو کس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادی ہوں اور نکاح کی عزت اور حرمت میرے نزدیک کس قدر ہے۔"

الین نے غصہ میں آکر گلا صاف کیا اور ایک آہ بھری اور بولا

"نکاح کی عزت .... آہ! اے خدا!"

"ہاں ہاں .... میں اپنے خاوند سے محبت کرتی ہوں، اس کی عزت کرتی ہوں اور اپنے گھر کی پُر امن زندگی کو ہر حال میں اہم سمجھتی ہوں۔ میں اپنی جان دے دوں گی لیکن اینڈرے اور اس کی بیٹی کے لئے کسی ناخوشی کا باعث نہ بنوں گی .... میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔ آئی ون میہلووچ کہ خدا کے لئے میرے امن وسکون میں خلل مت ڈالو۔ ہم ایک دوسرے کے پھر اُسی طرح مخلص دوست بن جاتے ہیں جیسے ابتدا میں ہوا کرتے تھے۔ یہ آہیں اور گرم گرم سانس لینا چھوڑ دو۔ یقین کرو دوست کہ یہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔ اب فیصلہ ہو گیا ہے۔ بس اسے ختم کر دو۔ اس کے متعلق اب ایک لفظ تک نہ کہو۔ آؤ اب کسی اور موضوع پر گفتگو کریں۔"

صوفیا نے ایک دفعہ پھر نظر چرا کر الین کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور نگاہیں اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کا رنگ زرد تھا وہ غصے میں اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ صوفیا کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہ آئی کہ الین کیوں برہم اور غضبناک ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے چہرے کی زردی اور افسردگی نے اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگائی۔

صوفیا نے شفقت آمیز اور پرخلوص انداز میں کہا "خفا کیوں ہوتے ہو؟ آؤ دوستی کی تجدید کریں۔ تم اقرار کرتے ہو؟ یہ لو، یہ ہے میرا ہاتھ۔"

الین نے اُس کا چھوٹا سا نرم ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا، دبایا، اور آہستہ آہستہ اپنے ہونٹوں کی طرف لے گیا۔

اُس نے کہا "میں نادان نہیں ہوں مگر میں اُس عورت کی دوستی سے ہرگز باز نہیں رہ سکتا جس سے میں محبت کرتا ہوں۔"

"بس بس اِس کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہم بیٹھنے کی جگہ پر پہنچ چکے ہیں۔ آؤ یہاں بیٹھ جائیں۔" صوفیا کی رُوح پر سے ایک بوجھ اتر گیا اور آزادی کا ایک سرور انگیز اور شیریں احساس اس پر طاری ہو گیا۔ نہایت مشکل اور نازک بات کہی جا چکی تھی۔ دردناک سوال حل کر کے ختم کر دیا گیا تھا اب وہ آزادی کے سانس لے سکتی تھی اور الین کی طرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتی تھی۔ اس نے الین کی طرف دیکھا۔ وہ اس مرد پر جو اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو چکا تھا یوں فتح حاصل

کر لینے کے احساس سے دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور اپنی تعریف کر رہی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر بہت مسرور تھی کہ ایلین جیسا عظیم الجثہ، تناور، مضبوط، تیز فہم، تہذیب یافتہ اور اور روایتی مالدار اور ہوشمند آدمی جس کا چہرہ ابھی ابھی خشم آلود ہو رہا تھا اب کس طرح افسردگی میں سر جھکا کر نہایت اطاعت کے ساتھ اُس کے قریب بیٹھا ہے۔ تھوڑی دیر تک دونوں بالکل خاموش رہے"۔

آخر ایلین نے چلا کر کہا "نہیں ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا۔ تم ایسی باتیں کرتی ہو جیسے میں کوئی نادان بچہ ہوں۔ اگر نہیں اپنے شوہر سے محبت ہے اور تم نکاح کی حرمت کا لحاظ کرتی ہو تو یہ سب باتیں تمہارے بتانے کے بغیر ہی مجھے معلوم ہیں بلکہ شاید میں اس سے بھی زیادہ تمہیں بتا سکوں۔ میں صدقِ دل اور خلوصِ قلب کے ساتھ تمہارے سامنے یہ اقرار کرتا ہوں کہ تمہارے متعلق میرا یہ طرزِ عمل میرے نزدیک بھی مجرمانہ ہے، اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ لیکن وہ باتیں کہنے سے کیا حاصل جنہیں ہر شخص نہایت اچھی طرح سے جانتا ہو۔ مجھے ایسے عام اور مہمل الفاظ سے بہکانے کی بہ نسبت تمہارے لئے یہ کہیں زیادہ بہتر ہوتا کہ تم مجھے صرف یہ بتا دیتیں کہ اس کے سوا مجھے اور کیا کرنا چاہیئے"۔

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے"۔

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے پانچ مرتبہ یہاں سے جانے کی کوشش کی ہے اور ہر مرتبہ نصف راہ سے لوٹ آتا رہا ہوں۔ میں تمہیں راستے کے ٹکٹ دکھا سکتا ہوں ـــــ میں نے وہ سب سنبھال کر رکھے ہیں۔ میں اپنے آپ کو تم سے علٰحدہ کر دوں، یہ بات قطعاً میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں اس کے خلاف جدوجہد کر رہا ہوں اور نہایت خوفناک جدوجہد کر رہا ہوں۔ لیکن میری یہ تمام کوششیں کس کام کی ہیں جب مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے۔ جب کہ میں اتنا کمزور ہوں اتنا بزدل! میں فطرت کے خلاف جنگ نہیں کر سکتا۔ تم سمجھ رہی ہو؟ فطرت کے خلاف میری تمام مساعی بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں لیکن وہ مجھے پکڑے رکھتی ہے اور روکے رکھتی ہے، آہ! یہ ذلیل اور حقیر کمزوری!"

ایلین کے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جائے نشست کے قریب ٹہلنے لگا۔

اُس نے اپنے ہاتھوں کو بھینچتے ہوئے کہا "میں ایک کتے کی سی ذلت محسوس کرتا ہوں" میں اپنے آپ سے نفرت کرتا ہوں اور اپنے وجود کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں! میرے خدا! میں کیوں ایک نادان آوارہ لڑکے کی طرح ایک دوسرے شخص کی بیوی سے اظہارِ محبت کرتا ہوں! احمقانہ خط لکھتا ہوں اور یوں اپنے آپ کو رسوا و ذلیل کرتا ہوں"

ایلین نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ کچھ بڑبڑایا اور بیٹھ گیا۔ "اور پھر تمہارا یہ فریب اور ریاکاری!" وہ شدتِ اضطراب میں برابر کہتا گیا۔ "اگر تم میرے اس قابلِ نفرت طرزِ عمل کو فی الحقیقت ناپسند کرتی تھیں تو یہاں کیوں آگئیں؟ کونسی چیز تمہیں کھینچ کر یہاں تک لے آئی؟ اپنے خطوں میں میں نے تم سے ایک سیدھے، صحیح اور بے تکلف جواب کی درخواست

کی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں، یا نہیں۔ مگر بجائے صاف اور سیدھے جواب کے تم ہر روز اس قسم کی اتفاقی ملاقاتوں کی تدبیریں نکالتی رہتی ہو اور ناوانوں کے بے سروپا مقولے سنا سنا کر مجھے مطمئن کرنے کی عبث کوشش کرتی رہتی ہو"!

صوفیا ڈر گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے معاً اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے کوئی سنجیدہ اور شائستہ عورت یکلخت اپنے آپ کو عریاں پاکر محسوس کرتی ہے۔ اس نے کہا۔

"مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں میرے متعلق یہ شک ہے کہ میں تمہارے ساتھ کھیل کھیل رہی ہوں۔ میں نے تم کو ہمیشہ سیدھا، صحیح اور بے تکلف جواب دیا ہے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف آج میں نے تم سے درخواست کی ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آہ! ایسے معاملات میں کوئی کسی سے درخواست بھی کرتا ہے؟ اگر تم صرف ایک بار یہ کہہ دیتیں کہ بس اب یہاں سے چلے جاؤ تو میں مدت سے جا چکا ہوتا۔ لیکن تم نے یہ کبھی نہیں کہا۔ تم نے ایک دفعہ بھی مجھے صاف و صریح جواب نہیں دیا یہ تمہاری عجیب متذبذب حالت ہے۔ ہاں، یقیناً، یا تو تم مجھ سے کھیل رہی ہو یا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

الین نے جملہ ختم کئے بغیر سر اپنے ہاتھوں پر جھکا دیا۔ صوفیا اپنے دماغ میں اس طرزِ عمل پر تبصرہ کرتی رہی جو اس نے الین کے ساتھ شروع سے لے کر آخر تک روا رکھا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اپنے قول و فعل ہی میں نہیں بلکہ اپنے پوشیدہ ترین خیالات میں بھی اس نے الین کے اظہارِ محبت کی مخالفت کی تھی۔ مگر پھر بھی وہ محسوس کرتی تھی کہ اس وکالت پیشہ نوجوان کی باتوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور موجود ہے۔ اپنے ذہن پر بوجھ ڈالنے کے باوجود بھی وہ نہ سمجھ سکی کہ وہ حقیقت کیا ہے اور الین کے شکووں اور شکایتوں کا جواب اس سے کسی طرح بن نہ آتا تھا۔ خاموشی کو خلافِ تہذیب سمجھ کر اُس نے اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا اور کہا

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ قابلِ الزام میں ہوں"۔

الین نے آہ بھر کر کہا۔ "تمہاری بے وفائی کے لئے میں تمہیں الزام نہیں دیتا۔ جب میں نے یہ کہا تھا تو میرا مطلب یہ نہ تھا۔ تمہاری بے وفائی بالکل قدرتی ہے اور برمحل۔ اگر سب لوگ آپس میں اتفاق کر لیں اور فوراً ایک دوسرے کے سچے اور مخلص دوست بن جائیں تو دنیا کا یہ سارا نظام درہم برہم نہ ہو جائے"؟

اُس وقت صوفیا فلسفیانہ خیالات پر دماغ سوزی کرنے کے لئے کسی طرح بھی تیار نہ تھی۔ لیکن وہ اندازِ گفتگو کی اس تبدیلی سے خوش ضرور تھی۔ اس نے پوچھا "لیکن کیوں؟"

"کیونکہ صرف جاہل عورتیں اور وحشی جانور ہی وفادار اور مخلص ہو سکتے ہیں۔ جہاں تہذیب آئی اور اُس نے عصمت و عفت جیسی سہولتوں کا تقاضا کیا اخلاص رخصت ہو گیا"۔

الین نے طیش میں آکر اپنی چھڑی ریت میں گھونپ دی۔ صوفیا اس کی باتیں سنتی رہی اگرچہ ان کا بیشتر حصہ اُ فہم و ادراک سے بالاتر تھا لیکن وہ اس کی گفتگو کو پسند کرتی تھی۔ سب سے بڑھ کر جو خیال اس کے لئے فرحت بخش

جس سے وہ بے حد محظوظ ہو رہی تھی یہ تھا کہ وہ، ایک معمولی ذہن و فکر کی عورت، ایک نہایت عقلمند آدمی کے ساتھ، دانش و حکمت کے موضوعات پر گفتگو کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ البین کے متوحش اور نوجوان چہرے کی حرکات و سکنات سے بھی بہت لطف اُٹھا رہی تھی جو ابھی تک زرد اور غضبناک تھا۔ وہ اس کی گفتگو کا معتد بہ حصہ سمجھنے سے قاصر رہی۔ اگر اس میں سے وہ کچھ سمجھ سکی تو وہ صرف اُس کی وہ دلکش و جاذب مردانگی اور دلیری تھی۔ جس سے دورِ جدید کے نوجوان بلا تکلف و تامل بڑے بڑے سوالوں کا ایک لمحہ میں فیصلہ کر کے فوراً قطعی نتیجہ وضع کر لیتے ہیں اسے یکایک محسوس ہوا کہ اس کا دل البین کی تعریف و سفارش کر رہا ہے اور اس احساس سے وہ کانپ اٹھی اور بولی

"مجھے معاف کر دو۔ مگر میں سمجھ نہیں سکتی کہ کون سی بات تمہیں بے وفائی کا ذکر کرنے پر مجبور کر رہی ہے؟ میں ایک بار پھر اپنی درخواست کو دُہراتی ہوں میرے اچھے اور سچے دوست بن جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو! میں نہایت بے تابی کے ساتھ یہ استدعا کرتی ہوں!"

البین نے آہ بھر کر کہا بہت اچھا میں ایک مرتبہ پھر کوشش کروں گا۔ میں اس کے لئے انتہائی کوشش کرنے پر آمادہ ہوں ...... لیکن مجھے صرف یہ شک ہے کہ میری کوششیں بار ور بھی ہوں گی یا نہیں؟ یا میں ایک گولی اپنے دماغ کے پار کر دوں گا یا کسی احمقانہ طریقہ پر کسی چیز کے چند گھونٹ پی لوں گا۔ یقیناً میں کسی نہایت خطرناک انجام کو پہنچوں گا۔ دنیا میں ہر چیز کی کوئی نہ کوئی انتہا ضرور ہے ——— فطرت کے خلاف جنگ کرنے کا انجام بھی کچھ ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ کہ انسان دیوانگی کے خلاف کیسے جنگ کر سکتا ہے؟ اگر تم شراب کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اتار لو تو اُس کے نشہ اور اثرات کے خلاف کیسے جنگ کر سکتی ہو؟ اب میں کیا کروں جب تمہارے تصور کا ایک پیکر میری رُوح میں پیدا ہو چکا ہے۔ رات اور دن لگاتار میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے، آہ! اُس دلکش سرو کے مانند جو اس وقت میرے سامنے کھڑا ہے؟ آؤ، اور مجھے بتاؤ کہ دنیا میں وہ کونسا مشکل ترین اور دشوار ترین مرحلہ ہے جو مجھے اس ذلت اور شکستہ حالی سے نجات دلا سکتا ہے۔ جس میں میرے تمام خواب میری تمام خواہشیں اور میرے تمام خیالات میرے اپنے نہیں رہے بلکہ کسی ایسی ہستی کے ہو چکے ہیں جس نے مکمل طور پر مجھ پر قبضہ حاصل کر لیا ہے؟ میں تم سے محبت کرتا ہوں آہ! محبت کے دفور نے مجھے بالکل بے اختیار کر دیا ہے۔ میں نے اپنا کام کاج ترک کر دیا ہے اور ان تمام لوگوں کو بھی چھوڑ دیا ہے جو مجھے عزیز ہیں۔ میں نے اپنے خدا کو بھی بُھلا دیا ہے۔ یقین کرو کہ میں نے زندگی بھر میں اتنی شدت کے ساتھ کبھی محبت نہیں کی"

صوفیا جس کو بالکل امید نہ تھی کہ ان کی گفتگو اس طرح پہلو بدل لے گی جھٹ البین سے علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی اور خوف زدہ ہو کر البین کی طرف دیکھنے لگی۔ البین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور اُس کی صورت التجا، منت اور تشنگی کا اظہار کر رہی تھی۔

اس نے اپنی آنکھوں کو صوفیہ کی بڑی بڑی اور سہمی ہوئی آنکھوں کے قریب لاتے ہوئے کہا "میں تم سے محبت کرتا ہوں"

تم کس قدر حسین ہو! میری رُوح کے اس وقت پرخچے اُڑے جا رہے ہیں لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنی رُوح کو اس غیر متناہی عذاب میں ڈال کر اپنی ساری بقیہ زندگی یہیں بیٹھے بیٹھے گذار سکتا ہوں تاکہ تمہاری آنکھوں میں جھانکتا رہوں لیکن...... آہ! چپ رہو میں تم سے التجا کرتا ہوں!"

صوفیا اپنی گھبراہٹ کو محسوس کر کے ایلین کو خاموش کرنے کے لئے کوئی فوری بات کہنے کی کوشش کرنے لگی۔ آخر فیصلہ کن انداز سے بولی "میں یہاں سے چلی جاؤں گی"۔ لیکن اس سے پہلے کہ اسے اُٹھنے کے لئے حرکت کرنے کا موقع ملتا اس نے دیکھا کہ ایلین اس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا...... اور اس کے گھٹنوں کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لگاتار دیکھ رہا تھا اور نہایت دلسوزی، جوش اور فصاحت کے ساتھ شیریں لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ وحشت اور خوف میں وہ اس کے الفاظ نہ سن سکی۔ اب، اس خطرناک لمحے میں، جب کہ اُس کے گھٹنے نہایت پُرلطف طریقہ سے دبائے جانے پر کسی گرم گرم اور آرام دہ غسل کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ وہ ایک تکلیف دہ خلش کے ساتھ کسی خاص خیال سے مرعوب ہو کر اپنے تمام پوشیدہ احساسات کو کھول کر بیان کر دینے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اسے بے حد طیش آرہا تھا کہ اس کا دل بجائے شریفانہ جذبات کے اظہار پر قادر ہونے کے ایک بے خبر شرابی کی طرح مرعوب ہو رہا ہے؟ نیچے، صرف اس کی رُوح کی گہرائیوں میں اس کی اپنی خودداری شخصیت کی ایک رمق نہایت خوفناک اور مہلک انداز میں اس کی تضحیک کر رہی تھی۔ تم یہاں سے چلی کیوں نہیں جاتیں۔ کیا تمہیں یہیں رہنا چاہئیے؟ اچھا؟"

ذہن میں کوئی بات تلاش کرتے ہوئے صوفیا بالکل نہ سمجھ سکی کہ وہ اپنا ہاتھ جس کے ساتھ ایلین کے ہاتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے کھینچ کر کیوں علیحدہ نہیں کر سکتی۔ اور کیوں وہ خود بھی اپنے اردگرد مجرمانہ طور پر نظر دوڑا کر یہ دیکھ رہی ہے کہ ان کی اس حالت پر کسی کی نظریں تو نہیں پڑ رہیں۔ بادل کے ٹکڑے اور صنوبر کے درخت بالکل بے حس و حرکت کھڑے ان کی حرکات اس طرح غور سے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بوڑھا اور تجربہ کار ملازم مدرسے کے لڑکوں کی شرارتیں دیکھتا رہتا ہے لیکن جسے راز کو پوشیدہ رکھنے کے لئے رشوت دے دی جاتی ہے۔ سنتری ریل کی پٹڑی کے قریب بدستور کھڑا تھا اور بظاہر انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

صوفیا نے دل میں کہا "چلو اُسے دیکھنے دو"۔

پھر مایوسانہ انداز میں ایلین کی طرف دیکھ کر بولی "لیکن...... لیکن سنو۔ اس سے کیا حاصل ہوگا؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟

"میں نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتا" ایلین نے یہ کہتے ہوئے صوفیا کا ناگوار سوال ہوا میں بکھیر دیا۔ انہوں ریل گاڑی کے انجن کی تیز سیٹی سنی۔ روزمرہ کی آزاد دنیا کی اس ظالم اور بے موقع آواز نے صوفیا کو بیدار کر دیا۔

اس نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا "میں اب نہیں ٹھہر سکتی . . . . . . اس وقت مجھے گھر میں موجود ہونا چاہئے تھا" گاڑی آرہی ہے . . . . . ایڈرے اس گاڑی پر آرہا ہے! اب اسے کھانا کھانا ہے"

جب صوفیا ریل کی پٹڑی کی طرف مڑی تو اُس کا منہ آگ کی طرح سُرخ ہو رہا تھا۔ انجن آہستہ آہستہ رینگتا ہُوا گذر گیا۔ پھر گاڑیوں کا سلسلہ شروع ہُوا یہ مسافر گاڑی نہ تھی جیسا کہ اُس نے خیال کیا تھا بلکہ مال گاڑی تھی۔ سفید گرجے کے عقب میں چمکیلے ایک تارمیں انسان کی زندگی کے دنوں کی طرح پروئے ہوئے گذر رہے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

مگر آخر کار گاڑی نکل گئی اور آخری ڈبا گارڈ اور روشنی سمیت درختوں کے پیچھے غائب ہوگیا۔ صوفیا تیزی کے ساتھ مڑی اور الین کی طرف دیکھے بغیر جلدی جلدی قدم اُٹھاتی ہوئی راستہ پر چلی گئی۔ اب اُسے اپنی ذات پر اختیار حاصل ہو چکا تھا۔ شرم سے اس کے چہرے کا رنگ قرمزی ہو رہا تھا۔ خفت کا احساس جو اس پر غالب آرہا تھا الین کی وجہ سے نہ تھا ——— نہیں، بلکہ خود اپنی کمزوری کی وجہ سے، اس بے حیائی کی وجہ سے جس سے اُس نے، ایک پاکدامن، باعصمت اور بلند خیال عورت نے، ایک مرد کو جو اس کا خاوند نہ تھا اپنے گھٹنوں سے چمٹ جانے کی اجازت دے دی تھی ———

اب اس کے سر میں صرف ایک خیال تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے وہ اپنے گھر میں اور اپنے گھر کے لوگوں میں پہنچ جائے الین اس کے ساتھ قدم بقدم نہیں چل رہا تھا۔ صاف اور کھلے راستے سے گذر کر ایک تنگ راستے میں داخل ہوتے وقت اس نے جلدی سے الین کی طرف پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر سوائے اس ریت کے جو الین کے گھٹنوں پر پڑی ہوئی تھی وہ اور کچھ نہ دیکھ سکی اور ہاتھ کے اشارے سے اس نے اسے تعاقب کرنے سے منع کر دیا۔

گھر پہنچ کر صوفیا متواتر پانچ منٹ تک اپنے کمرے کے درمیان بالکل بے حس و حرکت اور خاموش کھڑی رہی پھر اس نے پہلے کھڑکی کی طرف دیکھا اور اُسکے بعد لکھنے والی میز کی طرف۔

اس نے اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے کہا "اے رذیل عورت! اے رذیل عورت!" اپنی تحقیر اور نمایاں کرنے کے لئے اس نے سب واقعہ پوری اور صحیح تفصیل کے ساتھ یاد کیا۔ اگرچہ وہ شروع سے لے کر آخر تک الین کے اظہارِ محبت کی مخالفت کرتی رہی تھی لیکن اس نے یہ سب واقعہ بغیر کسی تعصب کے دوبارہ اپنی چشمِ تصور کے سامنے لانا چاہا۔ کوئی پوشیدہ جذبہ اسے الین کی ملاقات کے لئے مجبور و بیقرار کرتا رہا تھا۔ اور، اور کیا؟ جب الین اس کے قدموں پر گرا ہُوا تھا تو اس نے بے حد لُطف اٹھایا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ بلا تکلف اپنے ذہن میں جمع کیا اور شرم کے مارے اُس کا سانس پھُول گیا اور وہ اپنے گال پر ایک چپت مارنا چاہتی تھی۔

"بچارا ایڈرے" اس نے اپنے خاوند کا خیال آنے پر اپنے چہرے پر [illegible] اور رحم آمیز اثرات ظاہر کرتے ہوئے کہا "وار یا! میری بیکس چھوٹی بچی نہیں جانتی کہ اس کی ماں کس قسم کی [illegible] معاف کر دو میرے عزیزو! میں

تم سے بے حد محبت کرتی ہوں . . . . بے انداز محبت !"

اور اپنے تئیں یقین دلانے کے لئے کہ وہ ابھی تک بہترین بیوی" اور بہترین ماں" کہلانے کی مستحق ہے اور حرمت نکاح، جس کا ذکر اس نے الین کے روبرو، نہایت پرزور لفظوں میں کیا تھا اسی طرح قائم ہے۔ صوفیا یک بارباورچی خانہ میں گئی اور باورچی کو سخت سست کہنے لگی کہ اس نے اینڈر ے کے لئے ابھی تک کھانے کی میز کیوں آراستہ نہیں کی۔ اس نے اپنے بھوک سے بے تاب اور تھکے ماندے خاوند کا تصور کیا۔ بلند آواز میں اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور کھانے کی میز اپنے ہاتھوں سے آراستہ کی جو پہلے اس نے کبھی نہ کی تھی۔ پھر اس نے اپنی بیٹی واریا کو بلایا اور اسے گود میں اٹھا کر نہایت پر آرزو انداز میں سینے سے لگالیا۔ اُسے بچی بوجھل اور سرد محسوس ہوئی۔ مگر اس نے دل کو یہ یقین کرنے سے باز رکھا اور بچی سے باتوں میں مشغول ہوگئی۔ تمہارا باپ کیسا اچھا، مہربان اور باعزت آدمی ہے"۔

مگر جب تھوڑی دیر بعد اینڈرے آیا تو صوفیا نے اپنی مرضی کے خلاف بڑی مشکل سے اسے خوش آمدید کہا۔ جھوٹے اور باطل محسوسات کا ایک طوفان اُمنڈ کر اس پر سے گزر چکا تھا لیکن صوفیا کے لئے کوئی نتیجہ کوئی کلیہ پیچھے نہ چھوڑ گیا تھا بلکہ اپنے دروغ و کذب سے اس کے دل میں ہیجان اور اس کے جذبات میں اشتعال پیدا کر گیا تھا۔ وہ اپنے روحانی آلام و مصائب میں گھری ہوئی کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی۔ انسان صرف مصیبت میں پھنس کر یہ معلوم کرتا ہے کہ اپنے جذبات پر قدرت قائم رکھنا کس قدر دشوار ہے۔ صوفیا نے محسوس کیا کہ وہ اوہام کی ایک ایسی گتھی میں پھنسی ہوئی ہے جسے سلجھانا اسی قدر دشوار ہے۔ جتنا چڑیوں کو تیزی کے ساتھ اڑتے ہوئے ایک جھنڈ میں سے گننا مشکل ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے آگاہ ہو کر کہ وہ اپنے خاوند کو دیکھ کر مسرور نہیں ہوئی اور نہ وہ اس کے کھانے کا طریقہ بھی ناپسند کیا کرتی ہے اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی گہرائی میں خاوند کی نفرت کا جذبہ آہستہ آہستہ اُٹھ رہا ہے۔

اینڈرے بھوک اور تکان سے بے تاب ہو کر بھنے ہوئے گوشت کی طرف گرا اور شوربے کے انتظار میں پلکیں گھماتا رہا اور نہایت شوق سے کھانا ہوا چاپ چاپ کرتا رہا۔

صوفیا نے خیال کیا" میرے خدا! میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس کی عزت کرتی ہوں لیکن کھانا کھاتے ہوئے اس کا منہ اس قدر قابل نفرت آواز کیوں پیدا کرتا ہے؟" اس کے خیالات کی بے ربطی اس کے جذبات کی بے ترتیبی سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ ان ناتجربہ کار لوگوں کی طرح جو ناخوشگوار خیالات کے خلاف جدوجہد نہیں کر سکتے صوفیا اپنے دُکھ کو محسوس کرنے سے جس قدر گریز کرتی تھی اسی قدر صفائی کے ساتھ الین، اس کے گھٹنوں پر کی ریت، گاڑی اور سفید بادل اس کی چشم تصور کے سامنے آجاتے تھے۔

اس نے اپنے آپ کو زجر و توبیخ کرتے ہوئے کہا" اور آج دوپہر کو میں ایک احمق کی طرح وہاں کیوں چلی گئی تھی؟ اور کیا میں واقعی اس قدر کمزور ہوں کہ مجھے اپنے آپ پر قطعاً اختیار نہیں ہے"۔

خوف زدہ ہونا خطرے کے احساس کو بڑھا دیتا ہے۔ اینڈرے کھانا ختم کرنے کے قریب تھا اور اس اثنا میں صوفیا نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ سب معاملہ اپنے خاوند کے سامنے بے کم و کاست بیان کردے گی اور اس خطرے سے آزاد ہوجائے گی۔

صوفیا نے کھانا کھانے کے بعد جب اس کا خاوند سونے کے لئے کوٹ اور بوٹ اتار رہا تھا کہا "مجھے تم سے ایک نہایت ضروری بات کہنی ہے اینڈرے"!

"اچھا؟"

"آؤ، یہ جگہ چھوڑ دیں"!

"ہوں! . . . . . اور جائیں کہاں؟ اتنی جلدی واپس شہر میں جانے کی کیا پڑی ہے"!

"نہیں، میرا مطلب ہے صرف سیر وغیرہ کے لئے . . . . . "

"سیر کے لئے . . . ." اینڈرے نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا میں بھی سیر کے خواب دیکھتا رہتا ہوں لیکن روپے وغیرہ کا انتظام کیسے ہوگا اور میں دفتر کا کام کس کے سپرد کروں؟" پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا "بے شک تم اکتا گئی ہوگی اگر پسند کرو تو فی الحال تم اکیلی ہو آؤ"

صوفیا نے اس رائے سے اتفاق کرلیا اور معاً اسے خیال گذرا کہ الین یہ خبر سن کر بہت خوش ہوگا اور اسی گاڑی میں، اُسی ڈبے میں اس کے ساتھ بیٹھ کر سفر کرے گا . . . . اس نے یہ سوچا اور اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ جو مطمئن تھا اور ابھی تک کسی قدر افسردہ معلوم ہوتا تھا۔ کسی وجہ سے صوفیا کی آنکھیں اینڈرے کے پاؤں پر جم گئیں ـــــ چھوٹے چھوٹے حسین پاؤں لکیردار خوبصورت جرابوں سے ڈھکے ہوئے تھے لیکن ہر جراب کے سرے پر ایک بدنما دھاگا لٹک رہا تھا۔

پردے کے اس پار ایک مکھی بھنبھنا رہی تھی اور بار بار کھڑکی کے پٹ کے ساتھ ٹکراتی تھی۔ صوفیا نے جرابوں کے دھاگے کی طرف دیکھا، مکھی کی ناخوشگوار بھنبھناہٹ سنی اور اپنے سفر کے تصور میں کھو گئی . . . . . . کس طرح وہ رات دن الین کے روبرو بیٹھی رہا کرے گی اور وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے چہرے سے آنکھیں نہ ہٹائے گا کس طرح وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرکے طیش کھائے گا، اپنے روحانی آلام سے متاثر ہوکر زرد ہوجائے گا۔ کبھی اپنے آپ کو نادان اور احمق کہے گا، کبھی اُسے سخت الفاظ سے مخاطب کرے گا اور کبھی اپنے بال نوچے گا اور جب تاریکی چھا جائے گی اور تمام مسافر سو چکے ہوں گے یا کسی سٹیشن پر تھوڑی دیر کے لئے اُترے ہوں گے تو وہ موقع پاکر اُس کے سامنے دوزانو ہوکر جھک جائے گا اور اس کے گھٹنوں سے ہم آغوش ہوجائے گا جیسے وہ اس روز جنگل میں ہوگیا تھا . .

صوفیا نے اپنے آپ کو جھٹک کر اس خواب سے بیدار کردیا۔

اُس نے کہا "سنو، میں تنہا نہ جاؤں گی۔ تمہیں میرے ساتھ ضرور چلنا ہوگا۔"

اینڈرے نے آہ بھر کر کہا "نادان سوفوچکا۔ انسان کو اتنا بے سمجھ نہیں ہونا چاہیئے اور ناممکن باتوں کے لیئے ضد نہیں کرنی چاہیئے۔"

صوفیا نے دل میں کہا جب تم حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ گے تو تم میرے ساتھ ضرور چلو گے۔"

بہرکیف اس نے جانے کا عہد کر لیا اور محسوس کیا کہ اب وہ تمام خطرات سے آزاد ہو چکی ہے۔ رفتہ رفتہ اُس کے خیالات صاف اور روشن ہو گئے۔ اس کی طبیعت میں مستعدی پیدا ہو گئی۔ اور اس نے اپنے آپ کو اس سارے واقعے کے متعلق آزادی کے ساتھ سوچنے کی اجازت دے دی اور محسوس کیا کہ اُس کے افکار خواہ کتنے ہی کیوں نہ بڑھ جائیں اور اس کے اوہام کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہو جائیں چلی وہ ضرور جائے گی۔ جب اس کا خاوند سو رہا تھا۔ شام کی تاریکی رفتہ رفتہ ساری کائنات پر چھا گئی۔ صوفیا دیوانخانے میں بیٹھی پیانو بجانے لگی۔ اس کے گھر کے باہر کی چہل پہل، پیانو کی موسیقی اور سب سے بڑھ کر اس خیال نے کہ وہ ایک دانا اور روشن دماغ عورت ہے اور اپنی تمام تکلیفات پر غالب آگئی ہے۔ اس کی تمام کھوئی ہوئی اور زائل شدہ قوتوں کو بحال کر دیا۔ اس کا ضمیر اسے اطمینان دلا رہا تھا کہ اگر کوئی اور عورت اس کی حالت میں ہوتی تو وہ اپنا توازن و استقلال کھو کر کب کی بھاگ چکی ہوتی۔ مگر اس کے برعکس وہ خود مارے شرم کے مری جاتی تھی، انتہائی دُکھ سے بیزار ہو رہی تھی اور اب اس خطرے سے جس کی حقیقت شاید کچھ بھی نہ تھی قطعاً آزاد ہو رہی تھی۔

جب رات کی تاریکی پھیل گئی تو ملاقاتی جمع ہونے شروع ہوئے۔ مرد کھانے کے کمرے میں تاش کھیلنے میں مشغول ہو گئے اور عورتیں برآمدے اور دیوانخانے میں بیٹھی رہیں۔ سب سے آخر میں الین آیا۔ وہ اُداس، غمزدہ اور بیمار معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک کوچ پر کونے میں دبک کر بیٹھ گیا اور وہاں سے بالکل حرکت نہ کی۔ الین جو بالعموم نہایت زندہ دل اور باتونی ہوا کرتا تھا آج بالکل خاموش اور افسردہ بیٹھا آنکھیں ملتا رہا۔ جب اسے کسی بات کا جواب دینا ہوتا تو وہ بہت کوشش کے ساتھ اپنے اوپر والے ہونٹ کو جنبش دے کر چہرے پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتا اور بڑی کوشش اور مشکل کے ساتھ جواب دیتا تھا۔ تین یا چار مرتبہ اس نے ہنسی مذاق کی کوئی بات کرنی چاہی لیکن ہر مرتبہ اس کی کوشش رائگاں گئی۔ صوفیا نے محسوس کیا کہ وہ تقریباً مخبوط الحواس ہو چکا ہے۔ صرف اب جب کہ وہ بیٹھی پیانو بجا رہی تھی اس نے محسوس کیا کہ یہ حرماں نصیب آدمی بُری طرح اس کی محبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی رُوح علیل تھی اور اسے کسی پہلو قرار نہ تھا، صرف اُس کی خاطر وہ اپنی جوانی کے بہترین دِن ضائع کر رہا تھا۔ اپنی جائداد کا آخری حصہ موسم گرما کی اس تفریح گاہ میں اپنی ماں اور بہنوں کو چھوڑ چھاڑ کر بیٹھا صرف کر رہا تھا، اور بدترین بات یہ تھی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ایک تباہ کن جنگ کر کے اپنے آپ کو تباہ و برباد کر رہا تھا۔ اگر کوئی نہایت سرسری نظر سے بھی دیکھتا تو اُس کی اس حالت زار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

صوفیا نے یہ سب کچھ نہایت وضاحت کے ساتھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا یہاں تک کہ اس کے دل میں

درد کی ایک ٹیس اُٹھی لیکن اگر اس وقت بھی وہ اُٹھ کر ایلین کے پاس چلی جاتی اور نہیں کہہ دیتی تو اس وقت اس کی آواز میں ایک ایسی سختی اور درشتی ہوتی کہ ایلین کو مایوس کر دینے کے لئے کافی ہوتی۔ لیکن وہ اس کے پاس نہ گئی اور اس نے کچھ نہ کہا ـــــ بے شک اسے اس کا خیال تک نہ آیا۔ آج شام سے پہلے اس میں خود ستائی اور خود پرستی کا جذبہ اس قدر شدت کے ساتھ کبھی پیدا نہ ہوا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایلین ناخوش ہے اور وہ کوچ پر اس قدر مضطرب و بیقرار ہو کر بیٹھا ہے جیسے وہ جلتے ہوئے کوئلوں پر بیٹھا ہو۔ صوفیا کا دل اس کے لئے افسوس اور ہمدردی سے بھر گیا لیکن ساتھ ہی اپنے شوریدہ سر چاہنے والے کی موجودگی سے اس کی رُوح حسن کی فتح اور اپنے بے پناہ سحر کے احساس سے سرشار ہو گئی۔ اُس نے اپنے حسن کو اپنے شباب کو اور اپنے غیر مغلوب اور ناقابلِ عبور اوصاف کو محسوس کیا اور چونکہ اُس نے وہاں سے چلے جانے کا عہد کر لیا تھا اس لئے اس نے اس شام کی صحبت سے پوری آزادی کے ساتھ لطف اندوز ہونا چاہا۔ وہ انداز و ناز سے کھیلتی رہی، پیہم قہقہے مارتی رہی اور عجیب جذبات انگیز اور دلکش الحان میں گاتی رہی اور ہر چیز سے مسرت حاصل کرتی رہی۔ وہ جنگل کے تمام واقعے کو اور سنتری کو جو اُن کی نقل و حرکت کو بڑے غور سے دیکھنا رہا تھا یاد کر کے بہت مسرور ہوئی۔ اپنے مہمانوں اور ایلین کی ہنسی مذاق کی باتوں میں بہت دلچسپی لیتی رہی۔ وہ ایلین کے گلوبند کا پن دیکھ کر بہت خوش ہوئی جسے اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ سرخ سانپ کی آنکھیں ہیرے کو تراش کر بنائی گئی تھیں۔ اس کا دل یہ دیکھ کر اس قدر خوش ہوا کہ اُس نے اسی وقت بے اختیار ہو کر پن کے سانپ کو چوم لینا چاہا۔

صوفیا نہایت بے پروائی اور بے ترتیبی سے گاتی رہی۔ جیسے کوئی نیم مخموری کی حالت میں ہو۔ اُس نے نہایت اداس اور غم انگیز گانے چنے جو پامال امیدوں، شبابِ رفتہ اور آمدِ پیری کے متعلق تھے اور جو دوسروں کے غمزدہ دلوں پر برق بن کر گرتے تھے۔ "شباب ڈھل رہا ہے اور پیری آ رہی ہے . . . . " اس نے گایا۔ بڑھاپے سے اِس کا کیا واسطہ؟

وہ وقتاً فوقتاً اپنے گانے اور قہقہوں کے درمیان خیال کرتی رہی۔ "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میری حالت کچھ خراب سی ہو رہی ہے"۔

لوگ بارہ بجے کے قریب منتشر ہو گئے۔ سب سے آخر میں ایلین اٹھا۔ صوفیا نے اس کو رخصت کرنے کے لئے برآمدے تک اس کے ساتھ جانا چاہا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ میں عنقریب اپنے خاوند کے ساتھ چلی جاؤں گی اور اس خبر کے اثرات اُس کے چہرے پر سے دیکھنا چاہتی تھی۔

چاند بادلوں کے پیچھے چھپ گیا لیکن پھر بھی روشنی کافی تھی جس میں صوفیا ایلین کے بڑے کوٹ کے دامن کو اور برآمدے کے شامیانے کو ہوا میں اُڑتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ اُس نے ایلین کے زرد چہرے کو اور اُس کے اوپر والے ہونٹ کو مسکرانے کی کوشش میں ہلتے ہوئے دیکھا۔

"صوفیا، سوفیکا . . . . میری پیاری خاتون!" اُس نے صوفیا کو بولنے سے باز رکھتے ہوئے کہا "میری پیاری! میری محبوب!"

وفورِ محبت سے اس کی آواز بھرّا گئی، اور اُس نے محبت آمیز الفاظ اس پر بارش کی طرح برسانے شروع کر دئے جو رفتہ رفتہ نازک اور نازک تر ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ اُس نے اسے "تم" کے لفظ سے مخاطب کیا جیسے اینڈرے کرتا تھا۔ بالکل غیر متوقع طور پر اور بے خبری میں ایلین نے اپنا بازو صوفیا کی کمر کے گرد حمائل کر دیا اور دوسرے ہاتھ میں اس کی کہنی پکڑ لی۔

"میری راحت! میری مسرت!" اس نے اس کی گردن کی نقاء پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "مجھ پر رحم کرو اور میرے پاس جلدی آجاؤ۔"

صوفیا اچک کر اس کے آغوش سے علیحدہ ہوگئی اور سر اونچا کر کے اس نے اپنے غصہ اور طیش کا اظہار کرنا چاہا، لیکن اس کا غصہ ظاہر نہ ہوا اور اپنی پاکدامنی، اوصافِ حمیدہ، عفت اور پاکیزگی کے باوجود جن پر اسے فخر تھا وہ بمشکل یہ چند الفاظ کہہ سکی جو ہر معمولی اور ادنےٰ عورت ایسے موقعوں پر کہہ دیتی ہے۔

"تم ضرور دیوانے ہو گئے ہو۔"

ایلین نے کہا۔ "آؤ اب چلیں۔ میں نے اب بھی اور جنگل میں بیٹھے ہوئے بھی یہ محسوس کیا تھا کہ تم بھی میری طرح مجبور ہو صوفیا . . . . تم بھی اسی عذاب میں مبتلا ہو۔ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو اور بے فائدہ اپنے ضمیر کو تسکین دینے کی کوشش کرتی ہو۔"

صوفیا کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھ کر اُس نے اُسے آستین سے پکڑ لیا اور تیزی سے کہا۔

"اگر آج نہیں تو کل تمہیں آنا ہوگا! کیوں پھر ناحق وقت ضائع کر رہی ہو؟ میری مسرت! میری پیاری صوفیا! جب حکم صادر ہو جائے تو اس کی تعمیل معرضِ التوا میں نہیں ڈال رکھنی چاہئے۔ تم کیوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو؟"

صوفیا اپنے آپ کو چھڑا کر تیزی کے ساتھ دروازے کی طرف لپکی۔ دیوانخانے میں اس نے نہایت احتیاط سے پیانو بند کر دیا۔ کچھ دیر تک کھڑی پیانو کی طرف دیکھتی رہی اور پھر بیٹھ گئی۔ وہ کھڑی نہ رہ سکتی تھی اور نہ کچھ سوچ سکتی تھی۔ دماغی ہیجان اور روحانی آلام کی کثرت نے اسے ہولناک طریقہ پر کمزور، بے حس اور اُداس کر دیا تھا۔ اس کا ضمیر اسے رہ رہ کر ملامت کر رہا تھا کہ اُس نے اس شام کو ایک بے وقوف لڑکی کی طرح نہایت بُرا اور احمقانہ کام کیا تھا۔ برآمدے میں سے گذرتے ہوئے وہ کسی کی آغوش میں پہنچ گئی تھی اور ابھی تک اس کے سینے اور کہنی میں اس ہم آغوشی کا تکلیف دہ احساس موجود تھا۔ دیوانخانے میں کوئی شخص نہ تھا۔ صرف ایک ٹمٹماتی ہوئی شمع اپنی مدھم سی روشنی چاروں طرف پھیلا رہی تھی۔ صوفیا پیانو کے سامنے ایک تپائی پر بالکل خاموش بیٹھ گئی۔ جیسے وہ کسی بات کی متوقع تھی اور تاریکی سے مکمل فائدہ اٹھا رہی تھی اور جیسے انتہائی

ناتوانی اور بے تابی کا سیلاب اُسے اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا۔ ایک غالب آجانے والا تکلیف دہ احساس ایک عظیم اژدہے کی طرح خاموشی کے ساتھ اس کے جسم و روح کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جاتی تھی اور یہ احساس اپنی پوری شدت کے ساتھ اسے چاروں طرف سے محیط کئے ہوئے تھا۔

اپنے آپ کو البین کا تصور کرنے سے باز رکھنے کے بغیر وہ نصف گھنٹہ تک خاموش بیٹھی رہی۔ پھر لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی بمشکل خواب گاہ تک لے گئی۔ اینڈرے سو رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھ گئی اور اپنے آپ کو خواہشاتِ عشق کے سپرد کر دیا۔ اب اس کے سر میں کوئی الجھن نہ تھی۔ محسوسات اور خیالات ایک مناسبت اور مطابقت کے ساتھ صرف ایک مرکز پر مجتمع ہو گئے تھے۔ اس نے اس کیفیت کے خلاف جدوجہد کرنی چاہی لیکن فوراً اس خیال کو ترک کر دیا۔ . . .

اس نے محسوس کیا کہ اس کا مقابل دشمن جس کے ساتھ وہ جدوجہد کرنا چاہتی تھی کس قدر مضبوط، سنگ دل اور بے رحم تھا اس خوفناک غنیم کا مقابلہ کرنے اور اسے شکست دینے کے لئے ہمت اور جرأت درکار تھی لیکن اس کی تربیت اور تعلیم میں یہ سبق کہیں نہ آیا تھا اور اس کے نصاب زندگی میں اس کا کوئی باب نہ تھا۔

اُس نے اپنی کمزوری پر اپنی تحقیر کرتے ہوئے کہا۔ "بدکردار رذیل عورت! بد اخلاق پست ہمت!"

اس کی خودداری کا تند اور بے پناہ احساس اس کمزوری کی وجہ سے یکایک اس قدر غصہ میں تبدیل ہو گیا کہ اس نے اپنے آپ کو ہر اُس برے لفظ سے یاد کیا جو اُس کے ذہن میں موجود تھا۔ مثلاً اس نے کہا کہ میں ہرگز نیک اخلاق اور پاکدامن نہیں ہوں، اس قسم کے مصائب کا تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے میں ان کے مقابلے کی بالکل اہلیت نہیں رکھتی اور اُس روز میرا اضطراب محض ایک جھوٹ اور سوانگ تھا۔ اُس نے خیال کیا "اگر میں نے اس کے خلاف کوئی جدوجہد کی بھی ہے تو وہ کس قسم کی جدوجہد تھی؟ وہ عورت جو اپنے آپ کو فروخت کرتی ہے اسے بھی اس کام کو سرانجام دینے سے پہلے بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے حالانکہ وہ اپنے آپ کو فروخت ضرور کر دیتی ہے! کیا ہی جنگ ہے! دودھ کی طرح میں ایک دن میں بدل گئی ہوں صرف ایک دن میں!"

اس نے اپنے آپ کو شکست کی طرف مائل پایا، کسی دردمند احساس سے مرعوب ہو کر نہیں اور نہ البین کی شخصیت ہی سے متاثر ہو کر بلکہ اُن تاثرات اور حسیات سے مغلوب ہو کر جو باہر اس کے لئے منتظر تھے۔ اس کاہل عورت کے لئے! جس نے اور کئی سُست اور کاہل عورتوں کی طرح اپنے تئیں موسم گرما کی تعطیلات کے سپرد کر رکھا تھا۔

"کھڑکی۔ (یا کسی نے بھاری آواز میں گایا" طائر بے بال و پر ہے آشیانے میں اسیر"

"اگر مجھے (کرنا ہے تو یہ وقت نہایت موزوں ہے" صوفیا نے دل میں یہ سوچا اور اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر

وہ تو (ے! سنو! ہم . . . . ہم جا رہے ہیں! ہاں"۔

"ہاں۔ میں نے تمہیں بتادیا ہے کہ تم فی الفور اکیلی چلی جاؤ"۔

صوفیا نے پھر کہا" لیکن سنو! اگر تم میرے ساتھ نہ چلو گے تو اندیشہ ہے کہ تم مجھے کھو بیٹھو گے۔ میرا خیال ہے........ میں محبت کرتی ہوں"۔

"کس سے"؟

"میں تمہیں نہیں بتا سکتی کہ وہ کون ہے!"

اینڈٹر یے بستر میں سے پاؤں نکال کر بیٹھ گیا اور حیران ہو کر اپنی بیوی کی تاریک شبیہ کی طرف دیکھتا رہا اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا" کیا لغو اور بیہودہ خیال ہے"

اُس نے اپنی بیوی کی بات پر یقین نہ کیا لیکن وہ ڈر ضرور گیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے اور صوفیا سے کئی غیر ضروری سوالات پوچھنے کے بعد اس نے خاندان کی عزت اور بے وفائی کے متعلق چند باتیں کیں ــــــ تقریباً دس منٹ تک وہ بے پروائی کے ساتھ تقریر کرتا رہا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اُس کی اخلاق آموز تقریر نے کچھ اثر نہ کیا۔ دنیا میں ایک موضوع پر بہت سی آرا ہیں لیکن ان میں نصف سے کہیں زیادہ تمہارے سامنے ایسے لوگ پیش کریں گے جو خود کبھی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئے!

اگرچہ رات بہت جا چکی تھی لیکن موسم گرما کے سیلانی ابھی تک باہر سیر کر رہے تھے۔ صوفیا نے ایک ہلکا سا کوٹ پہنا۔ کچھ دیر کھڑی رہی، کچھ دیر سوچتی رہی.... ابھی تک اُس کا کافی ارادہ تھا کہ وہ اپنے سوئے ہوئے خاوند سے کہہ دے" تم سو رہے ہو؟ میں سیر کے لئے جا رہی ہوں.... تم میرے ساتھ آؤ گے"؟ یہ اُس کے رہ جانے کی آخری امید تھی۔ آخر اس نے یہ الفاظ کہہ دئیے۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ باہر نکل گئی... موسم نہایت خوشگوار تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ نہ تو اُسے ہوا کا کچھ خیال پیدا ہوا اور نہ رات کی ہولناک تاریکی کا بلکہ وہ چلتی رہی چلتی رہی۔ ایک با اختیار اور آزاد طاقت دھکیلتی ہوئی اسے آگے ہی آگے لے گئی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اگر راستے میں وہ کہیں رک جائے گی تو یہ بے پناہ طاقت اسے پھر گھسیٹ کر آگے لے جائیگی۔ اُس نے چلتے ہوئے حقارت آمیز انداز میں کہا" بدکردار رذیل عورت! بد اخلاق پست ہمت"! اس کا سانس پھول گیا۔ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جسم کے نیچے اسے اپنی ٹانگیں محسوس نہ ہوتی تھیں لیکن وہ طاقت جو اُسے دھکیلتے ہوئے آگے کی طرف لئے جاتی تھی شرم، ذلیل یا خطرے سے کہیں زیادہ طاقت ور تھی۔

چیخوف

عبدالغنی خاں

روحوں کی بستی

رات آدھی ہوگئی ہے اور جاڑا تیز ہے
کُہر کے مُہلک اثر سے سب فضا لبریز ہے

اس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں
مشعلیں روشن ہوں جیسے وادیٔ ظلمات میں

چارسو چھائی ہوئی ہے کیا خموشی رات کی
حسرت آلودہ ہے ہول افزا خموشی رات کی

موت کا بدلا ہے چولا دہر کے ہیجان نے
اوڑھ لی ہے چادرِ ظلمات قبرستان نے

کیا جنوں آموز ہے شہرِ خموشاں کا سکوت
کس قدر دلدوز ہے شہرِ خموشاں کا سکوت

سوچ میں ڈوبا ہوا ہے موت کا مُحکم وقار
زندگی کی بے بسی ہر سمت سے ہے آشکار

اُجلے اُجلے[1] مرقدوں پر جل رہے ہیں یوں چراغ
شیشۂ دل میں ہوں روشن جس طرح اُلفت کے داغ

منعقد کرتی ہیں رُوحیں محفلِ رازونیاز
شب کی خلوت میں گلے ملتے ہیں محمود و ایاز

جب کبھی اس وادیٔ خاموش میں آتا ہوں میں
بے خودی میں ایک ساکن رُوح بن جاتا ہوں میں

مجھ کو گورستان کی محویتیں آتی ہیں راس
جمع ہوتی ہیں مرے پیاروں کی رُوحیں میرے پاس

مجھ کو چُھو چُھو کر گذرتی ہیں مجھے کرتی ہیں پیار
مجھ پر ہوتی ہیں تصدق، مجھ پہ ہوتی ہیں نثار

آہ! یہ مہر و وفا کی غیر فانی کائنات
یہ محبت کا جہاں یہ جاودانی کائنات

میرے پیاروں کو نہیں حاصل یہاں لیکن قرار
ہر گھڑی میرے عزیزوں کو ہے میرا انتظار

میں بھی اب روحوں کی بستی کا مکیں ہو جاؤں گا
چند دن کے بعد پیوندِ زمیں ہو جاؤں گا

علم

---

[1] سنگِ مرمر کے مزار

غزلیات

رہِ شوق سے اب ہٹا چاہتا ہوں
کششِ حسن کی دیکھنا چاہتا ہوں

تجھی سے تجھے چھیننا چاہتا ہوں
یہ کیا چاہتا ہوں! یہ کیا چاہتا ہوں!

خطاؤں پہ جو مجھ کو مائل کرے گی
سزا اور ایسی سزا چاہتا ہوں

وہ مخمور آنکھیں! وہ مدہوش نظریں
خرابِ محبت ہوا چاہتا ہوں

تجھے ڈھونڈتا ہوں تیری جستجو ہے
مزا ہے کہ خود گم ہوا چاہتا ہوں

یہ خاموش منظر، یہ ساکت فضائیں
کسی کی صدائیں سنا چاہتا ہوں

وہ نظریں جھکیں، وہ کوئی مسکرایا
پیامِ محبت سنا چاہتا ہوں

کہاں کا کرم اور کیسی عنایت
مجاز اب جفا ہی جفا چاہتا ہوں

مجاز ردولوی

(۲)

اسرارِ کائنات کا محرم بنا دیا
ساقی نے جام دے کے مجھے جم بنا دیا

میں اس کی جستجو میں ہوں جس کے خیال نے
دل کو مرے محیطِ دو عالم بنا دیا

افسانۂ حیات سنایا جو شمع نے
بزمِ طرب کو حلقۂ ماتم بنا دیا

اگلے جہاں میں شیخ تجھے مل چکا بہشت
جب اس جہاں کو تو نے جہنم بنا دیا

تنگ آگیا ہوں میں دلِ حساس سے اسد
اس نے تو مجھ کو دردِ مجسم بنا دیا

اسد ملتانی

(۳)

نہ ہو مایوس اے ناکامیٔ دل دیکھنے والے
پہنچتے ہیں یونہی منزل پہ منزل دیکھنے والے

جہاں تک آخری نظریں تری مشکل سے پہنچی ہیں
وہی منزل کی حد ہے خوابِ منزل دیکھنے والے

دلِ بیتاب کی اک، اک تڑپ محشر بداماں ہے
ذرا منہ پھیر لینا۔ رقصِ بسمل دیکھنے والے

طلسمِ راہِ الفت اور فریبِ شوق۔ اے توبہ
ابھی تو مدتوں بھٹکیں گے منزل دیکھنے والے

ملال حامدی

(۴)

آرزو در آرزو طوفاں بہ طوفاں چاہیئے
شوقِ دل کا ذرہ ذرہ محشرستاں چاہیئے

تیرا عجزِ بندگی خود کھینچ لے گا عفو کو!
کعبہ خود سجدہ کرے گا ذوقِ عصیاں چاہیئے

خود تڑپ جائے گا جلوہ حسرتِ دیدار سے
پہلے تکمیلِ مذاقِ دیدِ جاناں چاہیئے!

پہلے دل میں درد پیدا کر دوا مل جائے گی
خود بخود کھل جائے گا در شوقِ زنداں چاہیئے

جلوہ محتاجِ نگاہِ شوق ہے اے تابِ دید
خود نقاب اُٹھ جائے گا نظارۂ حیراں چاہیئے

دل کے ہر ذرہ میں پیدا کر جہانِ آرزو
وسعتِ داماں بقدرِ شوقِ پنہاں چاہیئے

ہاں دکھا دیجے جہاں کو جذبِ ذوقِ بیخودی!
شمس کے ہاتھوں میں بھی اک جامِ رقصاں چاہیئے

شمس الحق نظامی

۵

اُمید آخریں مٹتی ہے جوشِ یاس و حرماں میں
مری ٹوٹی ہوئی کشتی بہی جاتی ہے طوفاں میں

یہ چھینٹیں خون کی کیسی ہیں دامانِ تمنا پر
یہ کیسا شورِ ماتم ہے مری دنیائے ارماں میں

ہجومِ نامرادی میں سکوں ہونے لگا دل کو
مجھے کچھ نیند سی آنے لگی آغوشِ طوفاں میں

مجھے پھر داستانِ منتشر یاد آ گئی اپنی
یہ کس نے رکھ دیا لاکر قفس میرا گلستاں میں

نہ تو بدلا، نہ ہم بدلے، نہ امیدِ کرم بدلی
جو پہلے تھیں وہی بیباکیاں ہیں اب بھی عصیاں میں

تمنائے سکوں خود ایک ہنگامہ ہے عباسی
خیالِ ضبط اضافہ ہے خیالاتِ پریشاں میں

ریاض عباسی امروہوی

محفلِ ادب

جسٹس محمود کے ساتھ ایک شب

سرسید احمد خاں مرحوم کے نامور فرزند مرحوم جسٹس محمود کی قوتِ حافظ اس قدر زبردست تھی کہ اس کی مثال
نہیں ملتی ہے۔ جو کتاب ایک مرتبہ پڑھ لیتے تھے وہ انہیں قریب قریب حفظ ہو جاتی تھی۔ مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ کسی
علم۔ فن کی کتاب نہ چھوٹتی تھی۔ ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء میں بمقام میرٹھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے
جسٹس محمود ان دنوں ججی سے کنارہ کش ہو کر میرٹھ میں بیرسٹری کرتے تھے۔ مولانا عبد الرزاق صاحب کانپوری مصنفِ البرامکہ
جسٹس محمود سے رات کے وقت ملنے گئے۔ ... ماہر منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے ہمراہ
سید محمود پہلے منشی رحمت اللہ رعد کی جانب مخاطب ہوئے (رعد مرحوم کی
آواز بہت بلند تھی اس لئے مزاحاً فرمایا کہ آپ واقعی اسم بامسمیٰ ہیں اس کے بعد کہا "بھائی صاحب (یہ مرحوم سید محمود کا
عام اندازِ تخاطب تھا) آپ شاعر ہیں مجھے آپ سے شعر و سخن ہی کی گفتگو کرنا چاہیئے۔ ہاں یہ فرمایئے کہ آپ کچھ سنائیں گے یا سنیں گے؟
منشی رعد مرحوم نے جواب دیا: میں تو کچھ سُننے کے لئے حاضر ہوا ہوں جسٹس محمود نے پوچھا کس زبان کا کلام سُنیئے گا؟

"اردو"

"کس دور کا کلام؟"

"زبان اردو کے پہلے شاعر ولی دکنی کا کلام"

"آپ سے یہ کس نے کہا کہ ولی زبان اردو کا پہلا شاعر ہے؟ اس سے پہلے بیسیوں اردو شاعر ہندوستان میں گزرے
ان کا کلام سنیئے۔ یہ کہہ کر سید محمود نے ان شعرائے قدیم کا اُردو کلام سنانا شروع کیا جو ولی دکنی سے بہت عرصہ پیشتر گزرے
اور ساتھ ہی ہر شاعر کا مختصر تذکرہ اور سنہ پیدائش یا سنہ وفات بھی بتاتے جاتے تھے۔

سید محمود شراب بے اختیار پیتے تھے لیکن سوائے ان کے مخصوص جام بردار کے کسی شخص نے انہیں کبھی شراب پیتے نہ
دیکھا نہ تمام عمر کوئی شخص یہ محسوس کر سکا کہ سید محمود اس وقت عالمِ کیف میں ہیں۔ چنانچہ سید محمود ڈیڑھ دو گھنٹے تک اردو کے
ابتدائی شاعروں کا کلام سنانے کے بعد چند منٹ کے لئے خلوت میں گئے۔ ادھر ملازم نے مولانا عبد الرزاق صاحب اور منشی
رحمت اللہ رعد کو چائے کی پیالیاں پیش کیں۔ سید محمود باہر تشریف لائے۔ "ہاں منشی رعد صاحب اب کس زبان کا کلام سنیئے گا؟"

منشی رعد نے جواب دیا " فارسی کا"

" کس دور کا کلام سنئے گا؟"

" مجھے آپ کی زبان سے مثنوی مولانا روم سننے کا بہت اشتیاق ہے۔

" کون سا دفتر سنئے گا؟"

" جو دفتر مناسب سمجھیں"

" کون سی حکایت سنئے گا؟"

منشی رحمت اللہ رعد کی زبان سے اتفاقیہ طور پر ایک مصرع نکل گیا ع دید مجنوں را یکے صحرا نورد

سید محمود مرحوم نے پیشانی پر انگشتِ شہادت رکھ کر صرف چند سکنڈ تامل کیا اور پھر فرمایا۔ بھائی صاحب یہ حکایت مثنوی شریف کے فلاں دفتر میں ہے اس سے پیشتر فلاں حکایت ہے اور قصہ کا ربط یہ ہے۔ یہ کہہ کر سید محمود مرحوم کرسی پر مؤدب بیٹھ گئے دونوں ہاتھ باندھ لئے اور نہایت دلفریب قرات سے اعوذ باللہ و بسم اللہ کے بعد مثنوی شریف کی مندرجہ بالا حکایت سنانی شروع کی۔ سید مرحوم کے مثنوی پڑھنے کا لہجہ نہایت موثر اور والہانہ تھا۔ حکایت ختم کرنے کے بعد آپ پھر دو چار منٹ کے لئے خلوت میں تشریف لے گئے اور دونوں ملاقاتیوں کی خدمت میں چائے کی پیالیاں پیش کی گئیں۔

سید صاحب پھر باہر تشریف لائے اور منشی رحمت اللہ رعد کی جانب مخاطب ہو کر دریافت کیا " بھائی صاحب اب کیا سنئے گا؟"

" غزل"

" کس کی غزل"؟

" حافظ کی"

" کون سی غزل"

منشی رحمت اللہ رعد نے حافظ کا ایک مطلع پڑھ دیا۔ سید محمود نے اسی وقت حافظ کی پوری غزل خوش الحانی سے سُنا دی اس کے بعد پوچھا " اب کس کا کلام سنئے گا؟"

رعد مرحوم نے جواب دیا " کلام صائب"۔

پوچھا " کونسی غزل؟ رعد مرحوم نے مطلع پڑھا۔ سید محمود مرحوم نے پوری غزل سُنا دی۔

اس کے بعد پوچھا۔ اب کس کا کلام سناؤں"

" نظیری کی کوئی غزل"۔

" کون سی غزل؟"

رعد مرحوم نے ایک مطلع پڑھا لیکن اتفاق سے وہ مطلع نظیری کا نہ تھا۔ سید مرحوم نے فوراً ٹوک کر کہا۔ یہ نظیری کا کلام نہیں انوری کا مطلع ہے۔ اور پوری غزل یہ ہے۔ یہ کہہ کر انوری کی غزل سنا دی۔ اس کے بعد پوچھا "اب کس کا کلام سنئے گا؟" رعد مرحوم نے عرض کیا "اب مجھ میں آپ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں جو کچھ جی چاہے سنا دیجئے گا۔ سن لوں گا۔"

سید مرحوم اس فقرہ پر بہت ہنسے اور کہا جب تک مجھ سے کوئی سوال نہ کرے میں اسے کچھ بتاتا نہیں اب اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ سے گفتگو ختم ہو چکی" یہ فرما کر دو چار منٹ کے لئے پھر خلوت میں تشریف لے گئے۔ واپس آکر مولانا عبدالرزاق کانپوری سے مخاطب ہوئے۔ کہا بھائی صاحب! اب تھوڑی دیر آپ سے گفتگو ہوگی۔"

نصف شب گزر چکی تھی۔ سید مرحوم کو رات میں نیند نہیں آتی تھی۔ ان کا قاعدہ تھا کہ اپنے دو چار دوستوں یا معتقدوں کو پکڑے رہتے تھے اور تمام رات ہر شخص سے اسی کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے رہتے تھے۔ اگر اتفاق سے کسی شب کوئی دوست نہ ملتا تو اپنی کوٹھیوں کے مالیوں اور گھسیاروں کو بلا لیتے تھے۔ مالیوں سے فن باغبانی پر گفتگو ہوتی گھسیاروں سے پوربی زبان کے گیت سنانے کی فرمائش ہوتی۔ ایک گیت گھسیارے سناتے دوسرا گیت سید محمود مرحوم، اسی لب ولہجہ میں گھسیاروں کو سنا دیتے تھے اس مشغلہ میں رات ختم ہو جاتی تھی۔

مولانا عبدالرزاق سے مخاطب ہو کر البرامکہ کی بہت کچھ تعریف کی اور چند قدیم عربی کتابوں کے نام لے کر فرمایا کہ فلاں کتاب جو فلاں مصنف کی لکھی ہوئی ہے اور فلاں مطبع سے فلاں سنہ میں شائع ہوئی ہے اگر آپ اس کے فلاں صفحے کو دیکھیں تو یہ واقعہ ملے گا۔ اس کے بعد مولانا سے حسب معمول پوچھا کچھ سنئے گا، یا سنائیے گا؟ مولانا نے جواب دیا میں سائل کی حیثیت سے حاضر خدمت ہوا ہوں۔ مسئول بننا نہیں چاہتا۔

"کیا سنئے گا؟"

"علم حیوانات کے متعلق آپ کی زبان سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔"

"کس حیوان کے متعلق بیان کروں؟"

"لال کے متعلق"

سید مرحوم نے اسی وقت لال کی مکمل تاریخ شروع کر دی۔ یہاں تک کہ لال کے طبی خواص اور اس کو لڑائی کے لئے تیار کرنے کے طریقے بھی بیان کر دئے اس کے بعد مولانا عبدالرزاق صاحب سے پوچھا اب کس جانور کے حالات پوچھئے گا؟ مولانا نے جواب دیا "کچھ کوے کے متعلق ارشاد ہو" سید مرحوم نے پوچھا کبھی آپ نے مکتب میں پڑھا ہے؟ مولانا نے جواب اثبات میں دیا۔ "کبھی یہ بھی شمار کیا ہے کہ ایک ٹکڑی میں کے کوے ہوتے ہیں" مولانا نے جواب نفی میں دیا بولے۔ ہر ٹکڑی میں سات کوے ہوتے ہیں ایک نر ہوتا ہے اور سات مادہ۔ مادائوں میں ایک مادہ سب کی افسر ہوتی ہے۔ اس کا فرض یہ ہوتا ہے کہ دوسری مادائوں اپنے قبضہ میں رکھے اور کسی مادہ کو اپنی ٹکڑی سے دوسری ٹکڑی میں نہ جانے دے۔ جو عورت اس قسم کی ہو اسے ہماری دہلی کی

زبان میں "ڈہڈھو کہتے ہیں"۔

یہ فرماکر آپ بہت ہنسے۔ رات بہت تھوڑی باقی رہی تھی۔ چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا۔ وہ بجھ گیا۔ جب کمرے میں تاریکی پھیل گئی تو سید محمود نے اپنے دوستوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا اب آپ صاحبان آرام فرمائیں۔ میں بھی ذرا دیر لیٹوں گا۔ مجھے نماز فجر کے لئے اٹھنا ہے۔ (مدینہ)

اقبال

جنہیں رفعت سے آنکھیں تک ملانے کا نہ تھا یارا
انہیں پھر سے اڑی یہ کس کی تجلی سپہر آرا

گرے میراثِ آبا کھو کے یوں ہم خاکِ حسرت پر
کہ تھا دنیا کی آنکھوں کے لئے عبرت یہ نظارا

"کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے"
ترے دل کو بنایا قلبِ مسلم کس نے دوبارا

گداؤں کو جہاں بانی سکھانے کے لئے کس نے
خزانہ حکمتِ گم گشتہ کا پھر پالیا سارا

ہوئے افراد پھر احیائے ملت کے لئے قرباں
حق آگاہی تجھے بخشی خود آگاہی نے دوبارا

درآیا پھر قشونِ عشق یغمائے دل و جاں کو
ہوس کے قافلے کوسے کے بھاگا نفسِ امّارا

نقیبِ آفتابِ تازہ و تابندہ تر آیا!
کہ ابھرا ہے افق سے پھر ترا ڈوبا ہوا تارا

فلک سے جا ملا پھر طاقِ قصرِ سطوتِ کبریٰ
ترا اقبال ہے اور ملتِ بیضا کا نقارا

بنایا اپنے دل کو گنجِ اسرارِ بقا جس نے
اور اس کو امتِ مرحوم کی تقدیر پر وارا

سرورِ سینۂ ملت، فروغِ دیدۂ دنیا
خدائے پاک کا پیارا نبی کی آنکھ کا تارا

نوا سازِ خودی! تیری نوا کی گونج اٹھی ہی تھی
کہ ٹھکرانے لگے پھر بے نوا تاجِ سر دارا

ترے ذوقِ یقیں نے کارفرمائے جہاں پائے
وہی دل دیدۂ نکبت نے پایا جن کو ناکارا

ریاضِ ہند کو تو نے لہو رو رو کے سینچا ہے
ادا تو نے کیا ملت کی تقصیروں کا کفارا

کیا ہر باغِ ملت میں شمیمِ جاں فزا سے کر
ترا جوشِ اخوت اور صبا کا خیلِ آوارا

ترے سوزِ محبت کی فسوں سازی نے پگھلائے
وہ بے حس دل کہ تھے قرنوں سے ننگِ سینۂ خارا

حامد علی خاں (نیرنگ خیال اقبال نمبر)

جدید رسائل

خمستان۔ یہ ماہوار رسالہ بزمِ اردو راولپنڈی کے زیرِ اہتمام حال میں شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس وقت تک اس کے تین نمبر شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا پرچہ ہمارے زیرِ نظر ہے۔ ادارۂ تحریر میں دوسرے قابل حضرات کے علاوہ مولانا سید عبدالحمید صاحب عدم کا نام بھی نظر آتا ہے۔ آپ اردو زبان کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ جن کا پر جوش اور ولولہ انگیز کلام زینتِ "ہمایوں" ہوتا رہتا ہے۔ ان حضرات کی نگرانی میں رسالہ کا معیار روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ موجودہ پرچے کے نثر کے مضامین میں "اصلاحِ زبانِ اردو" خاص اہمیت رکھتا ہے۔ باقی مضامین اور افسانے بھی دلچسپ ہیں۔ حصۂ نظم میں حضرت عدم کی نظموں کے علاوہ باقی نظمیں بھی اچھے معیار کی ہیں۔ یہ رسالہ قابلِ قدر ہے چندہ سالانہ ــــــہ فی پرچہ ۵ر

سفینۂ نسواں۔ یہ نسوانی رسالہ حیدرآباد دکن سے جاری ہوا ہے۔ اس وقت تک اس کے کئی نمبر نکل چکے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ بہترین زنانہ رسائل میں سے ہے۔ اس کے نامہ نگار قابل حضرات و خواتین ہیں۔ خود اعلیٰ حضرت خسروِ دکن کا کلامِ فصاحت التیام شائع کرنے کا فخر اس رسالے کو حاصل ہے۔ نسوانی موضوعات پر مفید مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ہر مہینے خوبصورت تصاویر رسالے کی زینت کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔
چندہ سالانہ للعہ ر (مع محصول)

پاسبان۔ یہ رسالہ حضرت لطیف انور گورداسپوری کے زیرِ ادارت گورداس پور سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے تین یا چار نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ حضرت لطیف انور شاعر کی حیثیت سے ناظرین ہمایوں سے روشناس ہو چکے ہیں۔ ان کا رسالہ لطیف ذوق اور حسنِ اہتمام کے ساتھ مرتب ہوتا ہے۔ چندہ ۸ ــــہ ر مع محصول ڈاک

المقالہ۔ المقالہ پہلے ہفتہ وار اخبار تھا۔ اب ماہوار رسالے کی صورت میں شائع ہونے لگا ہے۔ اس کے ایڈیٹر جناب معمول انور ہیں جو ایک صحیح الذوق شاعر اور ادیب ہیں۔ المقالہ علمی اور ادبی مضامین اور دلچسپ معلومات کا حامل ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ للعہ طلبہ سے ــــ سے ر
مینجر "المقالہ" سرگودھا سے طلب فرمائیے

فہرستِ مضامین

جلد نمبر ۲۲ — نمبر ۶

"ہمایوں" بابت ماہِ دسمبر ۱۹۳۲ء

تصاویر (۱) موسیقی (۲) قیدی شہزادے (۳) الحمرا کا ایک دالان (۴) القصر کا بیت السفراء (۵) راج ہنس (۶) فلیمنگو (۷) زورقِ صحرا (۸) بارہ سنگوں کا گروہ۔

قیمت فی پرچہ ۶/ — ولایت سے سالانہ ۸/ — چندہ سالانہ للعہ مع محصول

"طلسمِ زندگی"

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ مدیر "ہمایوں"

کے

ادبی مضامین کا دلکش مجموعہ

عنقریب شائع ہو رہا ہے طلسمِ زندگی میاں صاحب کی پندرہ سال کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں تقریباً سو چھوٹے مضمون اور پونے دو سو چھوٹے چھوٹے شہ پارے ہیں۔ مناظر، صدائے روح، آئینۂ دل، جدوجہد، سرگوشیاں، خیالاتِ پریشاں، چھ مختلف باب ہیں جن میں مضامین تقسیم کئے گئے ہیں طلسمِ زندگی حسنِ فطرت، اخلاق، تصوف، نفسیات اور محبت کے پاکیزہ جذبات کا ایک بوقلموں نگارخانہ ہے جس میں زندگی کے صحیح اور فلسفیانہ مطالعہ کے بدیع المثال اور دلآویز مرقعے پیش کئے گئے ہیں، کتاب کا ایک حصہ لطیف مزاحیہ مضامین کے لئے بھی وقف ہے جو گویا ملح فی الطعام کا کام دیتا ہے۔

اس مجموعے میں "ہمایوں" کے مطبوعہ مضامین کے علاوہ جدید مضامین بھی شامل ہیں بلکہ مطبوعہ مضامین بھی تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ کے بعد بالکل ایک نئے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔

"طلسمِ زندگی" تقریباً ایک درجن یک رنگ و سہ رنگ خوبصورت تصاویر سے بھی مزین ہوگی۔ اور یہ تصویریں بھی ایسی ہیں جو اپنی جگہ استادانِ فن کے بہترین مصورانہ کمالات کا نمونہ سمجھی گئی ہیں۔

کتابت پنجاب کے ایک بہترین خوشنویس کے سپرد کی گئی ہے طباعت اعلیٰ درجے کے اہتمام سے ہوگی۔ اس کے علاوہ کتاب کی آرائش کے لئے ماہرِ فن مصوروں کے مشورے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ غرضکہ "طلسمِ زندگی" کی معنوی صورت کی طرح ظاہری صورت کو بھی دلکش بنانے کے لئے تجارتی مصالح کو نظرانداز کرتے ہوئے بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔

حجم ۲۵۰ صفحات کے قریب ہوگا اور جلد بہت خوبصورت ہوگی قیمت تقریباً تین روپے فی جلد۔ ایک زیادہ قیمتی ایڈیشن بھی شائع ہوگا، جس کی جلد زیادہ نفیس ہوگی۔ اس کی قیمت فی الحال مقرر نہیں کی گئی،

یہ مجموعہ محدود تعداد میں شائع ہو رہا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے ایڈیشن تک انتظار کی زحمت برداشت نہ کرنی پڑے تو فی الفور اپنی فرمائش دفتر "ہمایوں" میں بھیج دیجئے جن حضرات کی فرمائشیں پہلے پہنچیں گی اُن کا حق فائق سمجھا جائے گا۔

منیجر رسالہ ہمایوں۔ ۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

عرضِ حال

یہ اس سال کا آخری پرچہ ہے۔ آئندہ پرچہ "ہمایوں" کا گیارھواں سالگرہ نمبر ہوگا۔ گیارہ سال کی اِس مدت میں "ہمایوں" نے اُردو زبان وادب کی جو خدمت انجام دی ہے اس کا اندازہ ہم سے زیادہ آپ کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس کے متعلق کسی قسم کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اپنے بڑھے ہوئے مصارف کے باوجود "ہمایوں" نے ہمیشہ خاموشی کے ساتھ ہر قدم آگے ہی کی طرف بڑھانے کی کوشش کی ہے اور اگرچہ اقتضائے وقت کے پیشِ نظر ہم نے چندے میں بھی خاص تخفیف کردی لیکن اس کے باوجود رسالہ ظاہری ومعنوی نقطۂ نظر سے اور بھی ترقی کر گیا۔ "ہمایوں" تاجرانہ نقطۂ نظر کے مطابق بلند بانگ دعاوی کرنا غیر ضروری سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ اسے اپنے ناظرین کی قدر شناس نگاہوں پر اعتماد ہے۔

گزشتہ نومبر اور دسمبر میں خاص رعایت کا اعلان کیا گیا تھا اور ایک خوبصورت اور ضخیم سالنامہ عام مسلک کے خلاف ناظرین کی خدمت میں مفت پیش کیا گیا تھا۔ اس طرح رسالے کی اشاعت میں کم وبیش ایک ہزار کا اضافہ تو بلاشبہ ہو گیا لیکن مالی پہلو سے "ہمایوں" گھاٹے میں رہا۔ اب بھی چندہ پانچ روپے ۶ ر کے بجائے چار روپے مع محصول ہے اور حسبِ دستور اس دفعہ کا شاندار سالنامہ بھی خریداروں کو اسی چندے میں مفت دیا جائے گا لیکن ہم اپنے قدیم ناظرین سے علی العموم اور اُن حضرات سے جو نومبر دسمبر کے رعایتی اعلان کے مطابق خریدار بنے تھے علی الخصوص استدعا کرتے ہیں کہ وہ ضرور اپنی معاونت برقرار رکھ کر اُردو زبان کی اس علمی وادبی خدمت میں ہماری حوصلہ افزائی کریں۔ امید ہے کہ ہماری یہ درخواست رائیگاں نہ جائے گی۔ رسالے کی آئندہ ترقی کے متعلق ہم حسبِ سابق کسی قسم کا وعدہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے لیکن "ہمایوں" کو بفضلِ خدا آپ روز بروز پہلے سے زیادہ دلچسپ، پہلے سے زیادہ مفید اور پہلے سے زیادہ بلند پایہ دیکھیں گے۔

(مینجر)

اردو ادب کا موجودہ دَور رسائل کا دور ہے،

اردو رسائل کی سرپرستی اردو کے بہی خواہوں کا اوّلیں فرض ہے۔

ہمایوں کا گیارھواں سالگرہ نمبر

جنوری ۱۹۳۳ء میں "ہمایوں" کا گیارھواں سالگرہ نمبر شائع ہوگا۔ یہ ضخیم نمبر اوّل سے آخر تک بہترین ادبا و شعرا کے بہترین تخیلات کا مجموعہ ہوگا۔ اور امید ہے کہ حسن اہتمام اور مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے یہ پرچہ خود "ہمایوں" کے سابقہ خاص نمبروں میں نہایت ممتاز ہوگا۔ بعض مضامین کے عنوان ذیل میں درج ہیں۔

خوشی کی تسخیر۔ میاں بشیر احمد صاحب کا دلچسپ اور عالمانہ مضمون جس میں فلسفۂ مسرت پر ایک غائر نظر ڈالی گئی ہے۔

(۲) ہوالغنی۔ حضرت جوش ملیح آبادی کی ایک نہایت نازک اور دلکش غزل۔ جوش کا بہترین اُستادانہ رنگ۔

(۳) میرا سخت ترین نقاد۔ "ہمایوں" کے مقالہ نگار خصوصی حضرت فلک پیما کا بلند پایہ مضمون۔ مزاحیہ افسانہ ایک نئے رنگ میں۔ نئے خیالات، نئی باتیں۔

(۴) آئن سٹائن۔ جناب منصور احمد صاحب کا دلکش مضمون آئن سٹائن کی زندگی اور اس کے نظریات پر ایک نظر۔ نظریۂ اضافیت کی تشریح خود آئن سٹائن کی زبانی۔

(۵) چند بیل۔ مشہور مزاحیہ نگار مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا ایک نئے رنگ کا مضمون۔ جانوروں کے مطالعہ کا ایک دلچسپ باب۔

(۶) ترانۂ خزاں۔ حضرت فراق گورکھپوری کی لاجواب مترنم نظم۔ جدید شاعری کا ایک بہترین نمونہ۔

(۷) مری محبت جواں رہے گی۔ حضرت راشد وحیدی کی گراں پایہ نظم اوّل سے آخر تک محبت کے زندگی پرور اور بعزم آفریں جذبات میں ڈوبی ہوئی۔

(۸) وادیٔ امن۔ میاں بشیر احمد صاحب کی لاجواب فطری نظم، فلسفیانہ خیالات کا دلفریب مرقع۔

(۹) افسانے کے لئے مواد کی فراہمی۔ اُردو کے یگانۂ ناز نقاد جناب مولوی محمد حسین صاحب ادیب۔ ایم۔ اے بی۔ ای۔ ڈی کا نہایت دلچسپ اور عالمانہ مقالہ۔

(۱۰) فیضانِ عشق۔ حکیم آزاد انصاری کی مرصع استادانہ نظم سرتاپا بہشتِ محبت۔

(۱۱) پہاڑی لڑکی۔ "ہمایوں" کے افسانہ نگارِ خاص جناب "راہرو" کا ایک نہایت دلکش افسانہ۔ فطرت کے ایک راز کی نقاب کشائی۔

(۱۲) چاندنی رات کی سیل۔ دہلی کے نوجوان اور باکمال ادیب عبدالمغنی صاحب مصنف "نرالی اردو" کا نہایت دلکش

مزاحیہ مضمون۔ کارخانہ داروں کی زبان کا بہترین مرقع۔

(۱۳) جاڑے کا موسم۔ حضرت مقبول احمد پوری کی نئے رنگ کی نظم۔ دلکش محاکات، دلآویز ترنم، اردو میں ہندی کی شیریں چاشنی۔

(۱۴) ایاز کی قبر تک۔ جناب حمید احمد خاں صاحب ایم اے کا دلآویز مقالہ۔ لطیف تاثرات کی تصویر۔ لاہور کے باز کی چلتی پھرتی زندگی کا دلکش محاکات۔

(۱۵) قوسِ قزح۔ میر سعادت حسین نجیب کی حسنِ فطرت میں ڈوبی ہوئی پاکیزہ نظم۔

(۱۶) پنا سے اجیگڑھ تک۔ مرزا نعیم بیگ صاحب نعیم کا ایک دلچسپ سفرنامہ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹی چیزوں کے مطالعہ کا لطف۔ زبان اور اندازِ بیان کا ایک بیش قیمت مرقع۔

علاوہ ازیں احمد شاہ صاحب پطرس بخاری جیسے بلند پایہ مزاحیہ نگار کے مضمون کی بھی توقع ہے۔ افسانوں میں پریم چند منصور احمد، حامد علی خاں اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے لاجواب افسانے ہوں گے۔ نظموں میں حضرت اثر صہبائی کا راحت کدہ، حضرتِ عدم کی نظم "بیتے ہوئے دنوں کی یاد" جناب سید علی اختر صاحب اختر کی گراں پایہ نظم، غمِ روزگار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حامد علی خاں کی نظمیں بھی ہوں گی

اس پر مستزاد کئی چھوٹے چھوٹے مضامین اور غزلیں ہوں گی۔ باقی رہیں تصویریں، یہ تو اب "ہمایوں" کے عام نمبروں میں بھی بہت ہوتی ہیں۔ جنوری نمبر میں اور بھی زیادہ یک رنگ وسہ رنگ تصاویر ہوں گی۔ عام طور پر معلوم ہے "ہمایوں" کی تصویریں معیارِ مصوری کے لحاظ سے بہترین ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ غرضیکہ سالگرہ نمبر ہر حیثیت سے بے انتہا دلکش ہوگا۔ اور الگ پرچے کی قیمت ایک روپے کے قریب ہوگی لیکن جو حضرات للعہ (مع محصول) رعایتی چندہ بھیج کر سال بھر کے خریدار بن جائیں گے انہیں یہ پرچہ مفت ملے گا۔ اور دوسرے معاصرین کی طرح سالگرہ کی زائد قیمت نہ لی جائے گی۔ فرمائشیں جلد بھیجئے اور بھجوائیے۔

براہِ نوازش

"ہمایوں" کے متعلق ہر قسم کی خط وکتابت کرتے وقت خریدار حضرات اپنے چٹ نمبر کا حوالہ فرور دیں۔ بصورت دیگر اُن کے ارشاد کی تعمیل ناممکن ہوگی۔

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے ورنہ دفتر جواب دینے کا پابند نہ ہوگا۔

مینیجر رسالہ ہمایوں ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

جہاں نما

سر علی امام مرحوم

افسوس کہ نواب موید الملک سر سید علی امام کا انتقال ہو گیا۔

مرحوم اس دَور کے قابل ترین مسلمان مدبرین میں سے تھے۔ سر محمد شفیع کے بعد سر علی امام کا انتقال مسلمانوں کے لئے اس سال کا منحوس ترین حادثہ ہے۔ سر علی امام وسیع الخیال محبِ وطن اور دردمند مسلمان تھے۔ اُن کی قانونی قابلیت اور سیاسی تجربہ مسلمہ تھا۔

مرحوم ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ صوبہ بہار میں پٹنے کے قریب ایک معمولی قصبہ نیورہ آپ کا مولد ہے۔ علم و فضل اور شرافت و نجابت سر علی امام کے خاندان کی میراث ہے۔ علامہ اقبال نے مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے بجا کہا ہے ؎

اے امام اے سیدِ والا نسب | دودمانت فخرِ اشرافِ عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی | عقلِ کُل را حکمت آموز آمدی

سر علی امام کے والدِ ماجد شمس العلماء نواب امداد امام اثرؔ ایک قابل شاعر اور مصنف ہیں۔ خود سر علی امام کی سخن سنجی، سخن فہمی اور بذلہ آفرینی ہر محفل کی رونق ہوا کرتی تھی۔ قانون سے اس خاندان کو خاص لگاؤ رہا ہے۔ سر علی امام کے دادا انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ججی کے عہدے پر فائز تھے۔ سر علی امام کے چھوٹے بھائی سید حسن امام ہندوستان کے قابل ترین بیرسٹروں میں سے ہیں۔

سر علی امام نے ابتدائی تعلیم آرہ اور پٹنہ میں پائی۔ اس کے بعد حصولِ تعلیم کے لئے انگلستان گئے جہاں سے ۱۸۹۰ء میں بیرسٹر ہو کر واپس ہندوستان تشریف لائے۔ بہت جلد قانونی حلقوں نے آپ کی قابلیت کا لوہا مان لیا اور مرحوم کا قدم سرعت کے ساتھ منازلِ ترقی طے کرنے لگا۔ ۱۹۱۰ء میں سر علی امام حکومتِ ہند کے لا ممبر بنے اور اپنے فرائض کو نہایت قابلیت سے انجام دیتے رہے۔ مُلکی اور مِلّی کاموں سے انہیں ہمیشہ خاص لگاؤ رہا۔ مُسلم لیگ اور علی گڑھ کی تحریکات میں انہوں نے نمایاں حصّہ لیا۔ ۱۹۱۷ء میں اعلیٰ حضرت خسروِ دکن نے انہیں وزارتِ عظمیٰ کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا۔ اس زمانے میں انہوں نے مملکتِ دکن کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور حضور نظام نے انہیں نواب موید الملک کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

گزشتہ سال گول میز کانفرنس کے سلسلے میں جب آپ انگلستان تشریف لے گئے تو وہیں آپ کی صحت بگڑنی شروع ہوئی۔ اس دفعہ دیوالی کی تعطیل کے موقع پر آپ پٹنہ گئے جہاں اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو کر ۳ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو آپ نے انتقال فرمایا اور حسبِ وصیت رانچی میں سپردِ خاک ہوئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

ہم لیڈی امام، شمس العلماء نواب امداد امام، سید حسن امام اور مرحوم کے دوسرے متعلقین سے اُن کے اس نقصانِ عظیم پر دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔

تصاویر

(اس پرچے کی آٹھوں تصاویر کے متعلق ذیل کی چند سطور ملاحظہ فرمائیے)

(۱) **موسیقی**۔ یہ انیسویں صدی کے ایک جرمن مصوّر کارل کیزل کا تصوّر ہے۔ موسیقی قدیم ترین فنون میں سے ہے اور عالم و جاہل، مہذب و وحشی سب اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ حسیاتِ عالیہ میں سے باصرہ کا تعلق زیادہ تر فہم و ادراک سے ہے اور سامعہ کا جذبات و محسوسات سے خوشی، خوف، محبت سب کی اپنی اپنی لے الگ ہے جس کو انسان تو کیا اکثر حیوان بھی پہچانتے ہیں۔ موسیقی ایک آفاقی زبان ہے جو ہر کہیں سمجھی جاتی ہے۔ اس کا تعلق سماعت سے ہے لیکن کانوں کی راہ سے یہ روح میں حلول کر جاتی ہے۔ موسیقی کی زبان الفاظ سے ماورا ہے۔ جو کچھ راگ کہتا ہے زبان نہیں کہہ سکتی۔

(۲) **قیدی شہزادے**۔ یہ دونوں مظلوم شہزادے اپنے ہولناک انجام کی وجہ سے انگلستان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے ان کے غاصب چچا ارل آف گلوسسٹر نے جو بعد میں رچرڈ ثالث کے نام سے مشہور ہوا تخت چھیننے کے لئے ان دونوں کو ایک زنداں میں ڈلوا دیا تھا جہاں وہ اس کے ایما کے مطابق نہایت خوفناک طریقے پر قتل کر دئے گئے۔ ان کی بھولی بھالی صورتیں دیکھ کر خود جلّادوں کے دل بھر آئے لیکن یہ پتھر دل نرم جذبات سے زیادہ دیر متاثر نہ رہ سکے اور آخر دونوں بھائی خاک و خوں میں ملا دئیے گئے بڑا بھائی شاہ ایڈورڈ پنجم ہے جو حقدارِ تخت و تاج تھا اور چھوٹا بھائی رچرڈ ڈیوک آف یارک ہے۔

(۳) **الحمرا کا ایک دالان** } یہ شاہی عمارات مغرب میں اسلام کے اقتدار اور تہذیب و تمدن کی زندہ جاوید نشانیاں ہیں محمد کرمانی
(۴) **القصر کا بیت السفراء** } صاحب کے مضمون سے چونکہ ان کا تعلق ہے اس لئے ناظرین ہمایوں کی دلچسپی کے لئے "غرناطہ کے تین منظر" کے ساتھ اِن دونوں تصاویر کی اشاعت مناسب معلوم ہوئی۔

(۵) **راج ہنس**۔ گہرے پانی میں شاہانہ تمکنت سے تیر رہا ہے گویا قدرت نے پروبال کا ایک چھوٹا سا جہاز پانی میں چھوڑ دیا ہے۔ جو خود ہی جہاز راں بھی ہے۔

(۶) **فلیمنگو**۔ ایک قسم کا کلنگ ہے جو پانی میں بالکل ساکت و صامت کھڑا شاید اپنے عکس کی طرف دیکھ رہا ہے ایک ٹانگ پروں میں چھپی ہوئی ہے گویا یہ پروں کے اس پھول کی ڈنڈی ہے۔

(۷) **سانڈنی**۔ "زورقِ صحرا" آنکھیں گویا ریگزار کا خواب دیکھ رہی ہیں اور نتھنے صحرائی کھجوروں کی بُو سے بوجھل ہوا کے کیف میں غرق ہیں۔

(۸) **بارہ سنگوں کا گروہ**۔ سینگ کیا ہیں بے برگ و بار ٹہنیوں کا ایک چلتا پھرتا جنگل ہے۔

نیکی کرنے والا

(آسکر وائیلڈ کی ایک منثور نظم)

رات کا وقت تھا اور وُہ اکیلا تھا۔

اور اُس نے دُور سے ایک شہر کی دیواریں دیکھیں اور وُہ اُن کی طرف چل دیا۔

اور جب وُہ پاس پہنچا تو اُس نے نشاط کے پاؤں کی دھمک اور مسرت کے منہ کی ہنسی اور بہت سے سازوں کی پُرشور آوازیں سُنیں

اور اُس نے دروازے کو کھٹکھٹایا اور دربانوں میں سے کسی نے اُس کے لئے دروازہ کھول دیا۔

اور اُس نے سنگِ مرمر کا ایک مکان دیکھا جس کے سامنے سنگِ مرمر کے بڑے بڑے خوبصورت ستون تھے ستونوں کے ساتھ پھولوں کے ہار لٹک رہے تھے اور اندر اور باہر دیوار کی مشعلیں روشن تھیں اور وُہ اِس گھر میں داخل ہو گیا۔

اور جب وُہ سنگِ سلیمانی اور زبرجد کے ایوانوں میں سے گزر کر ایوانِ ضیافت میں پہنچا تو اُس نے بحری سوسن کے بنے ہوئے پلنگ پر ایک ایسے شخص کو لیٹے ہوئے دیکھا جس کے سر پر گلاب کے پھُولوں کا تاج تھا اور جس کے ہونٹ شراب کی سُرخی سے لال ہو رہے تھے۔

اور اُس نے اُس کی پُشت کی طرف جا کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "تو اس طرح کیوں رہتا ہے؟"

اور اُس نوجوان نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا اور اُسے پہچان کر بولا "ایک زمانے میں مَیں کوڑھی تھا اور تو نے مجھے اچھا کیا۔ اب میں اور کِس طرح رہوں؟"

اور وہ اُس مکان سے نکل کر پھر بازار میں آ گیا۔

اور تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اُس نے ایک عورت کو دیکھا جس کا چہرہ غازہ سے اور لباس رنگوں سے آراستہ تھا اور جس کے پاؤں میں موتیوں کی جوتیاں تھیں، اور اُس کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ کسی شکاری کی طرح ایک نوجوان آ رہا تھا جس نے دو رنگ کی قبا پہن رکھی تھی عورت کا چہرہ ایک حسین بُت کی طرح نظر آ رہا تھا اور نوجوان کی آنکھوں میں شہوت کی آگ چمک رہی تھی۔

اور اُس نے جلد جلد اُن کا تعاقب کیا اور نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر اُس سے کہنے لگا "تو اِس عورت کی طرف کیوں دیکھ رہا ہے؟ اور اس طرح بھی کوئی دیکھتا ہے؟"

اور نوجوان نے مڑ کر اُس کو پہچانا اور کہنے لگا "میں ایک زمانے میں اندھا تھا اور تُو نے مجھے آنکھیں دیں۔ اب میں اور کس کی طرف دیکھوں؟"

اور وہ دوڑ کر آگے بڑھا اور عورت کے رنگین آنچل کو تھام کر بولا "کیا تیرے چلنے کے لئے گناہ کے راستے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہا؟"

اور عورت نے مُڑ کر اُس کو پہچانا اور ہنس کر کہنے لگی "میں گناہگار تھی اور تو نے میرے گناہوں کو معاف کر دیا، اور یہ راستہ بڑا ہی خوشگوار راستہ ہے۔"

اور وہ شہر سے باہر نکل گیا۔

اور جب وہ شہر سے باہر نکل گیا تو اُس نے سڑک کے کنارے ایک نوجوان کو دیکھا جو رو رہا تھا۔

اور وہ اُس کے پاس گیا اور اُس کے لمبے لمبے بالوں والے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگا "تو کیوں روتا ہے؟"

اور نوجوان نے سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور پہچان کر جواب دیا "ایک دن میں مر گیا تھا اور تُو نے مجھے زندہ کیا۔ اب میں رونے کے سوا اور کیا کروں؟"

منصور احمد

منظر نگاری کا ارتقا

مصوّرِ قدرت

میر حسن

تک

تمام فنونِ لطیفہ جو حقائقِ زندگی کو کسی ذہنی صورت میں پیش کرتے ہیں، دو طرح پر تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق سماعت سے ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق بصارت سے ہے لیکن ان فنون میں سے صرف شاعری ہی ایک ایسا فن ہے جس کی ہمہ گیری کسی ایک قید کی متحمل نہیں ہوسکتی۔[1] جس طرح وہ جذباتِ انسانی کی ترجمانی الفاظ سے کرتی ہے اسی طرح وہ فطرت کے مناظر اس انداز سے ہمارے سامنے پیش کرتی ہے کہ نظروں کے سامنے ایک سماں کھنچ جاتا ہے اور قلب اس محاکات سے سرور حاصل کرتا ہے۔

شاعری اُس سماوی مسرت کا نام ہے جو انسانی زندگی کا منتہائے نظر ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اس قیاسی عالم کو حاصل کرنے کے لئے حقیقت سے گریز کر بیٹھے۔ کیونکہ اگر واقعی سماوی مسرت کوئی چیز ہے تو وہ انہیں دنیاوی حقائق میں پوشیدہ ہے، انہیں تجربات میں مضمر ہے۔ انسان کا فطرتاً بھی مناظرِ قدرت کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ وہ نیچر کے اُن خوبصورت پاکیزہ مناظر کو دیکھنا چاہتا ہے، جن سے وہ اپنے لڑکپن میں لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ دنیا کے آلام سے گھبرا کر اکثر نیچر ہی کے دامن میں سکوت تلاش کرتا ہے۔ اس لئے شاعری کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ ایسے مناظر کی محاکات ہمارے سامنے پیش کرے جس سے ہمارے قلب پر وہ انبساطی کیفیت طاری ہوجائے جو آرٹ کا اصل مقصد ہے اور اسی لئے ہر زبان کی شاعری نے ایسے مناظر پیش کئے ہیں۔ ہماری اردو میں بھی اس منظر نگاری کے بہترین نمونے موجود ہیں، لیکن قبل اس کے کہ ہم اردو زبان میں منظر نگاری کی ارتقائی صورت پر نظر ڈالیں (کہ کس طرح رفتہ رفتہ یہ ایک صنفِ شاعری ہوگئی) اس کے مفہوم کو معین کرلینا ضروری ہے۔

---

[1] ہیگل نے اس خیال کو نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا ہے اور نہایت قابلِ قدر نکات کی تشریح کی ہے۔

منظرنگاری کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ شاعر جس شئے سے یا خارجی تصویر کو دیکھے اس کی تصویر الفاظ کے ذریعہ سے ہمارے سامنے اس طرح کھینچ دے کہ اس کی اصل کیفیت نظروں کے سامنے آجائے۔ جس قدر یہ محاکات اصل کے قریب ہوتی ہے اسی قدر اس کا رتبہ ادب میں بلند ہوتا جاتا ہے۔ اکثر نیچر کے دلفریب نظاروں ہی پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے لیکن اس کے دامن میں ان تمام مناظر کی گنجائش ہے جن سے ہماری نظریں مستفید ہوتی ہیں۔ یہاں واقعہ نگاری اور منظرنگاری کے باریک فرق کو بھی مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک واقعہ اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ صرف کان ہی اس سے فیض حاصل کرسکیں اور دماغ کے سامنے کوئی مسلسل تصویر نہ آئے۔ لیکن اسی واقعہ کو اس طرح بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے وہی نقشہ گھوم جائے جس کو بیان کرنے والے نے دیکھا ہے۔ اس طرح منظرنگاری کا درجہ واقعہ نگاری سے بہت بلند ہے کیونکہ یہاں سامعہ اور باصرہ دونوں لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اس منظرنگاری کی ابتدا کب ہوئی اور کن حضرات کے ہاتھوں اس نے پرورش پائی۔ ایک مختصر افسانہ ہے جس کے آغاز اور انجام میں نمایاں فرق موجود ہے۔ ہماری زبان نے اپنے عالمِ طفلی میں وہ تمام جلوے دیکھے جو ایک ادب کے لئے ضروری تھے۔ اسی ابتدائی دور میں ان اصنافِ شاعری کا پتا لگایا جاسکتا ہے جو آگے چل کر انتہا کو پہنچیں۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ ہماری شاعری بھی فطرت سے قریب اور حقیقت کے پہلو بہ پہلو امیدوں کی دنیا لئے چل رہی تھی۔ خیال ہوتا تھا کہ یہ بہت جلد ترقی کے مدارج طے کرجائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ زبانِ اردو کو ایک قلیل عرصہ میں قابلِ رشک ترقی نصیب ہوگئی پھر بھی اس نونہال کی بہت سی شاخیں ایسی خشک ہوئیں کہ ان کی نشوونما اگر بالکل رُک نہیں تو کم از کم سست ضرور پڑگئی۔ منظرنگاری بھی انہیں پژمردہ شاخوں میں سے ہے جو نکلتے ہی مُرجھا گئیں۔ خیریت ہوئی کہ قدرت نے میرحسن جیسا مصور پیدا کیا جس کی آبیاری سے یہ شاخ بھی پھر بار آور ہوئی۔

منظرنگاری کے بہترین نقشے ان مثنویات میں موجود ہیں جو دورِ اول میں لکھی گئیں۔ افسوس ہے کہ اس دور کی اکثر کتابیں موجود نہیں کہ کوئی قابلِ اطمینان تلاش کی جاسکے۔ جو چند نمونے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اُس وقت اِس صنفِ شاعری کی کیا حالت تھی اور ہمارے شعرانے اس طرف کتنی توجہ کی تھی۔

عہدِ قدیم کے شاعر وجہی نے جو قطب شاہ (۷۴ - ۱۰۲۵) کے زمانے کا درباری شاعر تھا اپنی مثنوی "قطب مشتری"[۱] میں ایک عیش وطرب کی مجلس کا نقشہ کھینچا ہے جس میں اہلِ مجلس اور ان کے نشے کا عالم دکھایا ہے۔

شہنشہ مجالس کئے ایک رات وزیران کے فرزند نے سب سنگات ٭ ہر ایک خوبصورت، ہر ایک خوش تھا سو ہر ایک دلکش، ہر ایک دلربا

. . . . ٭ . . . .

---

[۱] مثنوی مذکور کا یہ اقتباس ڈاکٹر محی الدین نے "اردو شہ پارے" جلد اول میں صفحہ ۹۱-۱۰۲ میں دیا ہے۔

صراحی پیالے لے ہاتاں منے[۱] ندیاں تے مشغول ہاتاں منے ؛ لگے مطرباں گانے یوں سازسوں کہ دھرتی ہلے مست آوازسوں
جو مطرب تو دو صحرا میں اس دھات گائے تو پھراں کوں اشرق تے حال آئے ؛ جو گاون وو شہ کوں کماتے اتھے سواگاں پہ راگاں جماتے اتھے
ندیماں لطافت میں جو چک آئیں تو رو تیاں کو خوش کر گھڑی میں ہنسائیں ؛ شراب ہور صراحی، نقل ہور جام ہوئے مست مجلس کے لوگاں تمام

محمد شاہی باغ کی تصویر ننھی سانولی کی دلکش تصویر محمد قلی قطب شاہ[۲] (۱۵۸۱ - ۱۶۱۱ء) کے دیوان میں موجود ہے اس کا تذکرہ بھی مصنف "اردو شہ پارے" نے اپنی کتاب مذکور میں کیا ہے[۳] یہاں ایک ساکت حسن کی محاکات منظور ہے۔

ننھی سانولی پر کیا ہوں نظر خبر سب گنوا کر ہوا بے خبر ؛ نزاقد سرو نکلے جب چھند سوں دسن جوت منج کوں دسن جیوں قمر
پون سینی ہنت الکھی ہو آپ کر سورج چند لمن جھکے دو زر کمر ؛ میں اس نور سے لبدیا ہوں کیا عجب دو جگ روشنی پایا کس نیں خبر
تو دو دسی ڈرا وے منجے دو رتھے ؛ وو کیا بوجھے مو دل میں ہے تو نگر

غرض اس زمانے کی مثنویات میں صحرا کے نقشے، باغ کا سماں، شادی کے ٹھاٹ باٹھ، محل کے تکلفات، پریوں اور دیووں کی لڑائی، دھوپ کی حالت اور موسم سرما کی کیفیت کی دلچسپ محاکات ملتی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے دکھادینا یہاں غالباً بے جا نہ ہوگا۔ طول کے خوف سے صرف چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

کشت و خون (شاہ دریائے قلزم اور شہپال کی لڑائی) کے بعد رزم گاہ کی خوفناک حالت: از غواصی

ہوئے جمع جنگی ہزاراں تمام قوی ہور خونخوار امیراں تمام ؛ یک یک جان یک کوہ یا مچ جیوں لے ہاتاں میں فتنے پھرے گرز جیوں
غضبناک ہو جیوں انگے دل ہوئے کلیجے پہاڑاں کے پھوٹ جل ہوئے ؛ او نالے ہو آفت بھرے عزم سوں کھڑے آکے میدان میں رزم سوں

. . . .

کئے قصد لڑنے کوں دو دلیر تھے زمانہ ہو اتل او پر سیر تھے ؛ او ٹھیا غل جدھر کا ادھر مار مار قیامت زمیں پر ہوا آشکار
جھلک دیک بجلیاں سی تروار کی ؛ اوڑی فاختی سخت سنسار کی

. . . .

جو دریا لہو کا ابلنے لگیا گگن اس پو کشتی ہو چلنے لگا ؛ سراں نیر اس لہو کے سمندر تھے جو ستے تھے جیوں برڑے دور تھے

---

[۱] منے = میں، دو = وہ، ہور = اور
دسن = دکھائی دینا، چھند = چالاکی، جوت = چمک، منج کوں = مجھ کو، سینی کو عام طور پر دکن کے لوگ ستی کہتے ہیں، ستی = سے۔

[۲] قلی قطب شاہ پہلا شخص ہے جس کا کلام اردو مجموعی صورت میں موجود ہے۔

[۳] اردو شہ پارے جلد اوّل ص ۱۹۵۔

[۴] از قصہ تمیم انصاری مصنفہ صنعتی بیجاپوری ـــــــــ ۶

پریوں اور دیووں کی لڑائی۔

ہوا پر سوں پریاں کی فوجاں چلیاں ۔۔۔ توں بوے کہ دریا کیاں موجاں چلیاں
ہویاں رو برو جب صفاں بے شمار ۔۔۔ ہتھیاراں سنبھالے سو مارے ہنکار

. . . .

غصے سوں پڑے یک پویک سربسر ۔۔۔ پری دیو پر دیو پریاں اُو پر
جو سینے تے کینہ، پس سارنے ۔۔۔ ٹلی یک پویک بے جگر مارنے
چلائی جو تیراں آپس تان کر ۔۔۔ پہاڑاں کو پھوڑی تو ے جان کر

. . . .

پریاں یوں چلیاں دیو میں ہر زمن ۔۔۔ کتک ابر میں جلد بجلیاں نمن
پری آپڑی دیو پر یوں شتاب ۔۔۔ کہ دیواں پو پڑتا ہی جوں آشہاب
وہی سب پریاں پیر دیواں ہیں یوں ۔۔۔ تنا رے رین کے اندھارے میں جیوں
سو یک دیو پر کئی پری بے درنگ ۔۔۔ کریں قتل یک شمع جوں کئی پتنگ
پریاں جوش میں آ اُبلنے لگیاں ۔۔۔ سو دیواں کو سارے کھنڈ لنے لگیاں

شادی[1] از بہرام و بانو حسن مصنفہ دولت[۵]

کیا فرش زریں سو ہر ٹھار پر ۔۔۔ بنائے محل سارے گلزار پر :: بچھے قالیاں بیچ ایوان کے ۔۔۔ دھرتے تکیہ لغلی بڑے شان کے
جواہر کے راسوں سے زینت کیا ۔۔۔ بہوت بھانت ہوں سارے مسند کیا :: صبح شام چھپر کا ہوے بے گماں ۔۔۔ کیا آب پاشی وہاں ہر زماں

. . . .

اس دور کے ان نمونوں سے پتا چلتا ہے کہ قدیم شعرا کے خیال میں اس صنف شاعری کی کیا وقعت تھی۔ انہوں نے ابتدا ہی میں منظر نگاری کے فرائض سے سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ ادب ا ردو ابھی عالم طفلی ہی میں تھا، نہ زبان صاف سلجھی ہوئی تھی نہ وہ الفاظ ہی موجود تھے کہ خیالات کو واضح طور پر بیان کیا جا سکے یا تصویر کی محاکات نوک پلک کے ساتھ کی جا سکے۔ جب اکبر جیسے قادر الکلام نے برسوں بعد اس بات کا اقرار کیا کہ اب بھی زبان میں ایسے الفاظ موجود نہیں کہ دریا کی روانی[۲] دکھائی جا سکے تو ظاہر ہے اس دور اوّل کے شعرا کو کن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اسی لئے ان

---

[1] اردو شہ پارے — [۲] کلیات اکبر الہ آبادی ص ۱
مرے پاس سرمایہ کافی نہیں ۔۔۔ وہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں
زباں میں نہ وسعت نہ ایسا مذاق ۔۔۔ ادھر ہے مگر اور ہی طمطراق (؟)

کی محاکات پر کسی قدر دھندلکا چھایا ہوا ہے۔ زبان میں روانی نہ تھی محاکات میں صفائی نہ آسکی، وہ ایک تصویر پیش کرنا چاہتے تھے لیکن الفاظ ساتھ نہ دیتے تھے۔ اسی لئے اس وقت کی محاکاتی شاعری میں کہیں رنگ گہرا ہو گیا کہیں کوئی حصہ چھوٹ گیا نمی سانولی کی تصویر پر ایک پردہ سا پڑا نظر آتا ہے دوسرے محاکاتی نمونوں میں بھی وہ تسلسل نہیں کہ مکمل سماں آنکھوں کے سامنے آجائے۔ لیکن یہ صرف بنیاد تھی آنے والے شعرا کے لئے نمونہ تھی چشم بینا کے لئے۔

زبان جوں جوں ترقی کر رہی تھی لوگوں کی توجہ تصنع اور بناوٹ پر مائل ہو رہی تھی۔ فارسی کے تتبع میں غزلیں لکھتے اور فارسی الفاظ و محاورات کی دلچسپ بندشوں سے اپنی شاعری کو آراستہ کرتے تھے۔ امید، ندیم گلشن، فراق، بیدل، آرزو اور مبارک وغیرہ کا دور شروع ہوا تو انہوں نے بھاشا کے الفاظ نکالنا شروع کر دئے۔ ظاہر ہے کہ اس کانٹ چھانٹ میں مناظر قدرت کی شاخیں ہندوستانی بہار سے آراستہ کیونکر رہ سکتی تھیں اور نہ ان کی گنجائش ہی غزلوں میں تھی۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ محمد شاہی دور تھا۔ اسلامی حکومت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ دلوں سے وہ جوش و خروش غائب ہو رہا تھا جو ایک زندہ قوم کی نشانی ہے۔ ندرت اور اپچ کی کمی نے شاعر جیسی معزز ہستی کو بھی تصنع کی طرف مائل کر دیا تھا۔ جب زمانہ کی یہ حالت ہو تو نیچر کی طرف کس کی نگاہ اٹھے افسوس ہے کہ میر سودا نے بھی اس صنفِ شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ میر صاحب نے برسات کے سفر میں کچھ اشعار لکھے ہیں لیکن ان کے یہاں بھی دوران مثنوی میں قدرتی مناظر کی آمیزش زیادہ نہیں۔ سودا نے قصیدوں کی تمہید میں کہیں کہیں اپنا زور قلم دکھایا۔ ہے لیکن وہ بھی اس قدر کم کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ درد تصوف ہی کے ہو رہے۔ یہ وہ دور تھا کہ عموماً ہمارے شعرا کی نظریں محلات سے لگی تھیں اور وہ قدرت کی دلفریبیوں سے گویا چشم پوشی کر رہے تھے میر حسن کے کچھ عرصہ بعد تک یہی حالت رہی۔ میر اثر کی مثنوی کو دیکھئے لیکن وہاں بھی اس جنسِ گراں بہا کے لئے جگہ نہیں۔ جرأت کی مثنوی حسن و عشق کو لیجئے کہ جرأت سودا میر اور مصحفی انشا کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان کی مثنوی میں بھی بیقراری، اضطراب فراق، وصال سب کچھ ہے لیکن نہ کہیں عاشق کی نظریں قدرتی مناظر کی طرف اُٹھتی ہیں نہ معشوق آوارہ ہی کسی گل رسوا کو سونگھتا ہے۔

لیکن اسی زمانہ میں جب دلوں میں یہ افسردگی پیدا ہو گئی تھی۔ تصنع اور بناوٹ نے دماغوں پر حکومت حاصل کر لی تھی۔ قدرت نے ایک ایسی ہستی کو بھیجا جس کے ہاتھ میں مانی کا قلم تھا جس کے برش میں یہ قدرت تھی کہ وہ فطرت کے دلفریب نظاروں کو ان کے اصلی رنگ میں جلوہ گر کر دے اور نیچر کے ان رازوں کو ظاہر کر دے جن کو ہم دیکھتے ہیں اور پھر نہیں دیکھتے۔ میر حسن نے نہ صرف ادب کی اس بڑی کمی کو پورا کیا بلکہ آنے والوں کے لئے ایک شاہراہ کھول دی۔ انہوں نے خود ایک بڑی حد تک اس صنف شاعری میں کمال حاصل کر لیا جیسا کہ ان کی مثنوی "سحر البیان" پر ایک تحلیلی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔

مناظرِ قدرت کا رشتہ انسان کی زندگی سے وابستہ ہے دنیا کی سب سے زیادہ مہتم بالشان شئے مناظر نہیں بلکہ انسان ہے۔ منظر صرف انسانی زندگی کے لئے ایک "پس پردہ" ہے۔ مناظرِ قدرت کی انفرادیت سے انکار نہیں تاہم ان کا دلچسپ یا غیر دلچسپ ہونا، انسان کے زاویۂ نگاہ پر مبنی ہے، ایک بیکس و پریشان شخص جس نظر سے قدرت کے کسی منظر کو دیکھتا ہے۔ وہ ضرور

ایک سرمست کی نگاہ سے مختلف ہوگا۔ اس لئے منظر نگار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جس نظر سے دیکھے اس کو بھی ملحوظِ خاطر رکھے ورنہ وہ اس حالت کی محاکات پر کماحقہٗ قادر نہیں ہوسکتا۔ لیکن جس وقت وہ مناظر پر گرد و پیش سے بے نیاز ہوکر نظر ڈالے تو وہی نقشہ پیش کرے جو اس کی نظروں کے سامنے ہے جس سے وہ خود لطف اندوز ہو رہا ہے میر حسن کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ فطرت کے ان دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ اگر بدرِ منیر کی بیقراری کا دن ہے تو طلوعِ آفتاب میں بھی اس کے اثر نمایاں ہیں۔

ہُوا آفتابِ الم جو طلوع ؛ اُداسی سی ہونے لگا دن شروع

لیکن اگر داستانِ ملاقات ہے تو کیفیت دوسری ہی ہے۔

ہر ایک برج رشکِ گلستاں ہے آج ؛ بہار وصالِ غریباں ہے آج

جب میر حسن تصویر کے نمایاں رخ کو دیکھتے ہیں اور کسی منظر کی انفرادی حیثیت سے اس کی تصویر کھینچتے ہیں تو دل پر وہ اثر پیدا ہوتا ہے جو رات کی خاموشی میں بانسری کی آواز سے۔

وہ گانے کا عالم وہ حسنِ بیاں ؛ وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں ؛ وہ سبزہ سہی اور آبِ رواں ؛ وہ پانی کا مستی سے بہنا وہاں

وہ اڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا ؛ کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ ؛ وہ رقصِ بتاں اور ستھری الاپ ؛ وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ

وہ دل پیٹنا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ ؛ اچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ

. . . .

جو پیچھے تھے آگے نہ وہ چل سکے ؛ جو بیٹھے سو بیٹھے نہ پھر ہل سکے ؛ لگی دیکھنے آنکھ نرگس اٹھا ؛ گلوں نے دئے کان ادھر کو لگا

غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے ؛ اڑے جس جگہ سے اڑے رہ گئے

آواز کی محاکات الفاظ سے اگر ہوسکتی ہے تو شاید میر حسن کے اسی مصرع سے "وہ اُڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا"۔

عموماً مناظرِ قدرت کی تقسیم چار حصوں میں کی گئی ہے۔

(۱) وہ مناظر جن کا تعلق اوقات سے ہے مثلاً صبح، شام، سرما، گرما

(۲) وہ مناظر جن کا تعلق مقامات سے ہے مثلاً آسماں، زمین، پہاڑ وغیرہ

(۳) وہ مناظر جن کا تعلق حسن سے ہے مثلاً کسی حسین کی محاکات، انسان کا مجسمہ وغیرہ۔

(۴) وہ مناظر جن کا تعلق عمرانیات سے ہے مثلاً رسم و رواج کی تصویر رزم بزم کا نقشہ

یہ تقسیم بہت کچھ صحیح ہے پھر بھی یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اگر کسی جگہ بھی شاعر منظر نگاری کے فرائض کو چھوڑ دیتا ہے اور فقط کسی رزم کی کیفیت یا کسی رزم کا اظہار کرنے لگتا ہے کہ اصل محاکات کے عنصر کم ہوجاتے ہیں تو وہ شاعری منظر نگاری کے تحت میں نہ آئے گی۔ میر حسن نے قریب قریب ہر قسم کی منظر نگاری کے بہترین نمونے ادب اردو میں چھوڑے ہیں۔ یہاں

چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

صبح :-

خوشی میں گئی جلد شب جو گذر — ہوئی سامنے سے نمایاں سحر

عجب رات وہ جوں سحر تھی سپید — عجب روز تھا مثلِ روزِ امید

گیا مژدۂ صبح لے ماہتاب — اُٹھا سورج آنکھوں کو ملتا شتاب

آخری مصرع کس خوبی کے ساتھ حقیقت کی ترجمانی کر رہا ہے، ان کے یہاں اس قسم کے مناظر کی بہتات نہیں لیکن انہوں نے یہاں بھی وہ بنیاد قائم کر دی جس پر انیس نے عالیشان عمارت بنائی اور جس کے آگے آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی نے قدرتی باغ لگائے۔

میر حسن کی منظر نگاری جہاں تک اس کا تعلق مقامات کی محاکات سے ہے اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ ایک جگہ باغ میں ایک نہر دکھاتے ہیں۔

بنی سنگ مرمر کی چوپڑ کی نہر گئی چارسو اس کے پانی کی لہر ؛ قرینے سے گرد اس کے سرو سہی کچھ ایک دور دور اس کے اِہ،

ہوائے بہاری سے گل لہلہے چمن سلسلے شاداب اور تھے بھرے ؛ زمرد کے مانند سبزے کا رنگ روش پر جواہر لگے جیسے سنگ

پڑے آب جو ہر طرف کو بہے کریں قمریاں سرو پر چہچہے ؛ گلوں کا لب نہر پر جھومنا اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشہ کا سا عالم گلستان پر

جنگل کا جو نقشہ میر حسن نے پیش کیا ہے لوگوں کے دلوں پر ایک خاص تسلط رکھتا ہے جس کا اثر زمانۂ طفلی کے مطالعہ کے بعد سن کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر وہ براق سا ہر طرف دشت و در ؛ وہ اجلا سا میداں چمکتی سی ریت اگا نور سے چاندنی کا کھیت

درختوں کے پتے چمکتے ہوئے خس و خار سارے جھمکتے ہوئے ؛ درختوں کے سایہ سے مہ کا ظہور گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

چاندنی رات میں درختوں کے سائے سے لطف اٹھانے والے آخری مصرع کی داد دیں گے

اسی طرح میر حسن نے شہزادے کے جلوس کی دھوم دھام، عروس کی تصویر، خواب گاہ کی حالت بھی اپنے مخصوص دلکش انداز سے دکھائی ہے۔ بدرِ منیر کو حیا و شرم کی تصویر بنا کر یوں بٹھایا ہے۔

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے — بدن کو چرائے ہوئے ناز سے

منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے — لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے

پسینا پسینا ہوا سب بدن — کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن

شرم و حیا سے بدن پر پسینا آجانا ایک قدرتی بات تھی، میر حسن نے سیمیں بدن کو شبنم آلود بنا کر جو تصویر کھینچ دی ہے

اپنے میں کیفیات کی دنیا لئے ہوئے ہے۔

رزم و بزم کے جو نقشے میرحسن نے دکھائے ہیں ان کا جواب انیس کے سوا غالباً اور کہیں نہیں ملتا۔ ایک محفل میں رقص دکھانا چاہتے ہیں تو اس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے ؛ وہ پاؤں میں گھنگرو جھنکتے ہوئے
وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں ؛ پھر کنا وہ ٹھنے کا ہر آن میں
وہ گھٹنا وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ ؛ دکھانا وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ
کبھی دل کو پاؤں سے مل ڈالنا ؛ نظر سے کبھی دیکھنا بھالنا

. . . .

وہ دانتوں کی مسی وہ گلبرگ تر ؛ شفق سے عیاں جیسے شام و سحر
وہ گرمی تھی چہرے کی جوں آفتاب ؛ جسے دیکھ کر دل کو ہو اضطراب
چمکنا گلوں کا صفا کے سبب
وہ گردن کے ڈورے قیامت غضب

اس مختصر مثنوی میں جس کثرت کے ساتھ باغ، نہر، جلوس، شادی، غمی وغیرہ کے مناظر پیش کئے گئے ہیں اُس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی صرف بزم قدرت کی ترجمانی ہی کے لئے لکھی گئی ہے۔ حالانکہ اس میں متعدد جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

میرحسن نے اس اعلیٰ محاکات کو کس طرح حاصل کیا۔ وہ کون سے نکات تھے جن پر قابو پا کر دلوں پر قابو پا لیا؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی منظر کی دو مختلف تصویروں کو نگاہ کے سامنے رکھا جائے جو دو شعرا کے کمال کا نتیجہ ہوں تاکہ بخوبی اندازہ ہوسکے کہ میرحسن کا موقلم فطرت کے کن نازک رازوں کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ جلوس کا نظارہ میر تقی میر کے قلم سے ملاحظہ ہو پھر اس کو میرحسن کی زبانی سُنئے اور داد دیجئے۔

"جلوس" خدائے سخن میر تقی میر۔

چل سواری کا سیر بھی ہے بڑا ؛ ایک عالم ہے دونوں رستے کھڑا
جل زربفت پوش نیل نشاں ؛ کوہ زر سا ہے پیش پیش رواں
زری پوشوں کا پیش و پس انبوہ ؛ اللہ اللہ ری ان کی شان و شکوہ
فوریں کتنے سونے کے ہے پہاڑ آگے (؟) ؛ کی روشنی کی جھاڑ
موتی کرتے تھے ہر طرف سے نثار ؛ تھا مگر فیل ابر گوہر بار

. . . .

روشنی بھی ہے کوئی ہنگامہ ؛ سیر میں گرم ہو گیا جامہ
شمع لاکھوں کنول میں ہیں روشن ؛ زور پھولا ہے کاغذی گلشن
تو میں کیا ڈھالی ہیں ستاروں کی ؛ کھوئی رونق فلک کے تاروں کی

"جلوس" از مصور قدرت میر حسن

زبس تھا سواری کا باہر ہجوم ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم ؛ برابر برابر کھڑے تھے سوار ! ہزاروں ہی تھیں ہاتھیوں کی قطار

سنہری روپہلی وہ عماریاں شب و روز کی سی طرح داریاں ؛ چمکتے ہوئے بادلوں کے نشان سواروں کے غٹ اور بانوں کی شان

ہزاروں ہی اطراف میں پالکی جھلابور نی جگمگی نالکی ! ؛ کہاروں کی زربفت کی کرتیاں اور ان کی دبے پاؤں کی پھرتیاں

وہ شہنائیوں کی صدا خوش نوا سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا ؛ وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی قدم با قدم با لباس زری

بجاتے ہوئے شادیانے تمام چلے آگے آگے ملے شاد کام ؛ سوار اور پیادہ صغیر و کبیر جلو میں تمامی امیر و وزیر

. . . .

میر حسن کے یہاں جس شان و شکوہ کے ساتھ سواری کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے میر کے یہاں نہیں۔ وہ عموماً ایسے الفاظ اس ترکیب سے استعمال کرتے ہیں گویا ایک سواری ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس ترکیب کا خیال رکھتے ہیں جس سے وہ دماغ پر اثر ڈالتی ہے۔ اکثر وہ اپنی محاکات کو صحیح تر بنانے کے لئے جزوی باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، کہاروں کی دبے پاؤں پھرتیاں بتا کر میر حسن نے ان کی چال بھی ہو بہو آنکھوں کو دکھا دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی محاکات زیادہ دل پذیر ہے۔

میر حسن نے عموماً چند خصوصیات کو مدِ نظر رکھا ہے اور یہی اس صنفِ شاعری میں ان کی ترقی کا راز ہیں۔

(۱) ان کے بیان میں انتہائی سلاست ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کا یہ ایک صریح مشاہدہ ہے کہ جس وقت ہم اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں تصنع بھول جاتے ہیں۔ بے ساختہ الفاظ سلیس اور صاف زبان میں نکلنے لگتے ہیں، آپ کسی بڑے شاعر کے کلام پر نظر ڈالئے جہاں وہ اپنے الفاظ سے آپ کے عمیق ترین جذبات اور احساسات کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ صاف و سلیس زبان استعمال کرتا ہے۔ میر حسن نے بھی اپنی منظر نگاری میں اس کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی سلاست میں وہ سحر کاری پنہاں ہے جو اور کسی کو شاید کوششوں کے بعد بھی نصیب نہ ہوگی۔

گلوں کا لب نہر پر جھومنا ؛ اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

(۲) میر حسن ایسی تشبیہات سے کام لیتے ہیں جن سے ہماری نگاہیں آشنا ہیں۔ اور چونکہ وہ ہمارے ملک کی خاص چیزیں ہیں اس لئے قدرتاً ہمیں ان سے زیادہ انس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تشبیہ پُر لطف ہوتی ہے۔ وہ ہمارے ملک کی مشہور چیزیں اور ہمارے روزانہ مناظر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دماغ فوراً اصل معنی سمجھ لیتا ہے اور حقیقی محاکات سے لطف اندوز ہوتا ہے ؎

کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے ؛ لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے

(۳) شاعری اصل میں ذاتی مشاہدات کی باریکیوں کا اظہار ہے۔ شاعر جس قدر زیادہ فطرت شناس اور باریک بیں

ہوتا ہے اسی قدر اس کو شاعری میں کامیابی حاصل ہوتی ہے ۔میر حسن کی نگاہ ہر چیز کی تہ کو پہنچتی ہے اور وہ آسانی سے اس کی روح کو مجسم اور مصور کر دیتے ہیں ؎

چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

صبا جو گئی ڈھیریاں کرکے پھول پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

ہوا کا پھولوں کی ڈھیریاں بنا کر چھوڑ جانا بذاتِ خود وہ سماں ہے جس سے باغ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

اس طرح میر حسن نے وہ حیثیت منظر نگاری میں حاصل کر لی جو ان سے قبل کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ ایک شاعر کے بلند مرتبہ ہونے کی بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ اس کے بعد اہلِ عالم کس قدر اس کا اتباع کرتے ہیں۔ شاعر ایک خاص روش اختیار کرتا ہے۔ اس کے جانچنے کا بہترین طریقہ وہ نتائج ہیں جن کو حاصل کرنے کی اس نے کوشش کی۔ میر حسن نے اس کثرت کے ساتھ مناظرِ قدرت پر زور دیا ہے کہ ان کی اس صنفِ شاعری سے مخصوص دلچسپی نظروں کے سامنے آگئی۔

ان کی طبیعت کا یہ رنگ اس لئے اور بھی زیادہ قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے قدرتی مناظر میں اس وقت دلچسپی لی جب لوگ اپنے مکان کے باغ پر بھی نظر ڈالنا بیکار خیال کرتے تھے۔ میر حسن کے بعد یہ رنگ بہت مقبول ہوا۔ انشا، انیس، مونس، بے نظیر وغیرہ نے اس رنگ میں اپنے کمالات کا اظہار کیا۔ غرض میر حسن نے جس دیرینہ بنیاد کو مضبوط کیا اس پر عالیشان محل تیار ہوئے یہاں تک کہ آج لوگ نیچرل شاعری کا دم بھرتے ہیں۔

کیا میر حسن کا یہ رنگِ طبیعت ہی ایک زبردست تحریک اور جدت کا پیش خیمہ تھا؟

سید حامد حسن بلگرامی

فنا و بقا

بے خطر ہو کر چڑھا جا۔ جامِ صہبائے حیات حل نہ کوئی کر سکا اے دل معمائے حیات

وہ چلا بے خانۂ عالم سے مخمورِ الست دل میں ہے شوقِ لقا اور سر میں سودائے حیات

کر ہی ڈالا بے نیازِ گردشِ انجامِ کار مرحبا اے دردِ دل! اے کارفرمائے حیات

خاک میں ملنے سے مل ہی جائے گا دُرِّ مراد ہاں فنا ہو جا! جو ہے شوق وتمنائے حیات

رفعت شروانیہ

سُنی سُنائی

سنو سنو پھر آج سناویں تم کو سُنی سُنائی
کچھ تو سنی سنائی اور کچھ اپنے مَن کی آئی
آنکھ کھول کے دیکھو پیارے دُنیا کی چترائی[1]

کھیل کود میں تم نے اپنی آدھی عمر گنوائی
بیت گئے دن بالک پن کے اُٹھو جوانی آئی
آنکھ کھول کے دیکھو پیارے دُنیا کی چترائی

الھڑپن کا سمے نہیں اب چھوڑو ریت پُرانی
گیان دھیان کی باتیں سمجھو بن جاؤ گُرگیانی
آنکھ کھول کے دیکھو پیارے دُنیا کی چترائی

دین اور مذہب کے جھگڑوں کو نہیں سُنتے اب کوئی
دین تو بس اب کئے دھرے کا، کئے دھرے سکھ ہوئی
آنکھ کھول کے دیکھو پیارے دُنیا کی چترائی

پریم راج سُکھ راج ہے پیارے سُن لو اور سُناؤ
چھوت چھات میں دھرم نہیں اب گیت سدا یہ گاؤ
آنکھ کھول کے دیکھو پیارے دُنیا کی چترائی

پیاری سنگت بھاوے سب کو بھاوے بات سُہانی
دنیا تو ہے میل جول کی چھوڑو کھینچا تانی
آنکھ کھول کے دیکھو پیارے دُنیا کی چترائی

پھرتے ہو کیوں مارے مارے ہنستی دنیا ساری
بہت نہیں تو تھوڑا کرلو چھوڑو یہ بیکاری
آنکھ کھول کے دیکھو پیارے دُنیا کی چترائی

مایا اپنی محنت کی ہے بے محنت جو آئی
اپنی چیز نہیں وہ ہرگز ہے وہ چیز پرائی
آنکھ کھول کے دیکھو پیارے دُنیا کی چترائی

تم بھولے ہو جس کے اوپر — مات پتا یا بھائی —
اپنی اپنی پڑی ہے اُس کو کام نہ کوئی آئی
آنکھ کھول کے دیکھو پیارے دُنیا کی چترائی

سید **مقبول حسین** احمد پوری

---

[1] چالاکی

شمع کی کہانی

اس کہانی کو خلوص کے مقدس احساس کے ساتھ علامۂ محترم سر محمدؐ اقبال مدظلہٗ کے اُس وفا آموز تخیل سے معنون کیا جاتا ہے
جو ماضی کی شاداب فضاؤں میں محوِ پرواز رہتا ہے۔

ایک شکستہ سے مکان کے پرانے دالان میں شمع جھلملا رہی تھی۔ جس طاق میں شمع رکھی تھی وہ دیوار کی بوسیدگی کے رنج سے خم تھا، مگر پھر بھی شمع کو اپنے سینے پر جگہ دیئے ہوا تھا۔ شمع کے آس پاس میل کچیل کا انبار تھا اور طاق کی لگر کے نیچے بھی میل کچیل کا جما ہوا دریا تھا۔ شمع جلا کی یہاں تک کہ صبح کا وقت آ گیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ اب رخصت میں کوئی آن کی دیر ہے تو طاق سے بولی۔

"جس طرح ہم سے دل خون کیا جا سکا کر چلے۔ زندگی ایک دُکھ ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ ایک افسانہ ہے جو بار بار کہے جانے سے بے لطف ہو چکا۔ اب ہم کب تک؟

شمع کی زندگی سپیدۂ سحر کے آنے تک ہے اور اُسے ہر رنگ میں جلنا ہی پڑتا ہے۔ پر ایک بات میں تم سے کہے دیتی ہوں اسے یاد رکھنا، کبھی وقت پڑا اور یاد آئی تو کہو گے ہاں کسی نے کہا تھا۔ ہم تو اب رخصت ہوتے ہیں میل کچیل چیکٹ چاکٹ، آلائش کہو، گندگی کہو، اس میں ہم تو اپنی سی گذار چلے۔ اچھی یا بُری جیسی بھی تھی۔ دو پل کی زندگی تھی، کٹ گئی پر آنے والوں کو یہ بھی نصیب نہ ہوگی ....

شمعیں اور بھی روشن ہوں گی، پروانے بھی ہوں گے، مگر پروانے کے پر جس کتابِ زندگی کے ورق بنتے تھے وہ کتاب اب کبھی نہ لکھی جائے گی، عشق کی جو کہانی ہم نے اپنی زبان سے کہی اب کبھی نہ کہی جائے گی"

طاق سنا کیا۔ شمع بجھ گئی۔

(۲)

اس بات کو بیس برس گزر گئے۔ اب وہ شکستہ مکان چوکھٹ سے لے کر تیسری منزل تک پختہ بن چکا تھا۔ وہ طاق بھی جس میں میل کچیل اور چیکٹ جما رہتا تھا چونا گچی سے پختہ کیا جا چکا تھا۔ پر اب اس میں کوئی شمع روشن نہ تھی۔ شمع کی ضرورت ہی کیوں پڑتی۔ برقی قمقمے درودیوار کو روشنی سے نہلا رہے تھے۔ بہت بڑی ضیافت تھی، مہمان بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ اور چیزوں کے ساتھ بڑے بڑے کنٹروں میں بھری ہوئی ایک سُرخ سی سیال چیز بھی تھی۔

نوجوان عورتوں اور نوجوان مردوں نے اسے بڑے شوق سے پیا۔

مگر ساری محفل میں دو بوڑھے سے آدمی الگ تھلگ بیٹھے رہے۔

ایک نئی وضع قطع کے نوجوان نے اپنے ہم وضع پاس والے کے آہستہ سے کہنی ماری اور کہا:-

"میر صاحب اور پنڈت جی شاید پیتے پلاتے نہیں . . . ."

دوسرے نے جواب دیا "نہیں یہ لوگ پیتے پلاتے نہیں پئیں بھی کیا، پرانے زمانے کے لوگ ہیں۔ انہیں زندگی کو دلچسپ بنانا نہیں آتا۔ یہ لوگ زندگی کا لطف نہیں اُٹھاتے، رسیلی زندگی بسر نہیں کرتے"۔

طاق نے بھی یہ سُنا۔ اُس کا جی بھر آیا، دل میں آئی کہ بھڑاس نکال ڈالے، دل کا حال کہہ سنائے، مگر چُپ ہو رہا۔ ناگہاں کہیں سے چکر کاٹتا ایک پروانہ طاق میں آن بیٹھا۔ طاق نے حیرانی سے دیکھا نہ تو اُس کے سینے پر داغ تھے نہ پر جلے ہوئے۔ وہ ہمت، وہ ولولہ وہ زندگی جو شمع کی گرمی سے اُس نے پروانوں میں پیدا ہوتی دیکھی تھی اس پروانے میں نام کو بھی نہ تھی۔ ہاں وہ مضمحل تھا، جیسے تھک گیا ہو، جیسے زندگی کی شراب اُس نے پی ہو مگر کیف سے محروم رہا ہو۔ طاق نے پُوچھا۔

"کہو بھئی کیا حال ہے"

پروانہ پہلے سے اس طرح بھرا ہُوا تھا جیسے باجا راگوں سے۔ چھیڑتے ہی پھوٹ بہا۔ رو رو کر کہنے لگا

"زندگی دو بھر ہوگئی ہے۔ ہمیں تو اب جینا اجیرن ہے۔ پریت کی ریت شاید اس سبھا والے بھول گئے۔ وفا اور پیار کی رسمیں بس اب خواب ہی سمجھو۔ ہم روئیں پیٹیں، دل کا خون کریں، مگر شمع پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

تم تو ان تماشوں کو بہت دن سے دیکھتے آئے ہو۔ تمہیں بتاؤ، پہلے شمع پروانوں پر خود بھی جلتی تھی کہ نہیں، خود بھی روتی تھی کہ نہیں۔ اور اب، اب نہ پوچھو، یہ ٹیڑھے سیدھے بل جو اس کی پیشانی پر ہیں نہ جانے یہ کس طرح دُور ہوں گے۔ زندگی بے کیف ہوئی جاتی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اب وہ شمعیں کہاں سے آئیں گی جن پر ہم جان دے سکیں"۔

طاق نے سنا اور بے اختیار رو پڑا۔

اسے شمع کا آخری قول یاد آگیا۔ بولا

"اے رسمِ وفا کے ننھے شیدائی کس دل سے کہوں کہ اب زمانہ بدل گیا۔ مجھے خوب یاد ہے شمع نے آخری وقت کہا تھا "اچھی یا بُری جیسی بھی تھی، ہم تو کاٹ چلے، پر آنے والوں کو یہ بھی نصیب نہ ہوگی"

آہ! زندگی میں ترقی ہوئی پر عشق سے زندگی چھن گئی۔

منظر انصاری دہلوی

زندگی جوانی اور عشق

میں نے اس نظم میں ایک مسلسل تمثیل کے ذریعے سے زندگی، جوانی اور عشق کا تصور پیدا کیا ہے۔ نظم میں ایک مکالمہ سا پنہاں ہے جسے واوین سے واضح کیا گیا ہے۔ اس نظم میں "سرزمینِ عجم" سے میری مراد سرزمینِ حُسن ہے ——— راقم

"مرے ندیم کھلی ہے مری نگاہ کہاں؟
ہے کس طرف کو مری زیست کا سفینہ رواں،
"وطن" کے بحر سے دُور اُس کے ساحلوں سے دُور؟

✽

"ہے میرے سینے میں یہ ورطۂ جنوں کیسا؟
ہے میرے چار طرف بحرِ شعلہ گوں کیسا؟
مرے ندیم کہاں بحرِ بے کنار میں ہم؟
دماغ و روح میں چبھتی ہوئی ضیائیں ہیں!
مہیب نور میں لپٹی ہوئی فضائیں ہیں
مرے ندیم، کہاں ایسے شُعلہ زار میں ہم؟

✽

"کہاں ہے آہ! مرا عہدِ رفتہ، میرا دیار؟
مرا سفینہ کنارے سے چل پڑا کیسے؟
برس رہے ہیں مری ناؤ پر یہ کیسے شرار؟
ہماری راہ میں یہ آتشیں فضا کیسے؟

✽

"وہ سامنے کی زمیں ہے مگر جزیرۂ عشق،
جو دور سے نظر آتی ہے جگمگاتی ہوئی؟
کہ "سرزمینِ عجم" کے کہیں قریب ہیں ہم؟
ترے وطن کے نواحی میں اجنبی ہیں ہم؟
فضائیں جس کی ہیں تقدیس میں نہاتی ہوئی!

✽

"یہ کیا طلسم ہے، کیا راز ہے، کہاں ہیں ہم؟
تہِ زمیں ہیں، کہ بالائے آسماں ہیں ہم!
کہ ایک خواب میں بے مدّعا رواں ہیں ہم؟"

"یہ ایک خواب ہے، بے مدّعا رواں ہیں ہم!
یہ اک فسانہ ہے، کردارِ داستاں ہیں ہم!
ابھی یہاں سے بہت دور ہے "ریاضِ عجم"،
تصوّرات میں جس خلد کے جواں ہیں ہم!

❖

وہ سامنے کی زمیں ہے مگر جزیرۂ عشق؛
جو دور سے نظر آتی ہے جگمگاتی ہوئی!
فضا پہ جس کی درخشاں ہے اک ستارۂ نور،
شعاعیں رقص میں ہیں زمزمے بہاتی ہوئی"

❖

"اگر یہاں سے بہت دور ہے "ریاضِ عجم"،
مرے ندیم! چل اُس سرزمیں کی جانب چل!

❖

"اسی کی سمت رواں ہیں، سفینہ راں ہیں ہم!
وہیں پہنچ کے ملے گی مگر نجات ہمیں
"زماں" اور "مکاں" کے حدودِ سنگیں سے!
نہ خیر و شر ہی، نہ یزدان و اہرمن ہیں وہاں،
کہ جا چکے ہیں وہ اس سرزمینِ رنگیں سے!"

❖

"مرے ندیم! چل اس سرزمیں کی جانب چل!"

❖

"اسی کی سمت رواں ہیں، سفینہ راں ہیں ہم!
وہاں عدم ہے نہ فکرِ وجود ہے گویا!
وہاں حیات مسلسل سرود ہے گویا!"

ن۔م۔ راشد

عذرِ گناہ

احمد بائی کی سرائے کے ایک کمرے میں مَیں ساکت وصامت بیٹھا سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا یا گردوپیش کو دیکھ رہا تھا میں اپنی اُس وقت کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہوں۔ بادوباراں کی طوفانی رات اور دسمبر کا جاڑا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ زمہریر سے برف میں لگی ہوئی ہوائیں آ آکر خون کو منجمد اور جسم کو بے حس کر رہی ہیں۔ کمرے کے کواڑ بند تھے لیکن بارش اور ہوا کے شور سے معلوم ہوتا تھا کہ عناصر شدت سے ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریباں ہو رہے ہیں۔ میرے سامنے ایک انسان موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا غلیظ سے بستر میں دبکا پڑا تھا۔ آتشدان میں کوئلے بجھ کر راکھ ہو چکے تھے لیکن کبھی کبھی کوئی چنگاری دفعتہً چمک کر فضا کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کرتی اور فنا ہو جاتی تھی۔ لیمپ کی ناکافی اور دھندلی روشنی ماحول کو زیادہ افسردہ اور غمناک بنا رہی تھی۔ کمرہ ہر قسم کے سامانِ تزئین وآرائش سے معرا برق وباد کے شور اور چراغ کی کپکپاتی ہوئی روشنی میں معمول سے زیادہ بھیانک نظر آرہا تھا۔ اس فضا میں میرے لئے کسی خوشگوار موضوع پر خیال آرائی ناممکن نہیں تو محال ضرور تھی۔ ڈاکٹر ابھی ابھی اٹھ کر گیا تھا اور مجھے موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا انسان کی تیمارداری کے متعلق اس کی چند اہم ہدایات پر عمل کرنا تھا۔ یہ مصیبت زدہ انسان جس کی طرف میں دو مرتبہ اشارہ کر چکا ہوں میرا بچپن کا رفیق اور کالج کا ہم سبق دوست اسلم تھا۔ ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہوئے کم وبیش چار سال گذر چکے تھے اور اتنی طویل مفارقت کے بعد کارکنانِ قضا وقدر نے آج پھر اُسے میری راہ میں لا ڈالا لیکن کس قدر تبدیل شدہ ہیئت میں۔ وہ بانکا سجیلا جوان، وہ صحت وتنومندی کا نمونہ، وہ حسن وجمال کا مجسمہ اور وہ عیش وتنعم میں پلا ہوا خوش باش انسان، آج افلاس، غربت اور مرض کے جانکاہ حملوں سے گھن کی طرح پس چکا تھا۔ میں سہ پہر کو جامع مسجد کے قریب گھوم رہا تھا کہ وہیں اُس کا جاں نثار ملازم جلال مل گیا جس نے مجھے بتایا کہ آقا دہلی ہی میں ہیں۔ دہلی میں اسلم کی غیر متوقع موجودگی کی خبر سے میرے اعصاب میں مسرت وابتہاج کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن گذشتہ چند سال سے میں اُس کی اعتدال سے حد درجہ متجاوز، بے انتہا تعیش میں ڈوبی ہوئی غیر ذمہ دارانہ طرزِ بودوماند کے متعلق جو حکایات سن رہا تھا اُن کے پیش نظر مجھے اس سے ملتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ جلال نے اپنی مدت العمر کی عقیدت ونیازمندی کے آنسو، تشکر وامتنان سے لبریز آنسو جن میں حسرت ویاس جھلک رہی تھی، آنکھوں میں جمع کر کے مجھے بتایا کہ آقا ایک عرصہ سے پھیپھڑوں کے ورم اور درد گردہ کے عوارض میں مبتلا ہیں اور آج کل احمد بائی کی سرائے میں بغرض علاج مقیم ہیں

"سرائے میں مقیم ہیں"! اب مجھے محسوس ہوا کہ ذلت ونکبت کی وہ گہرائی، افلاس وغربت کا وہ عمق اور موت وہلاکت کی وہ تباہی جس کی طرف اسلم بسرعتِ تمام بھاگا جا رہا تھا اس کے سر پر آپہنچی ہے۔ ہم ہر چیز سے بچ سکتے ہیں لیکن اُس نتیجہ سے کوئی مفر نہیں جو

اسباب کی کڑیوں سے مل کر پیدا ہوتا ہے۔ اسلم کی گذشتہ زندگی کو پیہم بے اعتدالیوں کے مرقعے اور مسلسل گمراہیوں سے لبریز زندگی کو جس میں وہ انجام و نتائج سے بے نیاز ہو کر تعیش کے راستہ پر سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑ رہا تھا، اسی مقام پر منتج ہونا چاہیئے تھا۔

کالج کے زمانہ میں اسلم نے سیدھی سادی معاشرت، کفایت شعارانہ طرزِ حیات اور ضابطۂ اخلاق کی پابندیوں سے محصور زندگی کو چھوڑ کر تعیش و اسراف کی راہ کیونکر اختیار کی، یہ ایک طویل داستان ہے جس کی تفصیل سے میں گریز کروں گا۔ جب وہ کالج میں داخل ہوا تو اُس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ اُس کی ماں نے جو ایک نہایت معزز و متدین خاندان سے تعلق رکھتی تھی اُس کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ وہ خود بھی مذہب و اخلاق کا حامی، شعائرِ اسلامی کا پابند اور ایک نہایت طباع و ذہین جوانِ صالح تھا۔ روپے پیسے کی طرف سے وہ حد درجہ فارغ البال اور خوش قسمت تھا۔ شہر کے اندرونی و بیرونی حصے میں متعدد عالیشان مکانات اور خوبصورت بنگلے اس کی ملکیت تھے۔ زرِ نقد بھی کافی اس کے نام سے بنک میں جمع تھا اس لئے جہاں تک زندگی کے عیش و عشرت سے تعلق ہے اسلم اُن معدودے چند نفوس میں سے تھا جن کے لئے فطرت نے اپنے دہن بستہ خزانوں کے منہ کھول دینے میں دریغ نہیں کیا۔ ایف۔ اے تک وہ بالکل کولھو کے بیل کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ گھر سے کالج اور کالج سے گھر۔ اس کے روزمرہ دستور العمل میں صرف دو ہی چیزیں شامل تھیں۔ کتب درسی کا مطالعہ اور اپنی ماں کی خدمت میرے ساتھ اُس کے تعلقات نہایت خوشگوار چلے آ رہے تھے اور جوں جوں وقت گذر رہا تھا اُن میں مزید استحکام پیدا ہوتا جا رہا تھا جب وہ بی۔ اے میں پہنچا تو یکایک اُس کی غیر معمولی ذہانت اور طبیعت کے جوش و خروش نے بھاپ کی طرح اُس کے دل و دماغ کو کھولنا شروع کیا۔ اس کی ذہانت اپنے اظہار کے لئے وسیع تر میدان تلاش کرنا چاہتی تھی۔ اُس کی طبیعت کی جولانی روزمرّہ کے بے روح و بے ذوق دستور العمل کی قیود کو توڑ پھوڑ کر کسی پہنائے عظیم کی وسعتوں میں گم ہو جانے کی آرزومند تھی۔ مطالعہ سے زیادہ اب وہ مشاہدہ کی طرف راغب تھا۔ اپنے قلب و دماغ کی خلش کی تسکین کے لئے وہ بلاواسطہ دنیا کا تماشا کرنے کا خواہش مند تھا۔ کتابوں کے رنگدار شیشوں کے اندر سے وہ دنیا کو دیکھ دیکھ کر تنگ آ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اِس جہانِ رنگ و بو کو دوسروں کی آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ نیکی بدی اور خیر و شر کے خود ساختہ ضابطوں اور اضافی معیاروں سے بلند ہو کر اپنی ذہانت و انفرادیت کی روشنی میں گناہ و ثواب کو پرکھے۔ وہ بڑے بڑے مصنفوں سے تجربات کی بھیک مانگنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ عظیم الشان تجربات کو اُن کی پوری قیمت دے کر خرید ے۔ وہ کتابوں سے اخذ کئے ہوئے خیالات کو اپنے لئے عار سمجھنے لگا تھا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ایک بلند فطرت اور ہمہ گیر ذہانت کا مالک انسان ہے۔ اُس کی فطرت کی بلندی اور ذہانت کی ہمہ گیری کا تقاضا تھا کہ وہ زندگی کی پامال راہوں سے کنارہ کش ہو کر اپنے لئے جدید راہ بنائے۔ اس تفحص و تجسس کے ساتھ ساتھ اُس کا جذبۂ شعریت بھی بیدار ہو رہا تھا۔ وہ ایک طرف اپنے کربِ اضطراب کو دور کرنے کے لئے جدید تجربات کا جویا تھا اور دوسری طرف اپنی تپشِ ناتمام کی پذیرائی کے لئے حسن و موسیقی کا متلاشی۔ دن گذرتے گئے اور اس کے جنون میں اضافہ ہوتا گیا اس کے خیالات حد درجہ پریشان اور اس کا مدعا و مقصود

روز بروز مبہم ہوتا چلا گیا۔ اُس نے اپنی پریشانیٔ خیال کو الفاظ کے ذریعے سے ادا کرنا چاہا لیکن اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ اپنی قوتِ اظہار کھو بیٹھے ہیں اور زبان کے مروجہ قواعد اُس کے خیالات کا بوجھ اٹھانے سے معذور ہیں۔ اُس نے غایت دل شکنی کے ساتھ قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور پھر خیالات کی بھول بھلیاں میں گم ہو گیا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ یا تو وہ خود کوئی متاعِ گرانمایہ کھو بیٹھا ہے اور یا دُنیا کے اندر کسی چیز کی کمی ہو گئی ہے۔ وہ راتوں کو بے خواب اور دِنوں کو وقفِ اضطراب رہ رہ کر اپنی صحت خراب کر رہا تھا۔ بعض اوقات وہ کوشش کرتا کہ اپنے عجیب و غریب خیالات کا تجزیہ کر کے کسی خاص نتیجہ پر پہنچے لیکن جب وہ اپنے دِل و دماغ کا جائزہ لیتا تو اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے خیالات اس قدر پیچیدہ، دقیق اور ناقابلِ فہم ہیں کہ تحلیلِ نفسی کے تمام اصول اُن کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اُس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی علمی بے مایگی کے باوجود وہ نفسیات میں ایک جدید باب کا اضافہ کرے گا۔ وہ بتائے گا کہ نفس اور حواس کا تعلق منقطع کر کے ہم حواس کی قائم بالذات ہستی کو برقرار رکھ سکتے ہیں اور نفس کو متاثر کئے بغیر بھی حواس کی خواہشات کو سیراب کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ آہستہ آہستہ اُس کی رُوح پر حاوی ہوتا گیا اور اُسے ایک روز یقین ہو گیا کہ نفس اور حواس ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو کر بھی اپنی ارتقائی جدوجہد جاری رکھ سکتے ہیں۔ اُس کے دل و دماغ کی یہ کیفیت تھی جب قدرت نے ستم ظریف و بے بصر قدرت نے، اُس کی راہ میں ایک ایسا انسان لا ڈالا جو حواس کی خواہشات کی تکمیل ہی کو تکمیلِ حیات سمجھتا تھا۔ پروفیسر شہباز، حافظ و خیام کا دلدادہ، آسکر وائلڈ، بائرن اور فرینک ہیرس کی قسم کے انسانوں کا مداح، اُسی کالج میں ملازم تھا جس میں اسلم پڑھتا تھا۔ شہباز ایک ذہین، خوبصورت جامہ زیب اور قابلِ رشک طلاقتِ لسانی کا مالک شخص تھا۔ کالج میں ادبیات کی تعلیم و تدریس کے فرائض اُس کے سپرد تھے۔ تاہل سے متنفر وہ اب تک تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ معقول تنخواہ پانے اور ذمہ داریوں کے بارِ گراں سے آزاد ہونے کی وجہ سے اُس کے اخراجات میں اسراف کا پہلو غالب تھا۔ جب اسلم پہلے پہل اس شخص سے ملا تو اولیں ملاقات ہی میں اُس نے اُس کی آنکھوں کے عمق، زبان کی روانی، لباس کی تراش خراش اور خیالات کی قدرت میں اپنے قلبی انتشار کا بہت کچھ مداوا پالیا۔ ملاقات پر ملاقات ہونے لگی۔ اسلم شہباز اور شہباز اسلم کے ہاں بازدید کے لئے جانے لگا اور چند ہی ہفتوں میں دونو کے باہمی تعلقات اس قدر گہرے ہو گئے کہ گویا برسوں کے دوست ہیں۔

شہباز کی دوستی سے اسلم میں انقلابِ عظیم آ گیا۔ اُس کی زندگی کی جزئیات و تفصیلات تک میں شہباز دراتا ہوا گھس گیا اُس کا لباس، اُس کا اندازِ خیال، اُس کا طرزِ کلام، اُس کا اندازِ نشست و برخاست، اُس کے رہنے سہنے کے اطوار غرض کہ اُس کی زندگی کا کوئی پہلو نہ تھا جو شہباز کے اعمال و خیالات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ وہ لباس میں زیادہ محتاط لیکن زیادہ جدت پسند ہو گیا۔ اس سے قبل وہ صرف انگریزی لباس پہننا پسند کرتا تھا لیکن اب وہ ہر روز کالج میں نئی قسم کے ملبوس میں آراستہ دیکھا جاتا تھا۔ آج سوٹ پہنا ہے تو کل حیدرآبادی طرز کا اچکن اور چُست پاجامہ زیب تن کر رکھا ہے۔ ایک روز فراک کوٹ کے ساتھ افغانی طرز کی شلوار پہنی ہے تو دوسرے روز بنگالیوں کی طرح لانبی قمیص اور دھوتی پہن کر پھر رہا ہے۔ اُس کی تنوع پسندی و

بوقلمونی نے اُسے لوگوں کی توجہات کا مرکز بنا دیا تھا اور عام طلبہ زیادہ اشتیاق سے اُس کی حرکات کا مطالعہ کرنے لگے تھے۔ مجھ سے وہ روز بروز بعید ہوتا جارہا تھا۔ کچھ عرصہ گذر گیا اور لوگوں میں چپکے چپکے اُس کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اُس کی والدہ شاکی تھیں کہ وہ راتوں کو اکثر گھر سے باہر رہتا ہے۔ وہ خود بھی طالب علمانہ ذمہ داریوں کو زیادہ وقعت دینے کا عادی نہ رہا تھا اور زندگی کی اہمیتوں کا ذکر اس ہلکے پن سے کرتا تھا کہ جیسے اُس کی نگاہ میں اُن کی کوئی قدر وقیمت ہی نہیں۔ کالج میں آتا تو اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرتا۔ کتابوں کی طرف متوجہ ہونا تو اُس نے ترک کر دیا تھا۔ یہ تو خیر گذری کہ اُس کا سابقہ مطالعہ کافی تھا جس نے اس کی غیر معمولی ذہانت کے ساتھ مل کر اس کا بھرم قائم رکھا ورنہ جس بے دلی سے وہ کالج آتا اور جس بے رُخی سے وہ درس وتدریس کی طرف متوجہ ہوتا تھا وہ یقیناً اس قابل تھی کہ اُسے کالج سے جواب دے دیا جاتا۔ سہ ماہی امتحان میں وہ ناکام رہا اور لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ وہ ہونہار و ذہین طالب علم جس نے ایف "اے میں قابلیت کی دھاک بٹھا دی تھی اب بلندی سے پستی کی طرف بڑی سُرعت سے گذر رہا ہے۔ میں اُس کی تمام حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا ایک روز میں نے اُس سے پوچھا کہ آخر تم نے یہ کیا وتیرہ اختیار کر رکھا ہے؟

اُس نے حیرت سے جواب دیا "کون سا وتیرہ"؟

میں نے کہا "تمہیں پتا ہی نہیں؟ کیا تم نہیں جانتے کہ تم اپنے تمام اوصافِ حسنہ آہستہ آہستہ ضائع کر رہے ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری وارفتہ مزاجی کی وجہ سے لوگ تم پر اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں اور تمہاری آوارگی واوباشی تمہیں تباہی کے اُس بحرِ مواج کی طرف لئے جارہی ہے جس کے ایک ریلے سے تم پاش پاش ہوجاؤ گے؟ کالج کا ہر شخص اس عجیب وغریب تغیر کو جو تمہارے اندر رونما ہُوا ہے حیرت و اذیت سے دیکھ رہا ہے اور تمہارے تمام خیر خواہ، جنہوں نے تم سے بہترین توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر خون کے گھونٹ پی رہے ہیں۔ تم اپنی والدہ کی طرف دیکھو جس کی غور و پرداخت کے احسانات کی زنجیروں سے تمہارا رُواں رُواں بندھا ہُوا ہے۔ تمہارے موجودہ رویّے نے اُس محترم خاتون کے دل میں ناسور ڈال دئے ہیں اور وہ محض محبتِ مادری کی وجہ سے خاموش ہے ورنہ اُس کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے"۔

اُس نے ذرا کبیدہ خاطر ہو کر جواب دیا "تم کس چیز کو میری آوارگی واوباشی سے تعبیر کرتے ہو اور مجھے بتاؤ کہ میرے اندر کون سا عجیب وغریب تغیر رونما ہُوا ہے جس کو دیکھ دیکھ کر میرے خیر خواہ خون کے گھونٹ پی رہے ہیں"؟

میں نے کہا
سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

تم راتوں کو کہاں ہوتے ہو؟ طالب علم ہونے کے باوجود تم مطالعہ اور کالج کے دیگر علمی مشاغل کی طرف سے کیوں بے پروا ہوگئے ہو؟ تم لباس کے جتنے نمونے چاہو استعمال کرو لیکن خواہ مخواہ اپنے آپ کو اضحوکہ بنانے سے کیا حاصل؟ لوگوں

نے تمہیں اکثر ایسے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں جاتے دیکھا ہے جہاں صرف شراب خوروں اور کوکین کھانے والے اوباش مزاج لوگوں ہی کا دخل ہے۔ تم متعدد بار اُس بازار میں چکر لگاتے بھی دیکھے گئے، ہو جہاں کوئی شریف آدمی جا کر اپنی عزت و شرافت کو مجروح کرنا گوارا نہ کرے گا۔ تمہیں معلوم ہے تم ان چند ماہ میں اتنا روپیہ خرچ کر چکے ہو کہ وہ تمہاری آئندہ سہ سالہ تعلیم کے لئے کافی تھا۔ اگر تمہارے یہی اللّے تللّے رہے تو یہ جائداد چند سال کی مہمان ہے۔ میں دیکھتا ہوں جب سے تم نے پروفیسر شہباز سے ربط و ضبط بڑھایا ہے تمہاری حالت کچھ سے کچھ ہوتی جا رہی ہے۔ میں شہباز صاحب کی عزت کرتا ہوں کہ وہ ہمارے استاد ہیں لیکن تمہیں معلوم ہے اُن کی پرائیویٹ زندگی ہمیشہ محلِ اعتراض رہی ہے اور ایک دنیا اُن کو نام دھرتی ہے۔ پھر ایسے شخص سے میل ملاقات بڑھانے سے فائدہ؟ میں جانتا ہوں شہباز صاحب بڑے لسّان اور جادو بیان ہیں اور انہیں یہ ملکہ حاصل ہے کہ اپنی طلاقتِ لسانی سے گناہ کو ثواب اور ثواب کو گناہ بنا دیں۔ لیکن ہم ابھی طالب علم ہیں۔ ہمارے دماغ غیر پختہ اور دل خام ہیں۔ ہمیں چون و چرا میں پڑنے کے بجائے آرام سے اپنے درسی مشاغل میں منہمک رہنا چاہئے۔

وہ بولا "تم کیسی عجیب باتیں کرتے ہو۔ اگر کوئی اور شخص مجھے اس طرح مخاطب کرتا تو شاید میں درگذر بھی کر دیتا لیکن تم سا واقف کار اور ذہین آدمی یوں گفتگو کرے، میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تم بھی آخر عام دنیا داروں کی طرح تنگ نظر و متعصب انسان ہی نکلے۔ یہ کس قدر حماقت ہے کہ تم انسان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کو نیک اور دوسرے کو بد کا خطاب دیتے ہو یاد رکھو نہ کوئی انسان نیک ہے اور نہ کوئی بد۔ نیک و بد انسانوں کی اس طرح تقسیم کر دینا کہ گویا دونوں طبقے علحدہ علحدہ جہانوں کے رہنے والے ہیں حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ ہر انسان نیک بھی ہے اور بد بھی ہے۔ بد تر سے بد تر انسان کے اندر بھی نیکی کی چمک موجود ہوتی ہے اور نیک سے نیک شخص بھی اپنے قلب و دماغ میں کہیں نہ کہیں بدی کے جراثیم رکھتا ہے۔

میں چلّا اٹھا "آہ! یہ سب تم نے شہباز سے سیکھا ہے"۔

"تم شہباز کو کیوں بدنام کرتے ہو۔ وہ حقیقتہً نیک آدمی ہے۔ اُس کی نیکی ہر تعریف سے بالاتر ہے۔ علم سب سے بڑی نیکی ہے اور علم صرف تجربات کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اُس نے مجھے ایسا علم سکھایا ہے جو کتابوں کی نقلی روایات پر نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہے، ایسے حقائق جنہیں میں دیکھ سکتا ہوں، سُن سکتا ہوں، چکھ سکتا ہوں، مس کر سکتا ہوں، غرض کہ اُس نے میرے حواس کو اوہام کی زنجیروں سے آزاد کر کے میرے سامنے علم و عرفان کی دنیا کے دروازے کھول دئے ہیں۔ میں اب تک مانگے تانگے، مستعار زندگی بسر کرتا چلا آ رہا تھا۔ میرے خیالات میرے خیالات نہ تھے۔ میرے حسیّات میرے حسیّات نہ تھے۔ میں دوسروں کی آواز کی بازگشت تھا۔ میں ایک ایکٹر تھا، میں اُس طوطے کی طرح تھا جو مالک کے رٹائے ہوئے سبق کو دُہرانے کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ شہباز نے مجھے چراغ کی روشنی سے نکال کر آفتابِ عالم تاب کے نورِ جہاں سوز کے سامنے لا کھڑا کیا۔ شہباز نے مجھے شبابِ جاوداں کا راز بتایا۔ اب میں ہمیشہ جوان رہوں گا۔ میں پیری اور کہولت کی لعنتوں کا شکار ہونے سے بچ جاؤں گا۔ تمہیں معلوم ہے جوانی کا راز کیا ہے؟ جوانی نام ہے اُمید، بیقراری، اضطراب، کشمکش اور کربِ پیہم کا اور بڑھاپا نام ہے سکون، یاس،

انجماد، برودت اور سکوت کامل کا۔

اسی بے قراریِ متصل سے غم وفا کو دوام ہے
جسے موت کہتے ہیں اہلِ دل وہ سکون قلب کا نام ہے

ہمیشہ نئے احساسات کی تلاش میں رہو اور تم جوانی کا راز پالو گے۔ تم اپنے احساسات پر کہولت طاری نہ ہونے دو اور تم بڑھاپے کا شکار ہونے سے بچ جاؤ گے۔ کسی چیز کو زندہ رکھنے کا راز یہی ہے کہ اُس میں جدتیں پیدا کی جائیں۔ اگر تمہارے احساسات ایک ہی محور کے گرد چکر لگا رہے ہیں اور تم ان میں تنوع پیدا کرنے سے معذور ہو تو سمجھ لو کہ تم پر ذہنی و دماغی و روحانی موت وارد ہو چکی ہے۔ پیری دل و دماغ کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے جس میں اشتہا کی بجائے سیری اور حرکت کی بجائے سکون کا عنصر حاوی ہوتا ہے۔ اگر تم کسی نفسیاتی طریق سے سیری کو پھر اشتہا اور سکون کو پھر حرکت میں تبدیل کر دو تو گویا تم شباب رفتہ کو نئے سرے سے حاصل کر لو گے۔ شباب رفتہ کے حصول کے لئے ہزاروں ادویہ اور سینکڑوں کیمیاوی طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مہم کی فتح کا سہرا اطبا نہیں بلکہ ماہرین نفسیات کے سر پر ہوگا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب ہم ہر مادّی انقلاب کے لئے نفسیات سے استمداد کریں گے۔ احساسات کی تلاش میں تمہیں نیکی اور بدی کی خود ساختہ و مروّجہ قیود سے آزاد ہونا پڑے گا۔ وہ شخص جو اپنے قلب و دماغ کو نشۂ شباب سے ہمیشہ مخمور رکھنا چاہتا ہے ہرگز ایک منزل پر قیام نہیں کر سکتا ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

منزل کی دوری قدموں میں سرعت اور دل میں ولولے قائم رکھنے کی کفیل ہے۔ منزل پر پہنچ کر نہ قدموں میں تیزی رہتی ہے اور نہ دل میں جوشِ عمل۔ اسی انحطاطِ تموج و فقدانِ جوش سے حواس پر غنودگی طاری ہوتی ہے جسے بڑھاپا، پیری، موت مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہمیں خود اپنی منزلِ مقصود کا پتا نہیں۔ انسان ازلی و ابدی حیات کا مالک ہے وہ لاتناہی زندگیوں میں سے گذر گذر کر تکمیلِ نفس و عرفانِ روح کے مراحل طے کر رہا ہے۔ تکمیلِ نفس کی غرض سے ہمارے لئے ہر واقعہ اور ہر تجربہ یکساں اہمیت رکھتا ہے۔ جو شخص روح کا عرفان اور نفس کی تکمیل چاہتا ہے اُس کے لئے رنج و مسرت ایک ہی چیز کا نام ہے۔ وہ بیماری اور صحت کے ایک ہی معنی لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کا ہر واقعہ خواہ وہ معمورۂ زہد و تورع ہے یا لبریز معصیت و مصیبت ایک ہی منزل کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ اُس کی نگاہ میں نیکی بدی، گناہ ثواب، افلاس و تموّل وغیرہ کی تمیز اُٹھ جاتی ہے۔ یہ سب مختلف راہیں ہیں جن سے گذر گذر کر اُسے وہ چیز حاصل کرنا ہے جس کے لئے انسانیت بے تاب ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم میں سے ہر شخص ایک ہی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ وہ منزل تکمیلِ نفس ہے۔ جو لوگ اس راز سے واقف ہیں وہ کامیابی و ناکامی پر یکساں مسرور ہیں، اُن کی نگاہ میں عیب عیب ہے نہ نیکی نیکی۔ وہ ہر تجربہ کو مقصودِ حیات پالینے

کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور وہ لوگ جن کا شعور و ادراک ابھی پختہ نہیں ہُوا جنہیں تخلیق انسانی کی غرض وغایت سے آگہی حاصل نہیں اور جو اضافی معیاروں اور ہنگامی نقطۂ ہائے نگاہ کی قید میں پھنسے ہوئے ہیں کامیابی کے وقت پھولے نہیں سماتے اور ناکامی پر چیخیں مارتے ہیں۔ تم نے اکثر ایسے بیمار و منحنی اشخاص کو دیکھا ہوگا جو بہترین مقوی غذائیں کھانے کے باوجود مریض و ناتواں چلے جاتے ہیں اور ایسے افراد بھی تمہاری نظر سے گذرے ہوں گے جنہیں دو وقت کی روٹی بآسانی میسر نہیں لیکن اس کے باوجود وہ نہایت تندرست صحت ور اور مضبوط جسم کے مالک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیمار انسانوں کے اندر خاص قسم کی سمیّت ہوتی ہے جو صاف ستھری اور صحت بخش غذاؤں کو بھی جزو بدن بننے نہیں دیتی اور تندرست جسم کے اندر ایسا حیات افزا مادہ موجود ہوتا ہے جو نانِ جویں تک کے تمام اجزا کو بھی صحت و قوت میں تبدیل کر کے خونِ صالح اور گوشت پوست پیدا کرنے کا باعث ہو جاتا ہے۔ یہی اصول جو طبعیات کی دنیا میں رائج ہے نفسیات پر بھی حاوی ہے۔ ایک تندرست نفس گناہ اور نیکی دونوں کے تجربات سے کر انہیں اپنی طاقت، قوت اور غذا میں تبدیل کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن ایک ایسا نفس جو بیمار و کمزور اور مضمحل و پریشاں ہے جوش و مسرت کے تجربات کو بھی غم و اندوہ اور کمزوری و ناتوانی میں تبدیل کر لیتا اور اپنی بچی کھچی توانائی تک ضائع کر بیٹھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اندر ایک مضبوط، تندرست اور توانا نفس ہے اور میں دنیا کے بدتر سے بدتر تجربہ کو بھی اپنے نفس کی تکمیل اور روح کے عرفان کا باعث بنا سکتا ہوں۔ اس لئے میرے سامنے اعمال و افعال کی وہ تقسیم جسے تم گناہ و ثواب یا نیکی بدی سے تعبیر کرتے ہو بالکل مہمل اور بے معنی ہے"۔

میں نے کہا" اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تم ہر گناہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے جاؤ گے اور ترغیب و تحریص یا آزمائش کا مقابلہ کرنا چھوڑ دو گے"۔

"عزیز دوست، آزمائش سے مغلوب ہونا ہی آزمائش پر غالب آنا ہے۔ تم میری بات سے گھبرا کیوں اُٹھے، میں ابھی اس کی توضیح کئے دیتا ہوں۔ لاکھوں انسان ذہنی طور پر گناہ کرتے ہیں۔ اُن کے دل میں ہر وقت اقدامِ گناہ کی خواہش رہتی ہے لیکن جرأتِ عمل نہ ہونے کی وجہ سے وہ ارتکابِ گناہ نہیں کر سکتے۔ ان کے اندر فاسد خیالات بغیر کسی روک ٹوک کے جمع ہوتے رہتے ہیں لیکن اُس مواد کے باہر نکلنے کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ چنانچہ اُن کے دل و دماغ ہمیشہ کے لئے مسموم ہو کر رہ جاتے ہیں اور ترغیب اُن کے لئے ہمیشہ ترغیب، آزمائش ہمیشہ آزمائش اور تحریص ہمیشہ تحریص بنی رہتی ہے۔ گناہ کا خیال کرتے رہنے سے گناہ کا ارتکاب کر لینا بہتر ہے تاکہ زہریلا مادہ جلد از جلد دل و دماغ سے نکل جائے۔ جس طرح تمام عظیم الشان کام پہلے پہل دماغ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اسی طرح عظیم الشان گناہ بھی دماغ ہی میں جنم لیتے ہیں۔ ارتکابِ گناہ سے سمّ آلود خیالات کا مواد دل و دماغ سے نکل جاتا ہے اور گناہ میں کوئی خاص جاذبیت باقی نہیں رہتی۔ ایک چیز اسی وقت تک دلچسپ ہے جب تک ہماری دسترس سے باہر ہے گناہ کر لینے کے بعد گناہ ہمارے لئے اپنی رنگینی و دلچسپی کھو بیٹھتا ہے اور جب اُس کی جاذبیت ہی فنا ہو گئی تو بتاؤ آزمائش کہاں رہی"۔

میں نے کہا "اسلم میں جانتا ہوں جو کچھ تم زبان سے کہہ رہے ہو دل سے نہیں مانتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تم ادب و شعر و نفسیات کے دریا بہا رہے ہو"۔

"معاف کرنا میں ادیب نہیں ہوں"۔

"تم کیا ہو؟"

"میں ادیب ہوں لیکن اس سے بڑھ کر کچھ اور ہوں"۔

"تم شاعر ہو؟"

"میں شاعر ہوں لیکن اس سے سوا کچھ اور بھی ہوں"

"آخر تم کیا ہو؟"

"میں زندگی کا نقاد یعنی حیاتِ انسانی کا مبتصر ہوں"۔

وہ تمرد و سرکشی کی موجوں پر سوار گناہ کی نت نئی تاویلیں کر کر کے اپنے نفس کو فریب دیتا ہوا روز بروز آگے نکلتا گیا۔ اگر آوارگی محض دولت کی فراوانی ہی سے پیدا ہو تو سیم و زر کی کمی کے ساتھ آوارگی کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اگر بے راہ روی جوانی کے طوفان کا نتیجہ ہو تو اس چند روزہ سیلاب کے اترتے ہی حواس بھی راہِ راست پر آجاتے ہیں لیکن وہ گناہ آلود غرقِ عصیان زندگی جس کے جواز میں نفسیات کا ایک انبار پیش کیا جا سکے، جس کی پشتیبان غیر معمولی ذہانت ہو اور جس کو حق بجانب قرار دینے میں منطقی دلائل سے کام لیا جائے ایک ایسی خطرناک، ناقابلِ علاج مزمن بیماری ہے جس سے شفا محال ہے۔ اُس مریض کے تندرست ہو جانے کا تو امکان ہے جو مرض کو مرض سمجھ کر علاج کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لیکن اُس بدقسمت، فریب خوردۂ جہالت اور غلط کار بیمار کا کیا علاج جو اپنی بیماری کو بیماری سمجھنے ہی سے انکار کر دے۔ ہم گناہ و ثواب کی تمیز اُٹھا دینے میں اپنے دماغ کی انتہائی قوتوں سے بھی کام کیوں نہ لیں، ہم گناہ کو صرف اک تجربہ، اک جدت اور تکمیلِ نفس کی ارتقائی جدوجہد میں اک ضروری مرحلہ کے طور پر ہی کیوں نہ اختیار کریں لیکن گناہ آخر جادۂ مستقیم سے انحراف ہے۔ اُس کے مرتکب کو زندگی کی سیدھی صاف و روشن راہ سے ہٹ کر حصولِ مقصد کے لئے تاریک، ٹیڑھی اور گھناؤنی راہوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ قوانینِ ملکی یا نوامیسِ فطرت کی خلاف ورزی کے نتائج اس قدر ظاہر و باہر اور صاف و بدیہہ ہوتے ہیں کہ اُن سے اغماض محال ہے۔

گناہ کے نتائج، اگرچہ وہ اس قدر بین و روشن نہیں ہوتے، اس پُراسرار طریقہ سے نمودار ہوتے ہیں کہ خود گناہ کرنے والا محسوس نہیں کرتا کہ اُس کے قلب و دماغ و رُوح میں کوئی پُراسرار، تنفر انگیز، غیر پاکیزہ کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ ایک معمولی سوئی ہمارے ہاتھ میں چبھ جاتی ہے اور ایک لمحہ کے نہایت خفیف سے درد کے بعد ہمیں یاد بھی نہیں رہتا کہ کوئی تکلیف ہوئی

بھی تھی یا نہیں لیکن اُس سوئی کی نوک پر ایک ہلکا سا قطرہ زہر بھی تھا جو ہمارے جسم میں سرایت کر گیا اور اب وہ قطرہ آہستہ آہستہ خون کو مسموم جسم کو متعفن اور اعضا کو متورم کر رہا ہے۔ یہ اندازِ خیال کہ ارتکابِ گناہ سے زہریلا مادہ دل و دماغ سے خارج ہو جاتا ہے بظاہر کس قدر پسندیدہ اور قابلِ اعتبار کیوں نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ گناہ اُسی وقت تک خوفناک، نفرت انگیز اور بھیانک نظر آتا ہے۔ جب تک ہم اُس کا ارتکاب نہیں کرتے۔ تم ایک مرتبہ گناہ سے لذت اندوز ہو جاؤ، پھر دیکھو کہ اُس کی طغیانیاں تمہیں بہا کر لے جاتی ہیں یا نہیں۔ تم ایک دفعہ اپنے دل و دماغ کو شیطان کے قبضہ میں دے دو، پھر دیکھو کہ تم شیطنت و خباثت کا مسلک اختیار کرتے ہو یا نہیں۔ اسلم نے چاہا یا کم از کم اپنے آپ کو اور ساتھ ہی دنیا کو فریب دینے کے لئے چاہا کہ وہ نفس کو متاثر کئے بغیر حواس کی خواہشات کی پذیرائی کرے گا لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ حواس کی دنیا میں خفی سے خفی تحریک اور نامعلوم سے نامعلوم حرکت بھی ایسی نہیں جس کا ردِ عمل نفس کی دنیا میں موجود نہ ہو۔ عالمِ خارجی میں کوئی واقعہ ایسا ظہور پذیر نہیں ہوتا جس کے بالمقابل نفس کا کوئی نہ کوئی تار کھنچ کر رہ جاتا ہو۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنے عجیب و غریب فلسفہ کی تائید میں حواس کو تو شغلوں کے سپرد کر دیتا اور نفس اُس کی سیاہ کاریوں اور آتش افشانیوں کے اثرات سے مبرّا و منزّہ رہتا۔ وہ روز بروز اُس دلدل میں جس کے عمق کو آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا دھنستا چلا گیا۔ انسانی بداعمالیوں کو روکنے کی دو ہی تدبیریں ہو سکتی ہیں، خدا کا خوف، اور بندوں کا ڈر۔ لیکن جو شخص مذہب کی گرفت سے آزاد اور سوسائٹی کی تحسین و مذمت سے بے پرواہ ہو چکا ہو اُس کے اعمال پر کوئی اور پابندی عائد کرنا محال ہے۔ اسلم کچھ عرصہ تو یقیناً پروفیسر شہباز کی رہنمائی کا محتاج رہا تھا لیکن جب نشہ قوی ہو جائے تو ساقی کی محتاجی بھی ختم ہو جاتی ہے اور مے خوار خود ہی قدح و سبو بھر بھر کر خالی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب وہ خود سر آزاد ہو کر بلا خوف و خطر جی کھول کر دادِ عشرت دے رہا تھا۔ شراب نوشی کی کثرت سے اُس کا چہرہ ہر وقت سُرخ رہنے لگ گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں جو اُس کے چہرہ کے تمام دیگر اعضاء سے زیادہ خوبصورت تھیں اب باہر کی طرف اُبلی پڑتی تھیں۔ اس نے شہر والا مکان ترک کر کے شہر سے باہر ایک خوبصورت بنگلے میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ دولت کے بے تحاشا خرچ نے اُسے شہر کے تماشبینوں کی صفِ اول میں لا کھڑا کیا تھا اور اب گویا اسلم کا لفظ معہودِ ذہنی تھا تعیش اسراف بدکاری اور بے حیائی کا اِس زمانہ میں سب سے حیرت انگیز اور پُرلطف واقعہ یہ ہے کہ وہ اب تک کالج آتا اور طلبہ میں بیٹھ کر اپنے آپ کو طالب علم سمجھتا تھا۔ دُنیا کی حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ رہی۔ جب وہ بایں حالت بی اے کے امتحان میں شریک ہُوا اور پھر کامیاب بھی ہو گیا۔

بی۔ اے کے بعد اُس نے طالب علمی کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دی اور اس طرح اُس کے اعمال و افعال پر جو تھوڑی سی پابندی تھی وہ بھی غائب ہو گئی۔ وہ کچھ مدت کے لئے لاہور سے باہر چلا گیا اور ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگاتا رہا۔ واپس آیا تو اُس کی ماں نے اپنے گھر بس بہو لانے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ تمہاری شادی کا بندوبست کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن اسلم جن کوچوں کی سیر کر رہا تھا اور جس قماش کی زندگی بسر کرنے کا عادی ہو چکا تھا اُس کے پیشِ نظر اس تجویز کا قبول

کر لینا اُس کے لئے ناممکن تھا۔ اُس نے شادی سے انکار کر کے اپنی بوڑھی ماں کا ہمیشہ کے لئے دل توڑ دیا اور اُس بدقسمت خاتون کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ صبح سے شام تک اپنے اکلوتے لختِ جگر کی بربادی کا دلخراش منظر دیکھتی رہے۔ اُس کی ماں اس واقعہ کے بعد زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکی، اور دل میں ہزاروں حسرتیں اور غم کے لاکھوں نشان لے کر جہانِ فانی سے رخصت ہوگئی۔ میرے اور اسلم کے تعلقات بظاہر ختم ہو چکے تھے۔ مہینوں گذر جاتے اور ہم ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھتے تھے لیکن اس کی والدہ کے حادثۂ ارتحال سے متاثر ہو کر میں اُس کے پاس اظہارِ تعزیت کے لئے گیا۔ اس کے مکان کا ایک ایک چپہ ہولناک و سیاہ کاری کی عجیب و غریب داستانوں کا مرکز تھا۔ اُس کی دیواریں ایسے ایسے شرمناک رازوں کی حامل تھیں کہ اگر وہ بیک وقت دنیا پر منکشف ہو جاتے تو شاید سوسائٹی اپنے روایتی تجاہل، اپنی غفلت اور درماندگی کے باوجود اس شخص کو سنگسار کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اسلم اور اس کے حواریوں نے چُن چُن کر شہر کی شریف زادیوں کو خراب کیا تھا۔ کوئی قابلِ ذکر گھرانا نہ تھا جس کو اسلم نے داغدار نہ کیا ہو۔ دولت ہمیشہ اُس کے عیبوں کی پردہ پوشی کرتی رہی اور وہ ہر شخص کا جس سے اُسے معمولی سے معمولی خطرہ کا بھی امکان ہوتا، منہ بھر کر لوگوں کی زبانوں پر طلائی قفل چڑھا دیتا تھا۔ میرا مدعا محض اُس کی والدہ کی رحلت پر اظہارِ افسوس کرنا تھا لیکن باتوں باتوں میں کئی قصے چھڑ گئے۔ اسلم کو شکایت تھی کہ میں نے اُس سے مُلاقات ترک کر دی ہے۔ میں نے اُس کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ میرے تمہارے راستے مُدت سے الگ ہو چکے ہیں۔ تمہاری پرواز آسمانوں پر ہے اور مجھ سا بے بال و پر انسان بھلا کیونکر تمہارا ساتھ دے سکتا ہے"

جو شخص فکرِ معاش سے پاک اور مستقبل کے اندیشوں سے آزاد ہو وہ تمہاری طرح خود فراموشی کی زندگی بسر نہ کرے تو کیا کرے تم مجھے مطعون کرتے ہو کہ میں نے میل ملاقات ترک کر دی ہے۔ حالانکہ اگر تم واقعات پر دیانت داری سے غور کرو تو اس بات سے انکار کی گنجائش ہی نہیں کہ جو کچھ ہوا اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے ع خدا کا شکر ہے پہلے محبت آپ نے کم کی۔

تمہارے لیل و نہار جس رنگ میں گذر رہے ہیں اس میں بحالاتِ موجودہ میرا شرکت کرنا ناممکن ہے۔ میں دولت کو ڈوبتا دیکھ کر اگر دستِ اعانت دراز نہیں کر سکتا تو اس کی غرقابی کا نظارہ دیکھنے سے بھی معذور رہوں۔ تم آج دولت اور شباب کے نشہ میں مخمور ہو اور نہیں جانتے کہ آسمان جب اپنا ترکش خالی کرنے کو آتا ہے تو ایک تیر بھی باقی نہیں رکھتا۔ تم اپنی والدہ کے انتقال سے کچھ عبرت اور سبق حاصل کرو۔ اُس کی موت کی سب سے قوی وجہ تمہاری موجودہ طرزِ زندگی ہے۔ یاد رکھو ہر انسان کا یہی حشر ہونے والا ہے موت مقدراتِ انسانی میں داخل ہے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے کیونکر باور کر لیا ہے کہ تم اس سے مستثنےٰ قرار دئے جاؤ گے"؟

وہ بولا" میں کب کہتا ہوں کہ میں موت جیسے اٹل، غیر متبدل اور یقینی قانون سے مستثنےٰ قرار دیا جاؤں گا؟ یقیناً میرا بھی یہی حشر ہو گا جو عام انسانوں کا ہوتا ہے لیکن میں حیاتِ بعد الموت کے چند پہلوؤں کے متعلق تم سے مختلف خیالات رکھتا ہوں موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی بلکہ زندگی تو ایک غیر منقطع و غیر مختتم تسلسل ہے۔ ہم موت کے دروازے سے داخل ہو کر زندگی کے ایک بے پایاں اور وسیع تر میدان میں داخل ہو جاتے ہیں ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

میرا عقیدہ ہے کہ وہاں کی کشمکش موجودہ کشمکش سے زیادہ تیز و تند اور وہاں کا ہنگامۂ رستخیز موجودہ ہنگاموں سے زیادہ قوی و مضبوط ہوگا۔ چونکہ ہماری موجودہ و آئندہ زندگی میں ایک تسلسل و رابطہ ہے اس لئے ہمارے موجودہ احساسات و ادراکات ہمارے محسوسات و اعتقادات وہاں بھی ہمارا ساتھ دیں گے۔ ہمارا جسم خاک میں مل جائے تو مل جائے لیکن ہماری روحیت و معنویت کہ انسان دراصل اسی چیز سے تعبیر ہے، فنا نہیں ہوگی اور موت کے بعد اپنی تکمیل کے لئے جدوجہد کی نئی نئی منازل طے کرتی رہے گی وہاں غالباً جسم کی قید نہ ہوگی۔ اس لئے شروع سے اخیر تک روحانی تصرفات ہی کارفرما ہوں گے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ جس طرح یہاں ہمیں تکمیلِ نفس کے لئے اہرمن و یزداں کی جنگ میں شامل ہونا پڑتا ہے اسی طرح وہاں بھی گناہ اپنی تمام دلفریبیوں اور جاذبیتوں کے ساتھ دامِ تزویر پھیلائے بیٹھا ہوگا۔ جس طرح یہاں نیکی اور بدی آپس میں دست و گریباں ہو رہی ہیں اس طرح وہاں بھی ان کی جنگ و جدال جاری ہوگی۔ مذہب و اخلاق کہتے ہیں کہ گناہ انسان کو نیکی کے راستہ سے بھٹکاتا ہے۔ اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو یقیناً حیاتِ اخروی میں بھی گناہ ورغلانے کو موجود ہوگا کیونکہ ؎

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے ؛ وہی فطرتِ اسد اللہی، وہی مرحبی و ہی عنتری

ہم گناہ صرف لاعلمی کی وجہ سے کرتے ہیں۔ علم کی مشعل ہماری شاہراہ حیات کو روشن کر کے راستہ کے تمام نشیب و فراز واضح کر دیتی ہے اور ہم کنوئیں میں گرنے یا کانٹوں سے پاؤں لہولہان کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ علم سب سے بڑی نیکی ہے اور صحیح علم صرف تجربات کی آگ میں کودنے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہ یہیں گناہوں سے فارغ ہو جائیں تاکہ حیات بعدالموت میں جب ہم دوبارہ کشمکشِ زندگی میں مصروف ہوں اور گناہ سے سابقہ پڑے تو وہ ہمارے لئے اپنی تمام دلکشی، تمام دلفریبی اور تمام جاذبیت کھو چکا ہو اور ہم نہایت آسانی سے اُس کی طرف سے دامن جھٹک کر اپنے آپ کو ہمہ تن نیکی کی تکمیل میں مصروف کر دیں"؟

اسلم اپنی تقریر ختم کر چکا تو میں خدا حافظ کہہ کر وہاں سے اُٹھ آیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ایک خطرناک، گھناؤنے اور دقیق روحانی مرض میں مبتلا ہے جس میں کوئی دوا کارگر نہ ہوگی۔ پھر میں دوبارہ اُس سے نہ ملا تا آنکہ قدرت نے پُرپیچ حالات کے اندر مجھے اس سے دہلی میں احمد بائی کی سرائے میں یکجا کر دیا، درانحالیکہ وہ مختلف جسمانی عوارض میں مبتلا، افلاس و غربت کے جانکاہ مصائب میں گرفتار زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا۔

عاشق بٹالوی

انتظار

ہے فضا دلکش، ہوائیں نرم، نغمے خوشگوار
اک تجلی ہے زمانے کی جبیں پر آشکار

یہ گلوں کی عطر بیزی یہ لہکتے سبزہ زار
یہ سکوتِ شام اور یہ گنگناتے آبشار

کر رہی ہے رقص نبضِ خس میں رُوحِ نوبہار
سینۂ صحرا میں ہے بے چین خونِ لالہ زار

آہ لیکن میں ابھی تک ہوں رہینِ اضطراب
مجھ کو یہ دنیا کی بیداری ہے اک مبہم سا خواب

خاکِ گلشن ہے فروغِ گل فشانی کے لئے
میں تڑپتا ہوں گھڑی بھر شادمانی کے لئے!

تا کجا محرومیاں، کب تک یہ رنجِ انتظار!
جلد آجاؤ خدارا جانے والی ہے بہار!!

محمد جمیل خاں راز

غزل

مجھ کو خبر نہیں ہے فراز و نشیب کی
کیا بات ہے تری نگۂ دلفریب کی

تیری نگاہِ شوخ سے اللہ کی پناہ
جاں پر بنی ہوئی ہے دلِ ناشکیب کی

اُٹھنا پڑے گا انجمنِ ناز سے مجھے
حالت یہی ہے گر نگۂ ناشکیب کی

اہلِ نظر کو بے خبرِ دو جہاں کیا
اُس نے قبائے ناز بدن پر جو زیب کی

اُن کو ادا و ناز سے فرصت نہ ہو سکی
پوچھی گئی نہ بات دلِ ناشکیب کی

دنیا طلسم خانۂ عیش و نشاط ہے
اُلفت میں مجھ کو سرورِ عالم فریب کی

"سروری"

غرناطہ کے تین منظر

جب مٹ چکا
جب مٹا نہ تھا
مٹتا ہُوا

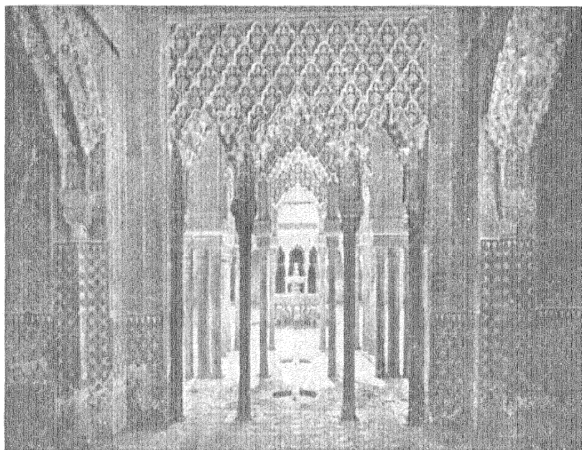
(۱)

جب مٹ چکا

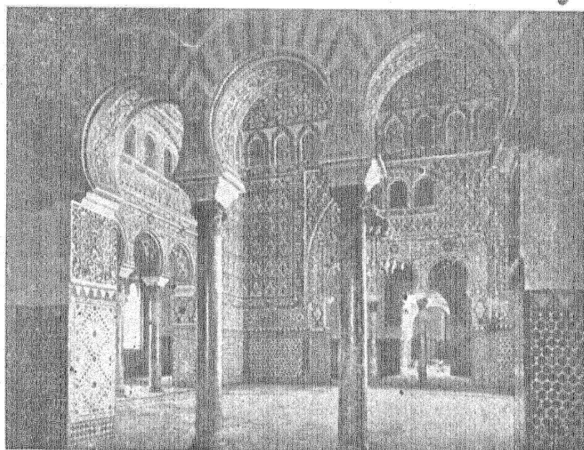
الحمرا ایک خواب، ایک افسانہ، اور ایک آنسو۔

اندلوسیہ کی وادیوں میں چھوٹا سا فردوس۔ دور دور تک نیلی پہاڑیاں بادلوں کی طرح افق پر گھری ہوئی ہیں گہرے اودے آسمان کے سامنے سیرنوادہ کی سپید برف آلود چوٹیاں اس وادی کو خاموشی سے تک رہی ہیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی پیلی پیلی روشنی اس کے سپید برف پر پڑ کر ایک طلسم پیدا کر رہی ہے۔ اندلس کی زرخیز اور سبز وادی پر کسی گذرتے ہوئے بادل کے ٹکڑوں کی وجہ سے دھوپ اور چھاؤں کے دھبے پڑ رہے ہیں۔ محل کے پائیں دریائے دارو بل کھا رہا ہے۔ ایک موہوم سا شور دریا میں گونج رہا ہے۔ آبشاروں کی بہیم موسیقیت، چڑیوں کے چہچہے، شہر کی سڑکوں پر گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ، فروشندوں کی پکار، بچوں کی آوازیں۔ پاس کے ویرانے میں کبوتروں کی غٹرغوں۔ سب مل کر ایک دبا ہُوا غل وادی سے اُٹھتا ہے۔ سیرنوادہ کی چوٹیاں ساکت، بے حس ہیں۔ شاید آسمان سے کوئی لامتناہی کہانی کہہ رہی ہیں، وہ افسانے جو اُس کی آنکھوں نے دیکھے اور دیکھ رہی ہیں اس کا دل اب سرد پڑ چکا۔

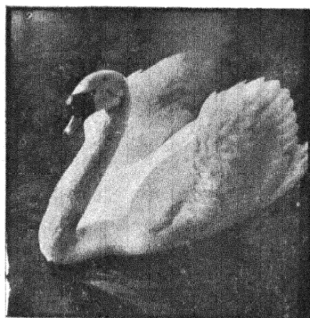
آفتاب کا سرخ چکر افق کی نیلی پہاڑی کے پیچھے چھپ رہا ہے اور میدان میں بڑے بڑے سایے پھیلنے لگے ہیں۔ اُس کی کرنیں وداعی بوسے لیتی ہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب غروب ہوتے ہوتے دولمحوں کے لئے ٹھہر جاتا ہے گویا یہ پیارا منظر چھوڑنے کو اُس کا جی نہیں چاہتا۔ اس پُرامن وادی پر ایک آخری نظر ڈال کر سورج غروب ہوگیا۔ گھروں کی چمنیوں سے دھواں بل کھا کر ہوا میں گم ہوجاتا ہے۔ گرجا کے گھنٹے بجنے شروع ہوجاتے ہیں مگر رک رک کر کسی نے آج غرناطہ کو ابدی وداع کہہ دی ہے رات کو بڑھتی ہوئی تاریکی میں ٹھہر ٹھہر کر اس ہولناک موت کے گھنٹے کی صدا قوموں کی موت وحیات کی کہانی یاد دلاتی ہے۔



غرناطہ کے الحمرا کا ایک دالان

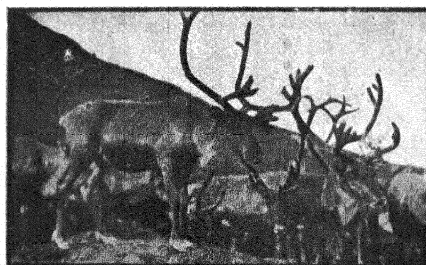


اشبیلیہ کے القصر کا بیت السفرا









حسن فطرت

شہر میں جگمگ جگمگ روشنیاں لگ گئیں۔ مسرت سے متوالے باشندوں کا ایک پُرامن شہر غرناطہ !ــــ آغوش میں صدیوں کی تاریخ۔ قوموں کے عروج و زوال کے افسانے کس خاموشی سے لئے سو رہا ہے۔ سسکتی تہذیبوں کا آخری لہو ابھی اس کے دامن سے دُھلا نہیں۔ سنتے ہیں کہ سرِمغرب یہاں کبھی عظمت خالق کی صدائیں اُٹھتی تھیں۔ شاید۔ مگر اب وہ صدائیں اُن ہی وادیوں سے سر کو ٹکر ٹکرا کر خاموش ہو گئیں۔ وہ جن کے سر مزار بھی میٹ دئے گئے اور فاتحہ کو ہڈیاں بھی نہ رہیں تو تاریخ کو کون باور کرے کہ کبھی یہاں کوئی تھا بھی؟

موت کے گھنٹے کی آواز الحمرا کی ٹوٹی دیواروں سے ٹکراتی ہے اور پھر ہر طرف سکوت چھا جاتا ہے۔ ایک بوڑھا نگہبان بس ایک۔ محل کے دروازے کے سامنے پتوں کی آگ سلگاتا ہے کیونکہ آج سردی ہے۔ ہوا سے شعلے بھڑکتے ہیں اس کا سایہ دروازے پر ہلنے لگتا ہے۔ ایک چڑیا شب کے وقت ابھی کو ـــ کو ـــ کر رہی ہے۔

ایک اندھا شخص آہستہ سے آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک شکستہ سارنگ ہے جس سے اُس نے دن کو ان شکستہ در و دیوار کے زائرین کے دل میں رحم پیدا کر کے ایک دو پیسے مانگ لئے تھے۔

"بوناس نوچے" کے سلام آداب کے بعد وہ بھی آگ کے قریب کھسکتا ہے۔

"کہو فرنانڈو کیسی گزر رہی ہے؟"

اندھے کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار نظر آتے ہیں۔

"بہت خوب" کسی نے آج اس کو یکدم دو پیسے دے دئے تھے جس کے باعث وہ اپنی خوشی کو آج چھپا نہیں سکتا تھا اور بڑے جوش سے کہنے لگا "موروس موروس (مراقشیوں) نے یہ پلاثیو آرابے (محل عربی) بنا کر عجیب کام کیا!"

بوڑھا دربان قہقہہ لگاتا ہے "مگر تمہاری آنکھوں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ پھر اُن وحشی موروس کی حمایت تم کو کیسے سوجھی"؟

نہیں سینور ایوں نہ بولو۔ اُن کے صدقے آج اس اندھے کا پیٹ تو بھر جاتا ہے"۔

بوڑھے دربان کے چہرے سے مُسکراہٹ چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر سکوت کے بعد بولا

اندھا۔ "تم نے وہ موت کا گھنٹہ سنا؟"

بوڑھا۔ "ہن ایزابل نے آج صبح بقا کا سفر کیا"۔

اندھا۔ "سنا اس نے عمر بھر غرناطہ کے باہر قدم نہیں رکھا"

بوڑھا۔ "اس انار کی وادی میں ساری دنیا کا حسن موجود ہے کوئی باہر کیوں جائے؟ فرنانڈو! کیا تم کو غرناطہ سے محبت ہے؟ اندھے کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس گفتگو کا اثر لے رہا ہے۔ اس کے تھرتھراتے ہاتھوں نے سارنگ سنبھالا اور دردناک آواز سے "الوداع غرناطہ" کا پُراثر راگ گرانا دیتاس" چھیڑا۔

"ادیوس گرنادا۔ گرنادا مِیا"
نو تے بولویرے آویر ماس ین لاودا
ای میدا پیناین ویویر لیخوس دے تو ویرا
یل سیتیو دوندے ریپوسان لوس لِسنیولس
دوبلا کومپانا۔ کومپانا دوبلا
کے تو تیرستے سونیدو میدا لاگلوریا
کے اوراس ماس ترستیس ای ین لاخینتا لے ہو
ای لالیاوے دے سُوس لابوس تو دوین لاویدا لو تیران
دوبلا کومپانا۔ کومپانا دوبلا۔

ترجمہ ۔ الوداع غرناطہ! غرناطہ میرے!
اب عمر بھر پھر تجھے نہ دیکھوں گا
سرِ شام جب میں بستر پر لیٹا ہوں
تو تیرا دامن چھوڑتے ہوئے میرے دل میں درد اُٹھتا ہے
تیرا دامن جس میں ساری اُمنگیں سو رہی ہیں
موت کا گجر بج رہا ہے
اور اُس کی غمناک صدا سے اِس دل میں درد کی ٹیس اُٹھتی ہے
اس سے دردناک اور کون سی گھڑی ہوگی؟
کفن میں جب کہ میری زندگی کی ساری کُنجیاں
تیرے لبوں پر بند ہو جائیں گی
موت کا گجر گونجتا ہے۔ الوداع غرناطہ۔ غرناطہ میرے!

درد بھرے راگ کے آخری الفاظ قرناندو کے لبوں پر اُدھورے رہ گئے۔ اس کی آنکھیں تر ہو چکی تھیں۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولا "میرے خیال میں اُس کی کنجیاں دیتے ہوئے موروس کو ضرور رنج ہُوا ہوگا۔"

بوڑھے دربان نے دیکھا کہ موروس کے اس عجیب و غریب تنگر گذار بندے کے جذبات کو چھیڑنا مناسب نہیں۔ آگ سرد ہو رہی تھی۔ اُس نے اُس کے پتے برابر کئے۔

اندھے کی بے نور آنکھیں آگ کو گھورنے لگتی ہیں۔

(۲)

جب مٹا نہ تھا

غرناطہ! خوش نصیب شہر! جس نے تیری مسجدوں میں نمازیں پڑھیں

پھولوں کی سیج پر سو رہا ہے! جس نے تیرے محلوں میں بسیرا کیا

جس نے تیری کامنی صورت نہیں دیکھی بس اسی نے فردوسِ عدن کے طلسم کو دیکھا

اس نے نہ نور کو دیکھا نہ مسرت کو (یوسف تو ربلیا)

وہی اُبلتے چشمے کھیل رہے ہیں۔ ملکہ زہرہ ابھی غسل کر کے باہر نکلی ہے۔ گیلے گیلے بال شانوں پر ابھی بے پروائی سے پڑے ہیں۔ بادشاہ کو دیکھ کر تمکنت سے مُسکراتی ہے گویا اپنی فتح کا اس کو پورا احساس ہے۔ اس کا صبح کے تارے کا سا حسن دیکھ کر سلطان حسن فریفتہ نہ ہوتا تو شاید دنیا کو حیرت رہ جاتی۔ اس کافرہ نے مسلمان ہو کر تختِ دل پر سے پہلی ملکہ کی جگہ چھین لی تھی۔ انگڑائی لیتے ہوئے ابن حسن کے ہاتھوں پر گر جاتی ہے اور اس کے اطراف حبشی لونڈیاں پنکھے جھلنے لگتی ہیں۔ اس کی چشمِ نیم وا کے اشارے کی ہر ایک منتظر ہے۔ اس اشارے کا مطلب شاید اس سے زیادہ نہ ہو کہ نظارۂ حسن کے لئے ایک آئینہ لا دے یا کسی ڈھلکتے ہوئے آنچل کو درست کر دے مگر ان ہی آنکھوں نے تو سلطنتوں کی کہانیاں بدل دیں۔

ابھی دن باقی ہے مگر غُسل خانے میں شمعدان لگے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بنانے والے کے دِل میں حسد کی آگ بھری تھی کہ کوئی اپنے محبوب کی جھلک دیکھ نہ لے۔ اسی واسطے اس جگہ آفتاب کی کرنوں سے بھی پردہ تھا۔ محل کی کمانیں کسی عربی دلہن کی طرح سجی ہوئی ملکہ کا بوسہ لینے جھک رہی ہیں۔ لذّت کا حسن سے ازلی تعلق ظاہر کرنے کے لئے معمار نے شہد کی پولیوں کا تاج بنا رکھا ہے۔ کسی غار کے فطری خزانوں کی طرح مگس کے سینکڑوں گھر ایک جھلک میں چمک اُٹھتے ہیں۔ سبز نیلے سُرخ اور سُنہری سب رنگ ایک جا ہو کر قوسِ قزح کا اثر پیدا کرتے ہیں۔

چشمِ نیم وا کے اشارے پر ایک لونڈی ساز چھیڑتی ہے اور رقص شروع ہوتا ہے۔ محل کے پتلے پتلے نازک ستون اُن کی صراحی دار کمانیں جن کے کناروں پر کسی حسینہ کی چوٹی کی طرح سیاہ موباف کا کام ہوا ہے، لاانتہا قسم کے نقش و نگار کی مرصّع کاری سب مل کر خوابِ عشرت میں مدد دیتے ہیں۔

سلطان حسن اس فضائے عشرت سے مسرور زہرہ کے حسن کا نظّارہ کر رہا ہے۔ زہرہ اس پر جھک کر آہستہ سے کان میں کچھ کہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عشق کے لطیف الفاظ نہیں تھے کیونکہ بادشاہ کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے اور محفل کو چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

زہرہ کے لبوں پر ابھی مُسکراہٹ باقی ہے اور مطربہ کو ایک نئی تان چھیڑنے کا حکم دیتی ہے۔

رات ہوگئی تھی اور صاف اودے آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ غرناطہ کی وادی دودھ میں نہائی ہوئی تھی۔ جنت العارف کے گلستان میں پھولوں کی بھینی بھینی مہک اُٹھتی تھی۔ چشموں کے دونوں جانب فوارے اُبل رہے تھے اور اوپر مل کر پھر اس طرح نیچے گرتے تھے کہ گویا دونوں طرف سے کسی پر پھول برسا رہے ہوں۔ ایک گول فوارہ دالان کے بیچ میں اس طرح بڑھ آیا تھا کہ گویا رہنے والوں کو کشتی میں کوئی تحفہ پیش کر رہا ہو۔ الحمرا کی پہاڑیوں میں تہ بہ تہ زینوں پر باغ یوں بنا تھا کہ اس کی ساری نیرنگیاں ایک ہی نظر میں سما جائیں۔ کہیں سرو کے درخت اندازِ معشوقانہ سے کھڑے تھے کہیں زینوں کی دیواروں پر گھنی بیلیں چڑھی تھیں۔ کہیں بے خار گلاب مہک رہے تھے۔

ایسے گلستاں کو دیکھ کر آدم اپنی کھوئی ہوئی فردوس بریں کو کیوں روئے؟ ایک حور اس چاندنی کی سیر کرتی ہوئی خراماں خراماں چلی آرہی تھی۔ وہی پہلی ملکہ عائشہ جس کی بے مثال سیرت اور صورت نے حسن سے کبھی الحور کا خطاب حاصل کیا تھا۔

زینہ کی دیوار پر شفاف پانی کی نالیاں بہہ کر ایک نیا اثر پیدا کر رہی تھیں اور ہر طرف فواروں کی آواز اور بہتے پانی کا نرم شور وادی میں ابدی موسیقیت پیدا کرتا تھا۔ پتوں میں سرسراہٹ سُن کر ملکہ رُکی اور دبی آواز میں بولی "کون؟ سراج؟"

"سرکار"

بن سراج آگے بڑھا اور ملکہ کے دامن کو بوسہ دے کر آنکھیں نیچے کئے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اوپر بانس کے درخت ہوا سے ہل کر آواز کر رہے تھے۔ ان کے سایہ سے چھن چھن کر چاندنی دونوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔

"ادھر دیکھو"

سراج کی آنکھیں اُٹھیں۔ حور کی آنکھوں سے مل کر پھر زمین میں گڑ گئیں۔ اُس نے اس خموشی میں کچھ کہہ دیا تھا جس کو ملکہ ہی سمجھ سکی۔

لیکن ابن سراج کی رگوں میں وفاداری کا خون دوڑ رہا تھا۔ وہی خون جو عرب کے صحراؤں میں جانی دشمن کا نمک بھولے سے بھی کھانے کے بعد پھر اس پر ہاتھ اُٹھانے کا روادار نہیں ہوتا تھا۔

"حضور کا جو حکم ہو یہ نمک خوار حاضر ہے"۔

محل عربی سے محفل سرود کی آوازیں خاموش فضا میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ عائشہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا

"سراج! تمہاری وقعت میرے دل میں جو ہے میرا خدا ہی جانتا ہے اب میری مدد کرو"۔

"غلام کو آقاؤں کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار پائیے گا"۔

"اچھا سنو۔ زہرہ کا اثر تم خوب جانتے ہو۔ گو مجھے اس کی پروا نہیں کہ حسن کہیں جہنم میں جائے مگر اب میرے بیٹے عبداللہ کی جان کے لالے پڑے ہیں"۔

بظاہر عائشہ کے جذبات متلاطم تھے اُس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ سرو کے درخت کے نیچے چوکی پڑی ہوئی تھی سنبھلنے کے لئے اس کا سہارا ٹٹولا۔ سراج نے اپنا ہاتھ مدد کو بڑھایا اور کہا "حضور گھبرائیے نہیں انشاءاللہ"۔

ابھی سراج ملکہ کو سنبھال رہا تھا کہ سامنے کی جھاڑی میں سے کھانسی کی آواز آئی۔ فوراً دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کی طرف اُٹھیں۔ چہروں کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اس آواز کو دونوں خوب پہچانتے تھے اور اس پُر اسرار کھانسی کا نتیجہ انہیں معلوم تھا۔

چاندنی کی مدھم روشنی میں محل کی طرف کوئی سفید پوش جاتا ہوا دکھائی دیا۔

دوسرے دن دربار میں سلطان حسن نہایت بشاش نظر آرہے تھے اور تمام امرا پر اعزاز و اکرام کی بوچھاڑ ہو رہی تھی ابن سراج سے نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور مزاج پُرسی کی "ہمارے دربار کے سراج! کہو۔ کیوں پژمردہ معلوم ہوتے ہو؟ خفگی تو نہیں؟"۔

ابن سراج:۔ حضور! شمع کی کیا مجال کہ آفتاب کی ضیا سے مکدر ہو؟"

بادشاہ:۔ مگر تم تو ماہتاب ہو۔ ماہ کی ضیا میں بھی بہت کچھ نظر آسکتا ہے"

اس شاعری پر ابن سراج کا ماتھا ٹھنکا۔ درباریوں میں اس تمثیل کے تخیل پر تعریف شروع ہوئی مگر اس کے معنی دربار میں دو ہی شخص سمجھے۔ پُراسرار کھانسی کا اسرار کھل رہا تھا۔ سراج نے بادشاہ کی طرف نظر اٹھائی۔ وہاں لبوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ تھی۔ کاش اس کے بس میں ہوتا کہ اصل واقعات سمجھا سکتا۔ پاکدامن حور کی نسبت بادشاہ کی یہ مسکراہٹ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اور جانے کی اجازت لینا چاہتا تھا کہ بادشاہ نے روکا "نہیں ابن سراج آج تو تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ گے۔ انشاءاللہ!"

لفظ انشاءاللہ پر کچھ اس طرح زور دیا گیا تھا کہ گویا دونوں کے لئے اس لفظ کے کوئی خاص معنی تھے۔ ابن سراج کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا اسے معلوم تھا کہ یہ میٹھی دعوت کس لئے تھی . . . .

دُوسرے دن سراج کی پُراسرار گمشدگی سے غرناطہ میں کھلبلی مچ گئی۔ کل شب بادشاہ کے پاس اس کی دعوت تھی مگر وزیر کا بیان تھا کہ دعوت کے بعد وہ محل سے باہر نکلا تھا لیکن کسی دربان نے اُس کو نکلتے ہوئے یا جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

(۳)

مٹتا ہوا

تشریحی نوٹ:۔

بہت جلد ابن سراجوں میں ایک آگ مشتعل ہوگئی ۔ اپنے سردار کے خون کا بدلہ لینے کو اب انہوں نے علانیہ بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ ادھر شہزادہ بوعبداللہ انتظار کا متحمل نہ ہو کر تخت کے لئے بے چین ہو چلا تھا اور تمام باغی عناصر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔

دیکھتے دیکھتے آگ ہر کونے میں لگ گئی اور سلطان حسن کو اپنے بیٹے کی فوجوں سے جان بچا کر مالغ کی طرف بھاگ نکلنا پڑا ۔ غرناطہ کی سرحد چھوڑتے ہوئے اُس نے اپنے بیٹے کو اپنا پیام یوں بھیجا: "پیارے بیٹے! یہ آگ ہے جس کو میں چھوڑ رہا ہوں ۔ جو چھوئے گا جھلس جائے گا۔

زمانہ گذرتا جاتا ہے ۔ مجروح باپ کے کہے ہوئے الفاظ آگے آتے ہیں قسمت کا نوشتہ پورا ہوتا ہے اور وہ دن بھی آجاتا ہے جب کہ فردیناند اور ایزابل کی فوجیں غرناطہ پر چڑھائی کرتی ہیں . . . .

"اللہ اکبر" غرناطہ کے در و دیوار اس آواز سے گونجنے لگتے ہیں ۔ بے چین گھوڑے سرپٹ دوڑتے ہوئے اس کی فصیل کے باہر نکلے ۔ اُن کے جسم پر دھوپ چمک رہی تھی ۔ مراقشیوں کی قبائیں ہوا میں پرچم کی طرح لہرا رہی تھیں اور تلواریں جو مدت سے مخمل کے میانوں میں چھپی پڑی تھیں لرزنے لگیں ۔ ان کے چہرے بہادری کے خون سے سُرخ ہو رہے تھے ۔ مضطرب گھوڑوں میں سواروں سے زیادہ جوش معلوم ہو رہا تھا کہ موت سے کھیلنے آگے بڑھیں ۔ شہر کے دروازے کھول دئے گئے تھے ۔

"لوہے کی سنجوں کے عوض ہمارا خون اُن کی حفاظت کرے گا"

ابن موسیٰ کی وجہ سے فوج میں بہت جوش پھیل گیا تھا

"آج تمہارا امتحان ہے ! یا جیت کر گھر جانا یا ہار کر گور جانا !"

فردیناند کی فوجیں بھی آگے بڑھیں ۔ مراقشیوں کے پہلے جوشیلے حملے کی تاب نہ لا کر دو قدم پیچھے ہٹنا پڑا ۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابن موسیٰ کی ہستی کارزار میں ہر جگہ موجود ہے ۔ یہ جہاں پہنچتا وہاں زندگی کا ایک جھونکا آجاتا تھا ۔ گرمی تھکن اور زخموں سے چور مراقشی سپاہی میں اس کی آمد سے جان آجاتی تھی وہ بھی جو سسک کر کسی گھوڑے کے پاؤں کے نیچے جان دے رہا تھا اس کے گذرنے پر ایک نعرہ لگاتا تھا ۔

"بارک اللہ!"

گھنٹوں دونوں فوجیں اڑی رہیں ۔ غرناطہ کی دیواروں پر سے عورتیں بچے بوڑھے اپنے چہیتے شوہروں، بھائیوں، بیٹوں کی بہادری کا نظارہ کر رہے تھے ۔ خاک اور خون کا ایک طوفان بپا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ دونوں فوجیں اب مر کر ہٹیں گی ۔

یکایک مراقشیوں میں کھلبلی مچی اور گھوڑے بے سُدھ پلٹنے لگے ۔ ابن موسیٰ کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی کوئی وجہ اس کی

سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ایک بھاگتے ہوئے سپاہی کو روک کر اس نے پوچھا "کیوں؟ آخر ہوا کیا ہے؟" تیزی میں اُس کی صورت دیکھے بغیر سپاہی نے کہا "کیا تم کو معلوم نہیں کہ ابن موسیٰ قتل ہو گیا؟"

ابن موسیٰ پر بجلی گری اور اُس نے یوں محسوس کیا کہ دراصل کسی نے اس کی جان لے لی۔ اس نے ایک آخری جان توڑ کوشش کی اور چیخنے لگا "خدا کے واسطے پلٹو ابن موسیٰ تو ابھی زندہ ہے"۔ اُس کا گلا بیٹھا جارہا تھا اُس کی آواز میں ایک طعن تھا کہ مرجانا بہتر ہے اس سے کہ لوگ اس کے زندہ ہونے کو باور نہ کریں مگر اس کی للکار کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ بہادر مرافشی تھوڑی دیر کے لئے پلٹے مگر ان دو لمحوں میں کایا پلٹ چکی اور غنیم تیزی سے بڑھ گیا تھا اُس کی تلواروں کی جھنکار قریب آگئی۔ پاؤں ڈگمگائے اور فصیل کی پناہ کے سوا چارہ نہ تھا۔ . . . .

غرناطہ کے دروازے بند کر دئے گئے

محاصرہ ۔ غرناطہ کی دیواروں کے اندر انسانی آبادی کا چھوٹا سا جزیرہ عجب استقلال کے ساتھ اس مصیبت کو برداشت کرنے لگا۔ ایک امید لگی تھی۔ موہوم سی امید۔ کہ واقعات کا یا پلٹیں گے اور غنیم ہٹ جائے گا لیکن دن پر دن گذرتے گئے اور آہستہ آہستہ سرکاری گودام خالی ہونا شروع ہوئے اور آخری بے بنیاد امید بھی چھوڑ چلی۔ قحط پھیل گیا اور آفت و مصیبت ہر شخص کے بدحواس چہرے سے ٹپکنے لگی تھی اُن کے ہم مذہب افریقی مرافشیوں کو ان کی بربادی کی کیا فکر تھی۔ مدد کی التجائیں ابنائے الجزیرہ کی تہ میں گم ہوگئیں اور جواب میں عیسائی ڈیروں سے ایک طنز آمیز قہقہہ اُٹھتا تھا۔

بے بسی ۔ بے کسی ۔ موت

سسکتے بوڑھوں اور بلبلاتے بچوں کی آوازیں کب تک کوئی سُنے؟ آخر وہ دن آگیا جس کی تنبیہ اندلس کے درویش نے عبداللہ کی پیدائش پر کی تھی۔ دیوانِ سفراء میں آخری جرگہ منعقد ہوا وہ کمرہ جس کی بلند چھت غیروں کے دلوں پر عظمت بٹھانے کو بنائی گئی تھی۔ آج غیروں کے سامنے سر جھکانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ دالان کے چشمہ کے بازو بازو یکے بعد دیگرے سر جھکائے امراء اس جرگہ کے لئے چلے آرہے تھے۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ آکر فرش پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ نتیجہ ہر ایک کو معلوم تھا۔ ڈوبتے آفتاب کی روشنی مغربی کمانوں سے آکر دیوان کو منور کر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس تاریخی موقع پر آفتاب ان الفاظ کو غور سے دیکھنا یا دکھانا چاہتا تھا جو گوشہ گوشہ پر لکھے گئے تھے — الفاظ جو خوشنویسی کے دائرہ سے نکل کر مصوری کا کام کر رہے تھے مجنوں جیسے لیلیٰ کے نام کے حروف سے کھیلا کرتا تھا اسی طرح مُصور نے اپنے خالق کے نام پر وہ کاریگری کی تھی کہ آدم کی آفرینش کا احسان ادا ہو گیا۔ کہیں اُس کی عظمت کی کہانی تھی کہیں اُس کی عزت کی۔ کہیں اُس کی قدرت کی۔ ہر اینٹ سے اس کے معمار ابی حجاج کی رُوح پکار رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ذرہ ذرہ محوِ عبادت ہے مگر آج خدا نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ یا شاید انہوں نے خدا کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ طنزاً ہر گوشہ گوشہ سے وہی الفاظ گونج رہے تھے۔

لاغالب الا اللہ   لاغالب الا اللہ

آفتاب کی زرد روشنی کھلے دیوان میں اس حسرت ناک منظر پر پڑ رہی تھی۔ امرا جمع ہو چکے تھے۔ عبداللہ کے تخت کو سموئل نے بوسہ دیا۔ اب بادشاہِ جہاں پناہ اُٹھے اور کچھ کہنے کی کوشش کی۔ الفاظ غیر ضروری تھے۔ کہانی طشت از بام تھی۔ مرافش کی بے رخی سے عبداللہ کے دل پر چھری چل رہی تھی۔

"جب اپنے ہی اپنے نہ رہے تو غیروں کو ہم کیا منہ دکھائیں"۔ بدقت یہ الفاظ اُس کے منہ سے نکلے۔

اس پر دیوان کے بائیں کچھ ہلچل ہوئی۔ ایک بوڑھا عرب مسکراتے ہوئے آگے بڑھا "حضور گستاخی معاف" اس کے چہرے کی جھریاں دُنیا کی اونچ نیچ دیکھ چکی تھیں اور قسمت کی مار کی طرح اس کی آواز تیر کے مانند دلوں میں چبھ گئی "گستاخی معاف حضور! جب بیٹا ہی باپ کا نہ ہُوا تو اپنوں کا کیا ذکر؟"

بادشاہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کے الفاظ ادھورے رہ گئے۔ اپنے باپ سے برتاؤ کے سارے زخم اس جملہ نے تازہ کر دئے اور عبداللہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے "خدا تو مجھ سے بدلہ لے رہا ہے۔ کیا تم بھی لینا چاہتے ہو؟"

اندلوسیہ کا تاجدار آج اپنے درباریوں سے عفو کا ملتجی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے دیوان میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ کسی کی ہمت نہیں کہ منفعل بادشاہ کے جذبات کو اور چھیڑے۔ قدرت کا ابدی سبق ہر ایک کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ مگر وقت گذر چکا تھا۔ انفعالِ معصیت اب آنسوؤں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ کاسٹلی ڈیروں سے مسرت کے نعروں کی آواز نے انہیں حقائق یاد دلا دئیے۔ پچھلے افسانوں کا وقت نہ تھا۔ عملی مشورے شروع ہوئے کہ اب کیا کیا جائے۔ دیر تک بحث ہوتی رہی آخر نتیجہ وہی تھا کہ سب تھک چکے تھے۔ لوگوں کی دردناک آوازیں اور سنی نہیں جا سکتی تھیں۔ محاصرے کو طول دینے سے سوائے موت کے اور کوئی نتیجہ نہ تھا۔ لیکن ابن موسیٰ کی آواز مُصر تھی۔

"مگر تمہارے گھر اکھیڑ دئے جائیں گے۔ تمہارے معبد روندے جائیں گے اور پھر تم یہ سب دیکھو گے؟"

عبداللہ کے ہاتھ میں جو پرچہ تھا اُس نے موسیٰ کی طرف بڑھایا اور اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "مگر یہ دیکھو اُفرڈیننڈ اس کے بدلے میں ہر ایک کو امن و امان دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ پھر کیا مجھے روا ہے کہ اپنی بدنصیب ہستی کی خاطر اپنی رعایا پر ظلم ڈھاؤں"

"بدنصیب؟ سچ کہا بے شک بدنصیب" موسیٰ کو طیش آ رہا تھا۔ اُس نے پرچہ چھین کر پاؤں کے نیچے مسل دیا "یوں ہی تمہارے امن و امان کے وعدے بھی کچل دئیے جائیں گے۔ دیکھ لینا کہ ایک دن فلتحہ کو تمہارا سرِ مزار بھی نہ رہے گا۔ یہی دیواریں یہ منظر بھی دیکھیں گی"

"اب ہم میں لڑنے کی قوت کہاں ہے؟ اور لڑیں بھی تو کس امید پہ؟"

واقعات کی سرد منطق جوشیلے موسیٰ کی سمجھ میں کہاں آتی؟ اُس کی آنکھیں غصہ سے شیر کی طرح چمکنے لگیں وہ بولا "قوت نہیں، تو پھر مر جاؤ مگر غنیم کے قدموں پر نہ مرو۔ تاریخ تمہیں یوں یاد کرے کہ غرناطہ کے بچاؤ کے لئے آخری عرب بچہ کا خون بہہ چکا نہ یوں کہ تم نے اپنی جانوں کے مول میں ایمان بیچ دیا۔ کیا اب تمہاری رگوں سے ہسپانیہ کے فاتحوں کا خون جاتا رہا؟"

اس کے آخری الفاظ دیوان سفرا رمیٰ گونجنے لگے

"جاتا رہا"

موسیٰ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس کی جوشیلی تقریر سے سب کے دلوں پر رقت طاری تھی۔ اُسے اُمید تھی کہ اس کے جواب میں میانوں سے تلواریں نکل آئیں گی مگر بادشاہ سے لے کر دربان تک ہر ایک پتھر کی طرح ساکت تھا۔ ہر ایک کی آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور ہر ایک کا چہرہ بے حس تھا قسمت کی چٹان پر اس کا سر ٹکرانا بے سود تھا۔ اس نے ایک مرتبہ اور سب کو غور سے دیکھا ایک آہ کھینچی اور ابوعبداللہ کی آنکھ میں آنکھ ملا کر نہایت اطمینان سے کہا

"اچھا لو مُبارک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے چہرے پر وہ جلال برس رہا تھا کہ دونوں طرف سے لوگ بازو کو ہٹ گئے کسی کی مجال نہ تھی کہ اُسے روکے چشمہ پر ایک لمحہ کے لئے کھڑا ہوا سُرخ مچھلیاں اس کا سایہ دیکھ کر اندر کی طرف بھاگ گئیں۔ الحمراء کے پر عظمت دالانوں میں سوائے موسیٰ کی ہستی کے ساری دنیا ساکت معلوم ہو رہی تھی عنبر کی بو سے دربار مہک رہا تھا چشمہ کی لمبائی تیزی سے طے کرتے ہوئے موسیٰ باہر آیا اور اپنے عربی گھوڑے پر سوار ہو کر تنہا فصیل کے باہر نکل پڑا۔

دریائے دارو پر اس نے لگام تھامی اور پلٹ کر سرخ پہاڑیوں پر ایک نظر ڈالی۔ عربی محل کی آخری عظمت ڈوبتے آفتاب کے ساتھ فنا ہو رہی تھی۔ دور جنت العارف کے سرو ابھی معشوقانہ انداز سے کھڑے تھے۔ خدا کا موعودہ بہشت مل کر وہاں سے آج آدم کا اخراج ہو رہا تھا۔ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے دارو کا پانی شور کر رہا تھا۔ ہوا کا ایک جھونکا چلتا ہے اور الحمراء کے گلستاں سے ایک مہک اندلس کی سبزوادی سے ہوتی ہوئی آتی ہے۔ موسیٰ کے دلیر دل میں جو اب تک آنسوؤں پر ہنسا کرتا تھا ایک ٹیس اٹھتی ہے اور آنکھیں بھر آتی ہیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں اس نے ایک نعرہ لگایا "ولاغالب الا اللہ"

سیرنوادہ کی برف آلود سپید چوٹیاں ساکت سرد۔ بے حس کھڑی ہیں اور اُس کی صدا وادیوں میں گونجتی ہوئی آہستہ آہستہ فنا ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

- - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - -

وہ گھوڑا اور وہ سوار کیا ہوئے کسی کو خبر نہیں۔ فتح کے بعد البتہ ایک عیسائی سپاہی نے بیان کیا تھا کہ رنگین بادلوں کی مدھم روشنی میں مغربی افق پر اس نے کسی سوار کا خاکا دیکھا تھا۔

سوار کا سر سینہ پر جھکا ہوا تھا۔

سید محمد کرمانی
بی۔ اے۔ آئی سی ایس۔ آکسفورڈ

سرِ شام

شفق کا عکس گہرا ہو چلا ہے سطحِ دریا پر
دُھندلکا پھیلتا جاتا ہے جنگل کی فضاؤں میں
سکوتِ شام چھایا ہے اُداسی کا فسوں بن کر
ردائے شب کی مدھم سرسراہٹ ہے ہواؤں میں

بھرے ہیں نیند کے نغمے پرندوں کی نواؤں میں
لئے اُڑتے ہیں یہ نغمے تخیل کی فضاؤں میں

خمارِ شوق کے ہمراہ دل میں کچھ خلش بھی ہے
گدازِ روح میں ڈوبا ہوا ہے شام کا منظر
گھنے پیڑوں کا سایہ مائلِ مشرق ہے تیزی سے
سبک روشب کی دیوی بال کھولے آگئی سر پر

بھڑک اٹھی ہے شعلوں سے شفق کی آتشیں چادر
مہک اٹھے ہیں جنگلی پھول شبنم کی نمی پا کر

نشاط انگیز غم کے نشۂ شیریں سے بیخود ہوں
اسی عالم میں آکر زندگی مدہوش ہوتی ہے
تخیل پھونک دیتا ہے گدازِ روح کا افسوں
ہواؤں میں خمارِ آگیں مئے سرجوش ہوتی ہے

بہ لذت جب سکونِ غم سے ہم آغوش ہوتی ہے
دلوں میں حشر اُٹھتا ہے زباں خاموش ہوتی ہے

ذوقی

ارضی بہشت

جہاں ستلج کا پرجوش اور تیز رو پانی ہمالہ کی وادی کو عبور کرکے پنجاب کے میدانوں میں داخل ہوتا ہے، وہاں فلک بوس سلسلۂ کوہ اور دور رس نگاہوں سے بھی ختم نہ ہونے والے وسیع میدان صدیوں سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے حقِ رفاقت ادا کر رہے ہیں۔

جب دنیا عالمِ طفولیت میں تھی تو بےخوف اور آزاد ہرن ان میدانوں میں ہری ہری گھاس چرتے پھرتے تھے سنہری اور روپہری بادلوں کے سایہ میں رشی منیوں کی گائیں چرا کرتی تھیں۔ ان کے بچے اپنی چھوٹی چھوٹی گردنیں گھماتے اچھلتے اور شوخیاں کرتے پھرتے تھے۔ ایندھن کے لئے آتے ہوئے رشی منیوں کے لڑکے پانی سے لبریز تالابوں کی طرح بادلوں کو پہاڑوں پر گھومتے پھرتے دیکھتے تھے۔ ہر طرف ایک فردوسی سماں اور زندگی بخش آبِ حیات چھلکتا نظر آتا تھا۔

ان گنت برسوں پہلے دریائے ستلج کے کنارے دو خوش وخرم خاندان آباد تھے۔ ان کی سادہ جھونپڑیوں میں وید اور اپنشدوں کے معارف کتابی اور زبانی صورت میں نہیں مگر معنوی طور پر چاروں طرف جلوہ گر تھے۔ ایک خاندان کے پیشوا اور سردار کا نام گوتم تھا۔ ان کی بیوی کا نام سونندا اور بیٹی کا نام سوکیشی تھا۔ گوتم کے پاس سو گائیں تھیں۔ ایک روز میں بویا جانے والا چھوٹا سا زرخیز کھیت تھا۔ ایک روز کی مسافت کے مطابق گایوں کے چرنے کے لئے زمین تھی۔ بےشمار آبشارے تھے اور ستلج بارہوں مہینے زمین کو سیراب کیا کرتا تھا۔

دوسرا خاندان گوروشت پرنٹر کی ماتحتی میں تھا۔ اس خاندان کے چار رکن تھے۔ شت پرنٹر ان کی بیوی ولیشا تھا، ان کا بیٹا آرنیک اور شاگرد سومیرو۔ شت پرنٹر کے پاس ننانوے ۹۹ گائیں تھیں۔ چند آدمیوں کی ضرورت کے مطابق قابلِ زراعت عمدہ زمین تھی اور گایوں کے چرنے کے لئے کھلا ہوا میدان تھا۔ جنگل کے پھل پھول لانے کے لئے طاقت تھی۔ سیر و تفریح کے لئے پہاڑ اور میدان تھے۔ گانے کے لئے کھلی ہوئی فضا اور وسیع زمین تھی۔ پانی اور ہوا دھوپ سے جسم صحیح سلامت رہتا تھا اور سچائی اور محبت سے روح پاک وصاف رہتی تھی دونوں خاندان شاد و آباد تھے۔

دل قبضے میں ہو تو حسنِ فطرت زندگی کے راز کو عریاں کر دیتا ہے۔ سمندر کی موجوں کے سے بادلوں کی سیر کرتے ہوئے آرنیک سوکیشی اور سومیرو برابر میدانوں میں پھرا کرتے تھے۔ ستلج کی روانی سے لطف اندوز ہوتے اور گنجان جھاڑیوں اور گھنے درختوں کی ڈالیوں میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے نہ تھکتے تھے۔ اُن کی خوش آئند زندگی میں حرص و ہوا، بغض و عناد اور رشک و حسد کا گذر نہ تھا

کنول کے پھولوں سے ڈھکا ہوا سوکیشی کا بوٹا سا جسم۔ آزبیک اور سوبیرو کے دلوں میں صبح کی رنگا رنگ فضا کی طرح لطیف و رنگین جذبات پیدا کر رہا تھا۔

حسن چاہے بادلوں سے ڈھکے ہوئے ہمالہ کی چوٹیوں کا ہو۔ چاہے پتوں سے گھرے ہوئے چمپا کے پھولوں کا۔ یا گلاب کی کلی پر پڑے ہوئے قطرۂ آب کا۔ یا تو شگفتہ زعفرانی شباب کا۔ چاہے کسی اور چیز کا وہ ایک تخیل ہے۔ ایک تصور ہے۔ مادی چیز نہیں ہے اس لئے وہ دسترس سے پاک ہے۔ اسی خیال کے ماتحت وہ تینوں ستلج کے کنارے بسر کر رہے تھے۔

آس پاس جتنے گاؤں بستے تھے سب کی یہی کیفیت تھی۔ جس خاندان میں دھان زیادہ پیدا ہوتا وہ اسے دے کر اس کے عوض دوسرے خاندان سے جو لے آتا۔ پانی کے بدلے گائے کا دودھ مل جاتا اور دودھ کے بدلے مکھن جس خاندان میں پانی کے برتن زیادہ ہوتے وہ انہیں دے کر دودھ کے برتن لے آتا۔ بچے کھیلتے کھیلتے جہاں تھک جاتے وہیں کھانا کھا لیتے جوان۔ جہاں چاندنی کھلی ہوتی وہیں بیٹھ جاتے اور بڑے بات چیت کرتے رہتے۔ وہاں خوشی کے آنسو گرتے، سدا بہار پھولوں پر بھونرے گونجتے۔ کسی مکان میں کواڑ نہ تھے۔ کسی کے مکان کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ مساوات و محبت کے مظاہر برف کی طرح ہر طرف چمکتے رہتے تھے۔ اسی طرح تمام خطہ جنت الفردوس بنا ہوا تھا۔ اختلاف و افتراق کو وہاں بدترین گناہ سمجھا جاتا تھا۔ شادی سے کوئی واقف نہ تھا۔ سب محبت کرتے تھے اور محبت کے رشتے میں بندھی ہوئی دوستیاں مدت العمر جدا نہ ہوتی تھیں۔ وہاں اب تک شادی بیوگاں کا سوال نہیں اٹھا تھا۔ جواں عمر بیوائیں پاکیزہ زندگی گذارتیں۔ وہاں کوئی مجرد نہ تھا۔ اس لئے کہ محبت کا رشتہ مرد، عورت سبھی کو تسلیم تھا۔ وہاں انسانی نسل کے تباہ کرنے والے ڈاکٹر نہ تھے۔ اس لئے کہ زندگی بخش فطرت وہاں سکونت پذیر تھی۔ وہاں کبر و غرور اور تعلی و خودستائی کی فضول شورش نہ تھی۔ وہاں آنکھیں بولتیں اور زبان چُپ رہتی۔ وہاں چیزیں تھیں مگر ان کی قیمت نہ تھی۔ تجارت نہ تھی کاروبار نہ تھا۔ حکومت نہ تھی۔ حکمراں نہ تھا۔ قانون نہ تھا۔ ضابطہ نہ تھا تھی تو محبت اور صرف محبت۔ محبت ہی سے چیز لی جاتی اور دی جاتی۔ دھرم کھلے میدانوں میں ایشور کی پوجا کرنا۔ کتھا صرف دل میں ہوتی۔ سب لوگ اپنے فرمانروا آپ تھے۔ دستور قانون تھا اور سچائی اقتدار۔ نیک چلنی کو سب مذہب سمجھتے اور جسمانی قوت کو ہتھیار۔

اس وقت ستلج کے کنارے سب سے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر آزبیک اور سوکیشی بیٹھے تھے۔ میدان میں گھاس پر پھولوں کا قالین بچھا ہوا تھا۔ پہاڑ تائب دلوں کی طرح پاک وصاف ہو رہے تھے۔ درختوں پر نیلا رنگ چھایا ہوا تھا۔ پرند اُڑ رہے تھے۔ ابر کے ٹکڑے دوڑ لگا رہے تھے۔ فطرت شگفتہ ہو رہی تھی۔ غرض وہی عشق خیز اور جذبات انگیز زمانہ تھا جس کو موسم بہار کہتے ہیں۔ سوکیشی کے کھلے ہوئے بال اس کے جسم پر اڑ رہے تھے۔ اس نے جسم کا زیریں حصہ کنول سے ڈھک رکھا تھا اور سر پر پھولوں کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ آزبیک اُس کے کانوں میں پھول پہنا رہا تھا۔

یکایک دونوں کے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ دونوں نے ایک ناقابل بیان سنسنی محسوس کی۔ اُن کی آنکھیں جیسے

محبت کی خاموش زبان میں بول اُٹھیں۔ اس طرح کچھ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد آرنیک نے اس کا دوسرا رخ سہانا شروع کیا۔ اس وقت نیلے بادل زمین کو چوم رہے تھے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں بادلوں سے ہم آغوش ہو رہی تھیں۔ اور موروں کے قریب مورنیاں تھرک رہی تھیں۔

اتنے میں سوکیشی کی نظر آرنیک کے ہاتھ پر پڑی۔ آرنیک نے اپنی مٹھی میں کچھ چھپا رکھا تھا۔ سوکیشی نے ہلکی ہنسی کے ساتھ آرنیک کی مٹھی کھولی۔

جس طرح بادلوں میں چھپے ہوئے چاند کی روشنی بادلوں کے دُور ہو جانے پر چمک اُٹھتی ہے۔ اسی طرح مُٹھی کھُلتے ہی "اندرنیل منی" کی ہریالی چمک سے آس پاس کی جگہ روشن ہو گئی۔ "یہ کیا ہے آرنیک"؟ یہ کہہ کر سوکیشی نے گوہر کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

آرنیک نے کہا "یہ پتھر مجھے ستلج کی گھاٹی میں ملا ہے۔ نیلے آسمان کی طرح اس کا رنگ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے" سوکیشی اندرنیل منی کی طرف دیکھ رہی تھی جو نہایت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے نسوانی ذوق و شوق کے ساتھ اس کو سینے سے لگا لیا۔ مہادیوجی کے گلے کے داغ کی طرح وہ پتھر اس کے سینے کی زینت بن گیا۔ آرنیک اس کے بلا کے حسن کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ سوکیشی نے کنول سے ڈھکے ہوئے سینے سے پھولوں کی چادر ہٹا دی۔ جس طرح صبح کے وقت کنول کی نیم شگفتہ کلی حسین معلوم ہوتی ہے اسی طرح سوکیشی کا گدرایا ہوا سینہ کھِل اٹھا جس طرح سفید برف کے ٹکڑوں پر سیاہ بادلوں کا عکس پڑ کر ان میں نیلا رنگ بھر دیتا ہے۔ اسی طرح سوکیشی کے سینے کو "اندرنیل منی" نے رنگین بنا دیا۔

سوکیشی ہلکی ہنسی کے ساتھ آرنیک کی طرف دیکھ کر بولی آرنیک! یہ پتھر تو میرے ہی لائق ہے۔

آرنیک نے بڑی محبت سے گوہر کو سوکیشی کی پھولوں کی چولی میں چھپا دیا۔ "یہ جواہر تمہارا ہی ہے سوکیشی!"

اس وقت سومیرو سرسبز میدان سے گذر کر پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ وہ یکایک ٹھٹھک گیا۔ آرنیک سوکیشی کے داہنے ہاتھ کو کھینچ کر اس کی محبت بھری آنکھوں کا بوسہ لے رہا تھا۔ سومیرو یہ دیکھ کر رک گیا۔

اس میدان میں اوّل اوّل اسی وقت رقابت کی بنیاد پڑی۔ پاس ہی ایک چٹان بڑے زور کے ساتھ نیچے ڈھلکی۔ اس کی آواز سے جنگل کانپ اٹھا۔ پرندے اُڑ پڑے۔ جانور بھاگ گئے۔ پہاڑوں سے جوابی صدا بلند ہوئی۔ سوکیشی اور آرنیک بھی چونک اُٹھے۔ ناگہاں اُنہوں نے پہاڑ سے ڈھلکتے ہوئے ایک پتھر اور آہستہ آہستہ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے سومیرو کو دیکھا۔

اس وقت سے سومیرو کو آرنیک سے رقابت ہو گئی اُس نے بہت سے غاروں اور گھاٹیوں کی ٹھوکر کھا کر رنگ رنگ کے پتھر جمع کئے۔ اپنی گابوں کے گلے میں ان پتھروں کے ہار پہنائے لیکن ان میں اندرنیل منی کی طرح کوئی پتھر نہ تھا۔ ایک روز سومیرو نے گورشت پرنٹر کے پاس جا کر کہا کہ اب میں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔

گرو نے نہایت پیار سے پوچھا۔ کیوں بیٹا! آخر تم نے کس بنا پر تنہائی پسند کی ہے؟ سومیرو نے ہچکچاتے ہوئے

جواب دیا۔حسین صبح کی طرح صبیح سوکیشی آرنیک کے ساتھ پیار کرتی ہے۔

گرو نے ہلکی ہنسی کے ساتھ کہا۔جس جگہ انسان محبت سے جلتے ہیں،جہاں وابستگانِ محبت کو حسد کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے وہاں جہنمی فضا پیدا ہوتی ہے۔وہاں شباب میں آبِ حیات کے بجائے زہر پیدا ہوجاتا ہے۔وہاں پاک محبت کی جگہ نفس پرستی لے لیتی ہے۔اس لئے بیٹا!تو بھی اپنے لئے کسی موزون رفیقۂ زندگی کو تلاش کر کے مسرور زندگی بسر کر،

"گرو!میں سوکیشی ہی کو حاصل کروں گا۔آرنیک نے اسے ایک اندرنیل منی دیا ہے میں اسے دس دوں گا"

گرو نے ایک لمبی سانس لے کر کہا"تو اب اس کی جگہ فردوسیت ختم ہوجائے گی"۔

سومیرو حسد آمیز قہقہہ لگا کر وہاں سے چلا گیا اور ایک تنہا مقام میں رہنے لگا۔سومیرو کی تنہا جائے سکونت میں بھی کتنی عورتیں رنگین پتھر لینے جاتی ہیں۔کنول جیسے قدرے سُرخ۔وشنو کے پیتامبر جیسے زرد اور اتھاہ گہرے پانی جیسے نیلے پتھر سومیرو ہی کے پاس ملتے ہیں اور پتھروں کے عوض اس کے ہاں گائیں۔چاول،مکھن اور دودھ چلے آتے ہیں۔وہاں عورتوں کو کنول کے ڈنٹھل کی بجائے کانوں میں سُرخ پتھروں کے آویزے پہننے کا شوق پیدا ہوگیا ہے۔اور اب وہ اس شوق کے پورا کرنے کے لئے محکوم ہوگئی ہیں۔سومیرو نے وہاں جدید قانون رائج کئے ہیں پہلے لوگ معلوم اور نامعلوم طور پر ضرورت کی چیزیں لیا دیا کرتے تھے۔تمام چیزیں برابر کی حیثیت کی سمجھی جاتی تھیں اور برابر ہی کارآمد لیکن سومیرو نے رنگ اور خوبصورتی کی بنا پر ہر پتھر کی جدا جدا قیمت مقرر کی۔اس طرح سومیرو کے پاس بے اندازہ چیزیں جمع ہوگئیں اور ضرورت مند لوگ چیزوں کے لئے مارے مارے پھرنے لگے۔

ایک روز ایک نوجوان سومیرو کے پاس آیا اور جَو کے بدلے مکھن مانگنے لگا۔

سومیرو نے کہا۔میں جَو کے بدلے مکھن نہیں دے سکتا۔مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

نوجوان نے کہا"مجھے اس کی ضرورت ہے اس لئے تمہیں دینا چاہئے"۔

سومیرو نے جواب دیا۔وہ میری چیز ہے میں نہیں دینا چاہتا"

جس وقت سومیرو یہ فقرہ ادا کر رہا تھا۔سن سن کرتی ہوئی ہوا دیودار کے درخت کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔اس خطے میں یہ فقرہ اور تخیل بالکل نیا تھا"

نوجوان نے پوچھا"تو پھر ان چیزوں کے رکھنے کا کیا مقصد؟"

سومیرو نے ایک قہقہہ لگا کر کہا"اقتدار حاصل کرنا"

پھر جنگل لرز اُٹھا۔یہ جدید تخیل زمین کو ناپاک بنا رہا تھا"

بھولے نوجوان نے سوال کیا۔اقتدار!اقتدار کے کیا معنی؟

ایک سمت سے بہت سی عورتیں اور مرد آتے ہوئے دکھائی دئے۔کسی کے پاس گائیں تھیں۔کسی کے پاس جَو۔کسی

کے پاس کنول کے پھول۔ کوئی شکر قند لئے آرہا تھا۔ کوئی مکھن۔ کوئی دودھ اور کوئی مٹی۔

سومیرو ان کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر غرور کے ساتھ نوجوان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ معنی ہیں اقتدار کے کتنے آدمی چلے آرہے ہیں"۔

سارا مجمع سومیرو کے پاس آگیا۔ کوئی چلّا رہا تھا کہ ہمیں لال پتھر دو۔ کوئی نیلے پتھر پر نظر جمائے ہوئے تھا کسی کو زرد پتھر مرغوب تھا۔

سومیرو نے کچھ سفید اور کچھ زرد پتھر نکالے جو سورج کی کرنوں کی طرح جگمگا نے لگے۔

تمام مجمع شور کرنے لگا۔ "یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ یہ ہمیں دو۔ یہ ہمیں دو"۔

پتھر کے دو ٹکڑوں کو اٹھا کر سومیرو نے کہا۔ "اس پیلے ٹکڑے کا نام سونا ہے اور سفید کا نام چاندی"۔

"ہمیں سونا دو"

"ہمیں چاندی دو"

"ہمیں دونوں دو"

"خاموش رہو" سومیرو گرجا اور سارا مجمع ساکت ہوگیا۔

"کس کو سونا چاہئے؟"

"ہمیں" "ہمیں" کی صدا سے فضا گونج اٹھی۔ سومیرو شانِ استغنا کے ساتھ ہنس رہا تھا۔ پھر بولا۔ "تو دیکھو اس پیمانے کو جو شخص ایسے سو پیمانے جَو سے بھر دے گا اسے اتنا سونا ملے گا"۔

سب پُتلے کی طرح کھڑے رہے۔ اس کے بعد جس کے پاس دودھ تھا۔ اُس نے سومیرو کے آگے رکھا۔ سومیرو نے مٹی کے پیمانے سے دودھ بھرنا شروع کیا۔ سب چاندی اور سونا لینے لگے اور پُرشوق نظروں سے دیکھنے دکھانے لگے۔

دور سے آرنیک اور سوکیشی آرہے تھے۔ مجمع کے بیچ میں سومیرو آقا کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اِس نوجوان کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"نوجوان! کیا تو نوکری کرے گا؟"

"نوکری کیسی؟"

"تونے سمجھا کہ اقتدار کے معنی کیا ہیں؟"

"ہاں"

"تو نوکری کے معنی بھی سمجھ لے۔ ان سب چیزوں کو ایک طرف رکھ دے۔ پتھروں کو وہاں اچھی طرح چُن دے کنول کے پھولوں کو وہاں سجا دے۔ چٹائی وہاں بچھا دے"

بھولا نوجوان سومیرو کے حکم کے مطابق کرنے لگا۔

سومیرو مجمع کی طرف متوجہ ہو کر بولا "تم سب کو معلوم ہو جائے اس لئے کہو۔ جو کے سوپیا نے تین سنہری پتھروں کے برابر ہیں۔"

تمام مجمع ایک ساتھ بول اٹھا "جو کے سوپیا نے تین سنہری پتھروں کے برابر ہیں"۔

"ڈیڑھ سو دودھ کے گھڑے دس روپہری پتھروں کے برابر ہیں"۔

"مجمع کے جوابی شور سے ہمالہ کا کوہستانی علاقہ گونجنے لگا۔

پانسو گایوں کا ایک "اندرنیل منی"۔

اس کی صدائے بازگشت سے پہاڑ گونج اٹھا۔

"دس اندرنیل منی کی ایک عورت"۔

اس وقت سوکیشی اور آرنیک وہاں سے گذرتے ہوئے رک گئے مجمع نے سومیرو کو جواب دیا۔ "دس اندرنیل منی کی ایک عورت"۔

نہایت افسردہ خاطری کے ساتھ وہ جوڑا آگے بڑھ گیا

سومیرو کو تمام رات نیند نہ آئی۔ اس کے پاس بے شمار مال واسباب تھا۔ خادم اور نوکر بھی، اور بھی بہت سے خدمت و ملازمت کے لئے تیار تھے۔ پھر بھی وہ آرام سے نہ سو سکا۔ سوکیشی کی نیلے کنول کی سی آنکھیں اُسے برابر یاد آتی رہیں

وہ صبح اپنے قیمتی پتھروں کو لے کر سوکیشی کے ہاں گیا۔

صبح کا سورج کنول کے پھولوں پر پڑے ہوئے پانی کے قطروں پر اپنا عکس ڈال کر پھولوں کو تاج زرنگار بنا رہا تھا کنول کے پھول نیم باز آنکھوں سے صبح کی بہار دیکھ رہے تھے۔ سوکیشی پانی کا گھڑا لئے کھڑی تھی۔ دور میدان میں سارس کا جوڑا ٹہل رہا تھا۔ سومیرو نے اپنے بیش قیمت پتھر سوکیشی کے قدموں پر ڈال دئے۔ تالاب سے پانی بھر کر لوٹتی ہوئی کچھ دیر کے لئے سوکیشی وہاں ٹھہر گئی۔ سومیرو نہایت اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً اس نے کہا

"سُندری!" اس کے اس طرزِ خطاب میں اضطراب تھا اور ایک بےپناہ جوش۔ "سندری میں تیرے پیچھے پیچھے آرہا ہوں اور اندرنیل منی سے بھی زیادہ قیمتی پتھر تیرے لئے لایا ہوں۔ میں تجھے ان کا ہار بنا کر دوں گا"۔

سوکیشی نے کہا "سومیرو! تو نے محبت دیکھی ہے؟"

سومیرو۔ حیران کھڑا رہ گیا۔ سوکیشی کے ہونٹوں پر تبسم جھلکنے لگا۔ اس نے پھر سوال کیا "کیا تو محبت سے واقف ہے؟"

سومیرو "نہیں"۔

سوکیشی۔ تو دیکھ اُس کا نام ہے محبت۔ جس کو تو تعداد اور پیمانہ سے وزن نہیں کرسکتا۔ جو ناقابلِ تسخیر اور ناقابلِ

فتح ہے"

سومیرو نے اُس بھولے بھالے نوجوان کو سمجھایا تھا کہ "دیکھ اس کا نام اقتدار ہے"۔

اس کی صدائے بازگشت کی طرح سومیرو کے کان میں یہ آواز گونج رہی تھی: "دیکھ اس کا نام محبت ہے۔ اور دیکھ جہاں اس کی تخلیق ہوتی ہے اُس طرف" سوکیشی نے سامنے کے منظر کی جانب انگلی اٹھائی۔ سومیرو ادھر دیکھنے لگا۔ کھلے ہوئے کنول کے پھولوں کے عکس سے پانی رنگین ہو رہا تھا۔ میدانوں میں مور رقص کر رہے تھے۔ سارس کا جوڑا خراماں خراماں ٹہل رہا تھا۔ درختوں، بیلوں اور جانوروں پر سب پر رونق و تازگی جھلک رہی تھی۔

"دیکھ یہ ہے محبت کی دنیا" یہ کہتی ہوئی سوکیشی چلی گئی۔

شام کے سورج نے طرح طرح کے رنگ بکھیر رکھے تھے۔ سوکیشی اور آرنیک نیلگوں اور سرسبز میدانوں کو طے کرتے اور دور دور پہاڑوں پر الوداعی نگاہ ڈالتے چلے جا رہے تھے۔ اس مقام سے یہ ان کی آخری وداع تھی۔

سومیرو سوکیشی سے مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن جس طرح کسی چیز کے کھو جانے کے بعد اس کی یاد باقی رہ جاتی ہے اُمیدوں کا خاتمہ ہو جانے کے بعد بھی حسرت باقی تھی۔ سوکیشی اور آرنیک کو جاتے دیکھ کر وہ ان کے پاس گیا اور پوچھنے لگا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

جواب ملا: "جہاں محبت کی دنیا ہے وہاں، دیکھ سنہری رنگ سے رنگین ان برفیلی چوٹیوں کی جانب"۔

"اور یہاں"؟

"اور یہاں کیا؟ اب یہاں کی سرزمین راحت نہیں دے سکتی۔ یہاں انسان اطمینان کی زندگی نہیں گذار سکتا"۔

"کانپتے کانپتے سومیرو نے پوچھا کیوں؟"

جواب ملا: "جہاں کام ناپا جاتا ہے وہاں سے ہنر چلا جاتا ہے۔ جہاں چیز ناپی جاتی ہے وہاں سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ جہاں انسان کی خرید و فروخت ہوتی ہے وہاں کی فردوسیت ختم ہو جاتی ہے۔ تو نے دولت جمع کی ہے اب آدمیوں سے محبت زائل ہو جائے گی۔ محبت زر خرید چیز سمجھی جائے گی۔ اب اس سرزمین پر وہ وقت آئے گا جب انسان محبت کو نہیں بلکہ شان و شوکت کو، عیش و عشرت کو، اقبال مندی کو اور جماعتی امتیاز و خصوصیت کو فوقیت دے گا۔ اب محبت کی بنا پر شادیاں نہ ہوں گی۔ اس دنیا سے محبت کی بہار رخصت ہو جائے گی۔ اساڑھ کے بادل محبت کے پیامبر نہ رہیں گے۔ جدائی میں جدائی کے آنسو نہ بہیں گے۔ بیوی شوہر نہ ہوں گے۔ بہار نہ ہوگی۔ اس کے لُطف نہ ہوں گے۔ حسن نہ ہوگا۔ شوق نہ ہوگا۔ تازگی نہ ہوگی۔ رونق نہ ہوگی۔ کچھ نہ رہے گا۔ زندگی بے کیف ہو جائے گی۔ اعمال میں اخلاص کی بجائے تصنع پیدا ہو جائے گا۔ فیاضی حماقت سمجھی جائے گی۔ میزبانی نادانی۔ ماتحت اور متعلقین بارِ خیال کئے جائیں

گے۔ بات چیت چالاکی میں تبدیل ہوجائے گی"۔

سومیرو کو چکر آنے لگا۔ اُس نے پوچھا "ایسا کب ہوگا؟ اور اُس وقت کیسے انسان ہوں گے؟"

جواب ملا "سومیرو! تو نے جس طریقے کا آغاز کیا ہے وہ برابر جاری رہے گا۔ جب یہ حالت انتہا کو پہنچ جائے گی تو انسان سانپ کے مثل ہوجائے گا وہ خواہ مخواہ لوگوں کو ہلاک کرے گا۔ اور ہلاک کئے بغیر اس کو چین نہ آئے گا۔

ہمالہ کی سنہری رنگ سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر گلابی رنگ کا تاج زیب دے رہا تھا۔ سوکیشی اور آزبیک اُس طرف بہت دُور چلے گئے۔ گہری تاریکی کا پردہ دُنیا کو چھپا رہا تھا۔ سومیرو وہیں پہاڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے منہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

"اے پرمیشور!" اُس نے آخری بار دردناک لہجہ میں کہا۔ "ارضی بہشت" اتنی بےکیف و بےرُوح ہوجائے گی! اور صرف میرے گناہ سے!! تو اب یہ جدید خیالات کیوں کرمٹیں"؟ چاروں طرف کا اندھیرا بولتا ہوا معلوم ہوا "صفحۂ ارض پر پھیلے ہوئے خیالاتِ بد کے خطوط مٹانے کے لئے تیری قربانی کے گرم خون کے مسالہ کی ضرورت ہوگی"۔

(ایک گجراتی کہانی کا آزاد ترجمہ ہندی کے واسطہ سے)

ابو محمد امام الدین

قطعات

فریبِ نغمہ

مُغنّیہ! تری تانوں سے ہو کے ہم آہنگ
صدائے سازِ برنگِ فغاں نکلتی ہے
یہ جانتا ہوں مگر آہ! باوجود اِس کے
مجھے گماں ہے یہی، میری جاں نکلتی ہے

نشاطِ بہار

پھوار، ابر، پرندوں کے گیت، مست ہوا
بھرے کٹوروں کی صورت چھلک رہی ہے فضا
بہار کان میں کچھ کہہ رہی ہے مجھ سے مگر
وہ بےخودی ہے کہ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا

اخفائے حقیقت

جو پوچھتا ہے کوئی "سُرخ کیوں ہیں آج آنکھیں"
تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں "رات سو نہ سکا"
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی!
کہ "رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا"

اختر انصاری دہلوی

"فرح باغ" بیدر

عجیب "فرح باغ" ہے، جہاں سدا بہار ہے ہر ایک گل ایاغ ہے، نہال مے گسار ہے

یہ باغ لاجواب ہے۔ دکن میں انتخاب ہے وہ عینِ آفتاب ہے۔ جو اُس کا آبشار ہے

بکاؤلی کا باغ بھی، نظر فروز راغ بھی وہاں کا شب چراغ بھی، یہاں سے کم عیار ہے

گل و ثمر کے درمیاں، سریلے سُر میں نغمہ خواں عجیب ناز سے رواں، نسیم مشکبار ہے

کھلا ہُوا جو لالہ ہے، عقیق کا پیالہ ہے بھرا جو اس میں ژالہ ہے، نبیذِ بے خمار ہے

گلوں میں جلوہ نور کا، پیام ہے سرور کا شجر میں کوہِ طور کا فروغ آشکار ہے

نسیمِ خلدِ نوزاں، کی کچھ کمی نہیں یہاں مفرّح مشامِ جاں۔ ہوائے مرغزار ہے

ہری بھری جو کشت ہے۔ نمونۂ بہشت ہے عقیق سنگ و خشت ہے چمن طلسم کار ہے

فرازِ سروِ بوستاں، نوا سرا ہیں قمریاں فضا میں مُرغِ نغمہ خواں کا تُوہی پکار ہے

صنم کدے کے روبرو، کھڑے ہیں چند ماہرو لئے چراغِ آرزو، ہر ایک گلعذار ہے

جہاں ہے بت کا آستاں۔ وہیں خدا کا ہے مکاں[۱] رہا نہ فرق این و آں۔ یہ شان کردگار ہے

چمن ہے رشکِ ارم، جہاں ہیں کفر و دیں بہم ملا ہے دیر سے حرم، یہ میل خوشگوار ہے

یہاں ہیں جمع مالنیں عقیق لب پجارنیں پری جمال جوگنیں، یہ اندری دربار ہے

طنینِ طاس و رنگ سے، نوائے ساز و چنگ سے ترانۂ کلنگ سے، یہ باغ نغمہ زار ہے

ادیب حق کا شکر کر، کرم کی جس نے کی نظر
ترا کلام با اثر، چمک میں برق وار ہے

محمد حسین ادیب

۱۔ اس باغ کے مغربی حصہ میں ایک تنگ و تاریک غار میں وشنو کے نرسنگھ اوتار کا مجسمہ ہے۔ یہ مقام ہندوؤں کی زیارت گاہ تھی۔ حضرت غازی اورنگ زیب نے بیدر فتح کرنے پر اس آغاز کے متصل بائیں جانب ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تعمیر کرا دی تھی۔ جو آج تک قائم ہے۔

۲۔ فرح کی ر ضرورتِ شعری کے لئے ساکن باندھی گئی ہے۔

فضا میں ایک سوار

۱۸۶۱ء میں موسمِ خزاں کی ایک سہانی سہ پہر کو ایک سپاہی مغربی ورجینیا میں سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں پڑا ہوا تھا۔ اُس کا سر بائیں ہاتھ کے سہارے پر تھا اور پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ سے وہ رائفل کو بے پروائی سے تھامے ہوئے تھا۔ صرف اُس کے لیٹنے کے انداز اور کارتوسوں کے کمر سے بندھے ہوئے بیلٹ کی خفیف سی حرکت سے، جو اُس کی کمر سے بندھا تھا، وہ زندہ تصوّر کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے متعین مقام پر سو رہا تھا لیکن دیکھنے والوں کو بادی النظر میں مردہ معلوم ہوتا تھا ــــــ اُس کی اس غفلت کی سزا صرف موت ہی ہو سکتی تھی!

وہ جھاڑی جس میں یہ مجرم لیٹا ہوا تھا، سڑک کے کنارے ایک گوشے میں تھی۔ اس مقام سے سڑک جنوب کی جانب اوپر چڑھتی ہوئی ڈھلواں بلندی پر پہنچی تھی اور وہاں سے یکایک مغرب کی طرف گھوم کر ایک سو گز تک چلی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ سڑک پھر جنوب کی طرف مُڑ کر چکّر کھاتی ہوئی نیچے جنگل میں اُترتی تھی۔ اِس جگہ جہاں سے سڑک پھر جنوب کی جانب مڑی تھی، ایک چٹان تھی جو پہاڑی کی پشت سے شمال کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ یہ چٹان ایک اونچی پہاڑی کی چوٹی تھی۔ اگر اِس کے کنارے سے پتھر کا چھوٹا سا ٹکڑا گرا دیا جاتا تو سیدھا ہزار فٹ نیچے صنوبر کے درختوں کے درمیان جا کر گرتا۔ سڑک کا وہ گوشہ جس میں سپاہی لیٹا ہوا تھا اسی پہاڑی کی ایک شاخ پر تھا۔ اگر وہ بیدار ہوتا تو نہ صرف متذکرۂ بالا چٹان اور سڑک کے گھوم گھماؤ کا منظر دیکھ سکتا بلکہ چٹان کے نیچے کی پہاڑی کا پورا حصّہ اُسے نظر آتا اور اُس کا سر چکرا جاتا۔

ہر طرف گھنے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ صرف شمال کی جانب وادی کے نشیب میں کچھ جگہ خالی نظر آتی تھی۔ جہاں چھوٹا سا قدرتی سبزہ زار تھا اور جس سے پانی کا ایک چشمہ بہتا ہوا کہیں دُور چلا گیا تھا۔ یہ چشمہ وادی کے فراز سے نظر نہیں آتا تھا۔ زمین کا یہ کُھلا حصّہ کسی مکان کے بیرونی دالان سے زیادہ وسیع نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مگر حقیقت میں اس کا رقبہ کئی ایکڑ تھا۔ اِس کا سبزہ قریب کے جنگل سے زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ اِس حصّۂ زمین کے اُس پار انہی پہاڑیوں سے مشابہ جن پر کھڑے ہو کر ہم اِرد گرد کے بیابانی مناظر پر طائرانہ نگاہ ڈال رہے ہیں۔ پہاڑیوں کا عظیم الشان سلسلہ تھا۔ وادی کی ساخت ایسی تھی کہ وہ چاروں طرف سے بند معلوم ہوتی تھی اور کوئی شخص اُس سڑک کو جو وادی کے باہر گئی ہوئی تھی، دیکھ کر تعجب کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ یہ سڑک وادی کے اندر کیسے داخل ہوئی اور یہ سمجھنے سے بھی ذہن قاصر رہتا کہ پانی کا چشمہ جو دو ہزار فیٹ نیچے سبزہ زار کو دو حصّوں

میں تقسیم کرتا ہُوا بھر رہا تھا، کہاں سے آیا اور کدھر گیا۔

کیسا ہی دُشوار گذار مقام کیوں نہ ہو انسان اُس کو میدانِ جنگ سے مُبدل کر دیتا ہے۔ اس جنگل میں پانچ دستے پیدل سپاہ کے پڑے ہوئے تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پہاڑیوں اور جنگلوں کے سلسلے سے یہ قطعہ چاروں طرف سے بند تھا۔ گویا یہ ایک قسم کی فوجی "چُوہے دانی" تھی جس کے راستوں کو صرف پچاس آدمی گھیر کر بڑی سے بڑی فوج سے ہتھیار رکھوا لیتے۔

پیدل سپاہ کے وہ دستے، جن کا ذکر ابھی ہُوا ہے گذشتہ رات اور دن مُسلسل چلنے کے بعد یہاں پہنچے تھے اور اب آرام کر رہے تھے۔ آج شب کو وہ پھر روانہ ہونے والے تھے اور پہاڑی کے اُس حصّہ پر چڑھنے کو تھے جہاں اُن کا بے وفا پہرہ دار سو رہا تھا۔ اِس مقام سے پہاڑی کے دوسری جانب اتر کر دشمن کے خیموں پر وہ رات ہی کے وقت حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ حملہ اچانک ہوگا کیونکہ پہاڑی سے اُتر کر سڑک دشمنوں کے خیموں کی عین پُشت پر پہنچی تھی۔ اگر وُہ اِس ارادے میں ناکام رہتے تو بڑی سخت مشکل آپڑتی اور اگر اتفاقاً پہرے کی غلطی سے دشمن کو اُن کے حرکات وسکنات کی خبر مل جاتی تو وہ یقیناً ناکام رہتے۔

وہ پہرہ دار جسے ہم نیند میں مدہوش دیکھ چکے ہیں نوجوان لڑکا تھا۔ وہ ورجینیا کا باشندہ تھا اور اُس کا نام کارٹر ڈروز تھا۔ اپنے والدین کا وہ اکلوتا لڑکا تھا۔ اُس کے والدین خوش حال اور متمول تھے اور کارٹر اچھی سوسائٹی اور اچھی غذاؤں کا ہر وُہ لطف اُٹھا چکا تھا جو روپیہ کے ذریعہ سے مغربی ورجینیا جیسے پہاڑی ملک میں نصیب ہو سکتا تھا۔ جس جگہ وہ اس وقت سو رہا تھا وہاں سے اُس کا مکان صرف چند میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک دن صبح کے ناشتے کے بعد اُس نے اپنے باپ سے یہ الفاظ فیصلہ کن سنجیدگی اور متانت سے کہے تھے کہ ابّا جان، گرافٹن میں فیڈرل رجمنٹ آئی ہوئی ہے میں اُس میں بھرتی ہونا چاہتا ہُوں۔

باپ نے بیٹے کی طرف خاموشی سے دیکھ کر کچھ دیر کے بعد جواب دیا تھا۔ "جاؤ کارٹر، اور جس حالت میں بھی تم رہو اپنا فرضِ منصبی ادا کرنا۔ ورجینیا جس سے تم رُوگرداں ہو رہے ہو تمہارے بغیر تباہ نہیں ہو جائے گا۔ اگر ہم دونوں لڑائی کے بعد زندہ رہے تو پھر اِس معاملہ کے متعلق گفتگو کریں گے۔ تمہاری ماں کی حالت جیسا کہ ڈاکٹر نے تم سے بیان کیا ہوگا، بہت خراب ہے۔ ایک ہفتے سے زیادہ وہ ہمارا ساتھ دنیا میں نہیں دے سکتی۔ مگر اس وقت اُس کو ملاقات کی تکلیف دینا اچھا نہ ہوگا"

اِس طرح کارٹر ڈروز اپنے باپ سے رُخصت ہُوا تھا۔ باپ نے بیٹے کے آخری سلام کا جواب اس انداز سے دیا تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کا دِل رنج و الم سے چُور ہو رہا ہے۔

کارٹر نے فوراً ہی اپنی جانبازی اور راستبازی سے ساتھیوں اور افسروں کے دلوں میں گھر کر لیا، اور یہی وجہ تھی

کہ اُس کو پہاڑی کے اس خطرناک اور اہم مقام پر پہرہ دینے کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ مگر تکان نے اُس کے عزمِ راسخ پر غلبہ پا لیا تھا اور وہ اس وقت سو رہا تھا۔ کس فرشتے یا شیطان نے اُس کو خواب سے بیدار کر دیا؟ کون کہہ سکتا ہے؟ سہ پہر کی گہری خاموشی میں کسی نامعلوم قاصدِ قسمت نے اُس کی آنکھوں کو آہستگی سے کھول دیا اور اُس کے کانوں میں ایسا راز پُرافسوں پھونک دیا جو انسان کو خوابِ راحت سے عجیب کیفیت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے۔ مگر انسان خود اس راز سے ناواقف ہوتا ہے۔ کارٹر نے سر اُٹھا کر درختوں کے درمیان سے اوپر کی جانب دیکھا اور غیرارادی طور پر دایاں ہاتھ رائفل پر رکھ دیا۔

وہ ایسی خوشی محسوس کرنے لگا جو انسان کے دل میں کسی نایاب صنعت کو دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے پہاڑی کی ایک نمایاں بلندی پر کسی پُررعب شہسوار کا مجسمہ سا نظر آ رہا تھا۔ گویا پردۂ آسمان پر کسی نے مُصوّری کی ہو۔ یہ مجسمہ بالکل ساکت تھا۔ گھوڑے پر ایک انسان کی صورت تھی جو سنگِ مرمر سے تراشے ہوئے یونانی دیوتاؤں سے مشابہ تھی۔ اس کا بھورا رنگ وقت اور فضا کے مناسب تھا۔ شہسوار کی زرہ اور بکتر کی دھات سایے کی وجہ سے نرم اور خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ گھوڑے کی زین سے ایک بندوق لٹک رہی تھی جس کے کُندے پر سوار کا دایاں ہاتھ تھا۔ بایاں ہاتھ جس میں لگام تھی، صاف نظر نہ آتا تھا۔ گھوڑے کا جسم صاف نظر آ رہا تھا۔ سوار کا چہرہ بائیں طرف کو پھرا ہوا تھا۔ صرف ٹھوڑی اور ڈاڑھی نظر آ رہی تھی۔ پہاڑی کے نیچے وادی میں وہ اپنی نظر بس جائے ہوئے تھا۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہ زندہ مجسمہ بہت عظیم الشان معلوم ہوتا تھا۔

ایک لحظہ کے لئے ڈرُوز کے دل میں خیال گذرا کہ وہ جنگ کے اختتام تک سوتا رہا ہے اور اس وقت کسی مجسمہ کو دیکھ رہا ہے جو اس بلند اور نمایاں مقام پر عہدِ گزشتہ کی جانبازیوں کی یاد میں بنایا گیا ہے۔ یہ خیال فوراً جاتا رہا جب مجسمے نے حرکت کی۔ گھوڑے نے بغیر پاؤں اٹھائے اپنے جسم کو گہرائی کی طرف سے ذرا پیچھے کر لیا تھا۔ سوار ویسا ہی ساکت تھا جیسا پہلے۔ ہوش و ہواس بجا رکھتے اور موقع کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے ڈرُوز نے رائفل کی نال کو آہستہ آہستہ اٹھایا اور کندے کو اپنے شانے اور دائیں گال کے درمیان دبا کر سوار کے سینے پر نشانہ کیا۔ صرف گھوڑے کے دبانے کی دیر تھی اور اُس کا نتیجہ جو ہوتا ڈرُوز کے خیال میں بُرا نہ ہوتا۔ عین اسی وقت سوار نے مُنہ پھیر کر اپنے چھپے ہوئے دشمن کی جانب دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی نگاہیں ڈرُوز کے دل میں چھبی جاتی تھیں۔

کیا کسی دشمن کو لڑائی کے زمانے میں مار دینا کوئی خوفناک جُرم ہے؟ ایسا دشمن! جو کسی کے ساتھیوں کی اور خود اس کی جائے پناہ سے واقف ہو گیا ہو۔ . . . . وہ دشمن جو اپنے اس علم کی وجہ سے دشمنوں کی پوری فوج سے زیادہ خطرناک ہو! . . . . . ڈرُوز کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ سر چکرانے لگا۔ مجسمہ اُس کی نظروں کے سامنے اوپر نیچے اُٹھنے اور گرنے لگا اور تھرتھراتا ہوا گول اور بیضوی دائروں میں آتشیں فضا کے اندر تیزی سے چکر کھانے

لگا۔ ڈرُوز کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی۔ اس کا سر آہستہ آہستہ نیچے گرنے لگا۔ یہاں تک کہ اُس کا چہرہ زمین پہ پتیوں میں چُھپ گیا۔ یہ بہادر اور جانباز سپاہی جذبات کے غلبہ سے بے ہوش ہو جانے کے قریب تھا۔

یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی۔ دوسرے ہی لمحہ میں اُس نے اپنا سر زمین سے اُٹھالیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ رائفل پر پہنچ گئے اور انگلی کھٹکے سے جا لگی۔ آنکھیں صاف دیکھنے لگیں، دل و دماغ صحیح ہو گئے۔ قوتِ فیصلہ بھی بحال ہو گئی۔ وہ دشمن کو گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو غیر ممکن تھا اگر دشمن ہوشیار ہو جاتا تو فوراً اپنے خیمے میں پہنچ کر ایک خوف ناک راز کو فاش کر دیتا۔ ڈرُوز کا فرض اب صاف ظاہر تھا۔ سوار پر بلا پس و پیش گولی چلا دینی چاہئے۔ بغیر اُس کو آگاہ کئے قبل اُس کے کہ وہ دعا کرے اور خدا کو یاد کرے اُس کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہئے۔ مگر نہیں، صرف ایک امید باقی ہے شاید اُس نے کچھ نہ دیکھا ہو۔ ممکن ہے وہ صرف مناظرِ قدرت سے لُطف اندوز ہو رہا ہو۔ اگر اُس کو چھوڑ دیا جائے تو شاید بے پروائی سے سیر کرتا ہوا وہیں واپس چلا جائے جہاں سے آیا ہے۔ ڈرُوز نے اسی محویت میں سر نیچے کی طرف جھکا کر دیکھا۔ جس طرح کوئی کسی شفاف سمندر کی گہرائیوں کو عبور کرتا ہوا سطحِ زمین پر نگاہ ڈالے اُس نے دیکھا کہ آدمیوں اور گھوڑوں کا ایک گروہ سبزہ زار سے پیچ و تاب کھاتا ہوا آ رہا ہے کسی بے وقوف کمانڈر نے سپاہیوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ جانوروں کو اِس کھلی جگہ میں پانی پلائیں جو سیکڑوں بلندیوں سے نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔

ڈرُوز نے وادی کی جانب سے سر ہٹا کر پھر سوار کی طرف دیکھا اور رائفل دُرست کیا۔ مگر اس دفعہ نشانہ گھوڑے پر تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک غیبی ندا کی طرح اپنے باپ کے یہ الفاظ گونج رہے تھے "جس حالت میں بھی تم رہو اپنا فرضِ منصبی ادا کرو" اب وہ مطمئن تھا۔ اُس کے چہرے سے استقلال اور عزمِ راسخ کے آثار نمایاں تھے۔ اعصاب میں لرزہ نہ تھا۔ اب وہ آہستگی اور نرمی سے سانس لے رہا تھا۔ نشانہ لیتے ہوئے اُس نے سانس روک لیا۔ ادائے فرض کے احساس نے اُس پر غلبہ پا لیا تھا اور رُوح نے جسم کو بے حس و حرکت بنا دیا تھا۔ آخر اُس نے گولی چلا دی۔

اس وقت فیڈرل رجمنٹ کا ایک افسر سیر کرتا ہوا اپنے پڑاؤ سے نکل کر بغیر کسی خاص ارادے کے پہاڑی کے نیچے آ کھڑا ہوا تھا اور اس فکر میں تھا کہ اِدھر اُدھر گشت لگا کر دلچسپ معلومات حاصل کرے۔ اُس کے سامنے ایک ثُلث میل کے فاصلہ پر، مگر دیکھنے میں بہت قریب، صنوبر کے درختوں کے ہجوم میں سے پہاڑ کی عظیم الشان چٹان نکلی ہوئی تھی۔ یہ چٹان اس قدر بلند تھی کہ اُس کو دیکھ کر سر چکرا تا تھا۔ اُس کے دائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک صاف عمودی حصّہ تھا جو نیلے آسمان کی سطح کے تقابل سے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پیچھے دُوری میں جو پہاڑیاں تھیں وہ بھی نیلی معلوم ہوتی تھیں۔ درختوں کے اوپر جب نظر اُٹھا کر افسر نے پہاڑی کی چوٹی کی طرف دیکھا تو اُسے ایک عجیب و غریب منظر نظر آیا۔ ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہوا میں اُڑتا ہوا، وادی کی طرف آ رہا تھا۔

سوار زین پر سیدھا بیٹھا تھا، جیسا فوجی افسروں کو چاہئے مطمئن۔ اور لگام کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تاکہ گھوڑا تیزی سے سر کے بل نہ گرے۔ اُس کے ننگے سر سے لمبے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ دایاں ہاتھ گھوڑے کی ایال سے چھپا ہوا تھا۔ گھوڑے

کا جسم ایسا تنا ہُوا تھا کہ گویا بجائے ہوا میں اُڑنے کے سخت زمین پر چل رہا ہو۔ اُس کی رفتار بہت تیز تھی۔ مگر دیکھتے دیکھتے یوں معلوم ہُوا کہ گھوڑے کے چاروں پاؤں آگے کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ گویا وہ جست لگانے کی تیاری کر رہا ہے۔ مگر یہ تو ایک پرواز تھی۔

فضا میں شہسوار کو دیکھ کر افسر کے دل میں خوف اور تعجب نے گھر کر لیا اور اس کو یقین ہونے لگا کہ کوئی نیا معجزہ ظہور پذیر ہونے کو ہے۔ شاید جذبات کے تاثر سے افسر چکرا کر گرا اور ساتھ ہی درختوں میں کسی سخت چیز کے دھماکے سے ٹکرانے کی آواز آئی۔ یہ آواز بغیر بازگشت کے یکایک مفقود ہوگئی اور سناٹا چھا گیا۔

افسر کانپتا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ زخمی ٹھوڑی میں درد محسوس کرکے وہ ہوش میں آیا اور تیزی سے بھاگتا ہُوا پہاڑی سے آدھ میل کے فاصلے پر جا کر ٹھہرا۔ یہاں اسے اُس سوار کا پتا چلنے کی اُمید تھی۔ مگر اُسے ناکامی ہوئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ خیمے میں واپس چلا آیا۔

یہ افسر بہت معقولیت پسند تھا اور کبھی ایسی حقیقت کا انکشاف نہ کرتا تھا جو بادی النظر میں قابلِ یقین نہ ہو۔ اُس نے آج کے واقعے کا تذکرہ کسی سے نہ کیا۔ مگر جب کمانڈر نے اُس سے پوچھا کہ تم نے کوئی اہم واقفیت رات کے حملے کے متعلق حاصل کی ہے؟ تو اُس نے جواب دیا "ہاں جناب جنوب سے اس وادی میں آنے کے لئے کوئی سڑک نہیں ہے"۔

کمانڈر نے جو سڑک کے متعلق افسر سے زیادہ واقفیت رکھتا تھا مُسکرا دیا۔

گولی چلانے کے بعد کارٹر ڈروز نے پھر اَلفل بھر لیا اور ہوشیار ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دس منٹ کا وقت مشکل سے گذرا ہوگا کہ فیڈرل رجمنٹ کا ایک سارجنٹ سینے کے بل زمین پر چلتا ہُوا اُس کے قریب پہنچا۔ ڈروز اُس کی طرف متوجہ نہ ہُوا بلکہ بے حس و حرکت خاموش پڑا رہا۔

افسر نے ڈروز کے کان میں آہستہ سے کہا "تم نے گولی چلائی تھی؟"

"ہاں"

"کس چیز پر؟"

"ایک گھوڑے پر۔ وہ سامنے والی چٹان پر کھڑا ہُوا تھا۔ دیکھو اب گھوڑا وہاں نہیں ہے۔ وہ پہاڑی کے نیچے گر گیا ہے"۔

ڈروز کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اُس کے اندرونی جذبات کے اور کسی قسم کے آثار نمایاں نہ تھے۔ جواب دے کر اُس نے منہ پھیر لیا۔ سارجنٹ نے کچھ سمجھا نہیں۔

اس نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کہا "دیکھو ڈروز اس واقعہ کی اطلاع تمہیں افسروں کو فوراً دینی چاہیئے تھی۔ کیا تم چھپانا چاہتے ہو۔ میں حکم دیتا ہوں کہ تم اس کی رپورٹ داخل کردو۔ گھوڑے پر کوئی آدمی بھی تھا؟"

"ہاں"

"کون؟"

"میرا باپ!"

"اُو خدا!" سارجنٹ کے منہ سے ایک چیخ کے ساتھ یہ الفاظ نکلے اور پھر وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا۔ (ایمبروز بیرس)

آرزو جلیلی

محفلِ ادب

فقیر کا تکیہ

شام۔ تھوڑا سا دن، ڈوبتا سا سورج، راستہ کے دونوں طرف کھنڈرات، اینٹ، پتھر، چونہ، مٹی کے ڈھیر خود رو سبزہ سے ڈھکے ہوئے جن پر کرورِ سورج کی شعاعیں پڑ کر اچٹ رہی ہیں کہیں دیوار کا کچھ حصہ جو باقی رہ گیا ہے اُس کی کنگنی پر شاما بول رہی ہے۔ وَیَڑ کسی اِملی کے درخت کی پھننگ پر بیٹھا ہوا چہچہا رہا ہے۔ مغرب کی طرف پھٹے پھٹے بادلوں کا سلسلہ جو مساوی الحجم ہوا میں رُکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اتنے بطی السیر ہیں کہ نظر اُن کی حرکت محسوس نہیں کر سکتی۔ آفتاب کی کرنوں نے اُن کو نارنجی رنگ دیا ہے۔ اُن بادلوں کے نیچے ابابیلیں جھرمٹ کھا کر سُریلے راگ گا رہی ہیں اور ہوا مُنہ پر لئے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں اور کچھ ابابیلیں جو چکر لگاتے وقت ٹکڑی سے پیچھے رہ جاتی ہیں تو پھر ہوا پر تن کر جھومڑ میں آملتی ہیں۔

آثارِ صنا دید۔ کہیں دروازے کی محراب جو کئی جگہ سے کھُل گئی ہے اور جسے فلک کی سرد مہری نے سیاہ کر دیا ہے اوپر دو تین کنگرے باقی ہیں جن پر چیل کوّوں کی بیٹ کے سفید سفید نشان کہیں دالان کی بنگریدار ڈاٹ کا کچھ حصہ۔ کہیں شاہ نشین کی کُرسی کہیں چبوترے کا نشان۔ کسی جگہ دو تین سیڑھیاں۔ کہیں لداؤ کی چھت کا کونہ کہیں حوض کا کنارہ کہیں طاق کا اجارہ، کہیں دیوار میں انگوٹھے کی علامت۔ کہیں کانس کا ٹکڑا کسی جگہ مٹے مٹے نقش و نگار نہ کہیں پھول گوکھ دریچہ۔ کسی دیوار میں قُلبہ دبے ہوئے۔ غرض وہ کہنہ عمارتیں اپنی ٹوٹی پھوٹی زبانِ حال سے اگلے زمانے کی صنعت اور کاریگری گویا زبانِ حال سے اظہار کر رہی ہیں ؎ از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ۔ آثار پدیداست صنا دیدِ عجم را۔

تکیہ۔ المختصر میں اور شہر کے تماشائی جو میلہ کرکے آتے ہیں دلّی دروازے سے ایک میل کے فاصلے پر سائیں ٹگہ شاہ کا تکیہ ہے۔ ٹگہ شاہ کوڑا شاہ کے مُرید اور دمڑو شاہ آپ کے دادا پیر ہیں اور ٹگہ شاہ کے دو مُرید ہیں۔ لیّا شاہ اور جھنجی شاہ۔ گویا بے دام کے غلام ہیں۔ یہیں تکیہ کے قریب آیا تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے پر دو تین درخت بڑ اور پیپل کے بلند سڑک کے دونوں طرف سایہ دار اور لب سڑک مسجد کا ایک چبوترہ جس کے قریب شاہ صاحب کا کچا ڈھابہ جس کی دیواروں کی مٹی بارش سے ڈھل گئی ہے اور منڈیروں پر کنکر اور ٹھیکریاں نکل آئی ہیں اس ڈھابہ کی پُشت کی طرف دس بارہ گرہ لمبا لکڑی کا پرنالہ جس کو بان سے باندھ کر منڈیر سے اٹکا رکھا ہے پرنالہ کے دونوں طرف جو اچھل اچھل کر برساتی پانی بہا ہے اُس نے مٹی کھلا کر منڈیر سے زمین تک ایک لمبا گھٹّا کھول دیا ہے۔ اندر کوٹھڑی کے بیچوں بیچ اُپلے کچھ جنگل کے چُنے ہوئے ارنے کیکر کے خار دار جھانکڑ گلی ہوئی مکئی، جوار کی جڑیں، کچھ بوسیدہ چھپر کا پھونس گیلا پڑا ہے اور اُس ڈھیر کے قریب ایک بکری اور دو اُس کے بچے بندھے ہوئے۔ موت اور مینگنیوں سے چونکہ برسات ہے ایک سڑا ہوا بھپکا نکل رہا ہے۔ ڈھابہ کی منڈیروں پر پُرانے ٹپلہ کے بوریے کے ٹکڑے پڑے ہیں اور اُن کی حفاظت کے واسطے پُرانے پان کے توڑوں میں کہیں مٹکے کا ٹوٹا ہوا گلا بندھا ہے۔ کسی طرف اینٹ باندھ کر لٹکا دی ہے

کوٹھڑی کے دروازے کے قریب ایک مٹکا جس کا نونی لگ کر گلا جھڑ گیا ہے چاروں طرف کائی کے ٹکڑے جو خشک ہو کر چٹخ گئے ہیں مٹکے کے چاروں طرف لپٹے ہوئے ہیں، پانی مٹکے کے پیندے میں گل آلودہ رہ گیا ہے اور ہزاروں کیڑے اُس میں کُل بلا رہے ہیں چینی کی جگہ ٹھلیا کا ٹوٹا ہوا ٹکڑا ڈھکا ہے۔ اور اوپر اُس کے ایک دُودھ کا کلھڑا کنارہ ٹوٹا ہوا پانی پینے کو ٹھیکرے میں اُوندھا ہوا، چوکھٹ میں اندر کی طرف ایک گدڑی بچھی ہوئی اُس پر سائیں ٹکہ شاہ بیٹھے ہوئے پچاس پچپن برس کا سن نیچی کر بڑی ڈاڑھی نشہ میں جو رال پینک کے وقت بہی ہے اُس سے ڈاڑھی کے بال چپک کر بتیاں سی بندھ گئی ہیں۔ سر پر ایک گاڑھے کا میلا پُرانا چیتھڑا لپٹا ہوا۔ کان کی لوؤں میں پیتل کی دو بالیاں، گلے میں گزی کی دوہری کُرتی جس کا ابرہ پھٹ گیا ہے اور فقط استر باقی رہ گیا ہے، ایک آستین کُہنی پر سے نکلی ہوئی، دوسری شانے پر سے ندارد۔ کمر لوئی میں کواڑی کے قریب۔ ایک جیب جس میں تمباکو کی چمڑے کی تھیلی، جس کے مُنہ پر ڈورا بندھا ہوا اور ڈورے کے سرے پر ایک ٹوٹی ہوئی جھنجی کوڑی بندھی ہوئی برسات کی، پن بھری ہوا سے جو تمباکو کا گُڑ پگھلا ہے تو بالشت بھر تک یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کُرتی یہاں سے ہے کس کپڑے کی۔ ٹانگوں میں نیلا لنگ جس پر پسینہ آکر جو خشک ہوا ہے تو جس طرح کسی قطعہ پر مُوش دنداں بناتے ہیں پسینہ کی شوریت سے ایک سفید جال سا بن گیا ہے۔ پاؤں میں ایک لعل منکا جس کو رتوا کہتے ہیں ٹخنے کے قریب ڈورے سے بندھا ہوا، آگے ٹوٹے ہوئے مٹکے کا ایک کڑیل دھوئیں سے کالا، راکھ بھری ہوئی اور کڑیل کے گرد چلمیں جو اُلٹی گئی ہیں تو گُل تمباکو کے جلے ہوئے چار طرف پڑے ہیں۔ راکھ میں ایک تھپوا اُپلہ دبا ہوا کنارے پر اُپلے کے تھوڑی سی آگ اور اُس پر کچھ کرُسیاں رکھی شاہ صاحب لنگی کا آنچل دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے جھل رہے ہیں۔ کبھی مُنہ سے پھونکتے ہیں۔ چہرہ کا رنگ لال ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ کڑیل کے قریب ایک مٹی کا مداریہ حُقہ جس پر نرسل کا نیچہ۔ نیچے پر جو سیلی دھجیاں لپٹی ہوئی ہیں وہ سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں اور پھٹا ہوا نیچہ نکل آیا ہے۔ گٹا سڑ کر چپک پیدا کر لایا ہے۔ اور حقہ پینے والوں نے جو گٹا دبا دبا کر پیا ہے۔ گٹے کے دونوں طرف گڑھے پڑ گئے ہیں آپ نے کا راجس کو نہرو کہتے ہیں جلا ہوا اُس پر ڈنڈی اور کنارہ ٹوٹی چلم رکھی ہے اور شاہ صاحب کا سامانِ فقیری سہنکا، مٹکا، سیلی، تاگہ، کنٹھا، جھولی، لوٹا، تابنا میا۔ مُندرہ، حلقہ، تسبیح۔ الفا، کفنا، سونٹا کونڈی، کشتی، کملی۔ تسلا، چملی۔ مالا۔ بندا، تسمہ۔ چھڑی۔ کھڑاؤں، لُنگ۔ جُبہ۔ چادر۔ خرقہ۔ صافہ۔ ہاتھوں میں تانبے پیتل لوہے کے کڑے پڑے۔ گُدڑی پر بیٹھے بھنگ کے نشہ سے ہونٹ خشک آنکھیں جھکی ہوئی لال لال۔ بار بار ہونٹ خشک ہونے کی وجہ سے زبان ہونٹوں پر پھیر لیتے ہیں۔ میرے اوپر جو شاہ صاحب کی نظر پڑی تو بآوازِ بلند کہا میر صاحب بابا حُقہ پیتے جاؤ۔ میں نے صاحب سلامت کی اور شاہ صاحب نے ایک گھما اینٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب نے اپنے چیلے کو آواز دی۔ بیٹا لبہ شاہ چلم بھر دلیکن آگ جھاڑ کر اور دھو کر رکھنا۔ جھنجی حُقہ تازہ کر دو اور وہ جھاؤ کا تنکا پڑا ہے آب نے میں پھیر لو۔ بیٹا یہ میر صاحب داستان گو ہیں۔ برے اٹ کی سٹ لڑاتے ہیں۔ یہ امیروں کے کھلونے ہیں۔ اِن کے تو دیدار ہی مشکل سے ہوتے ہیں۔ میاں میر صاحب آپ تو ہفتہ اور منگل کو اپنے مکان پر داستان کہتے ہیں۔ ٹکٹ لگا کر۔ میں ان دونوں کو داستان میں بھیجوں گا۔ آپ داستان میں مُرشد کا ادب۔ صبر و قناعت کی خوبیاں۔ بادِ لُود کے فائدے نفس کُشی کے طریقے ان کو سنا دینا۔ آپ تو ہر قسم کے مفیدِ عام مضمون بیان کرتے ہیں۔ میں تو ان دونوں کو سمجھاتے

تنگ آگیا۔ یہ ایسے خچر ہیں کہ سمجھتے ہی نہیں۔

(ساقی) میر باقر علی داستان گو مرحوم دہلوی)

میرا محبوب

مہ و خورشید جس کی جستجو میں جادہ پیما ہیں
ستارے جس کے شوقِ دید میں حسرت سراپا ہیں
وہ جس کے عشق کے آثار ہر ذرے میں پیدا ہیں
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا
گذر محفل میں جس کی قدسیوں کا ہو نہیں سکتا
ملائک کو کبھی جس کا نظارہ۔ ہو نہیں سکتا
وہ۔ جس کا راز۔ انسانوں سے رُسوا ہو نہیں سکتا
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا
ابد ہے جس کی زُلفوں کی سیہ پوشی کے سایہ میں
ازل جس کی حسیں آنکھوں کی مدہوشی کے سایہ میں
محبت نغمہ گر ہے جس کی خاموشی کے سایہ میں
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا
وہ جس کی بے نیازی ہے نیازِ عشق کا حاصل
وہ جس کی کج ادائی امتیازِ عشق کا حاصل
وہ جس کا عشق ہے۔ سوز و گدازِ عشق کا حاصل
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا
تصور جس کا تسکین بخشِ احساسِ وفا کوشی!
وہ جس کی یاد کیف سرمدیت سے ہم آغوشی
بقا ہے یاد جس کی اور فنا جس کی فراموشی
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا
جسے میری تمنّا ہے مجھے جس کی تمنا ہے!
جسے ڈھونڈا ہے میں نے اور جس نے مجھ کو ڈھونڈا ہے
میں جس کے دل کی دُنیا ہوں جو میرے دل کی دُنیا ہے
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا
جو خود میری طرح مجبورِ پیمانِ جُدائی ہے!
جو مجھ سے دُور رہ کر خود بھی حیرانِ جُدائی ہے
روش جس کی محبت داغِ حرمانِ جُدائی ہے
وہی محبوب ہے میرا وہی محبوب ہے میرا

(نگار)

تبصرہ

اشا

یہ سہ ماہی انگریزی رسالہ پنجاب لٹریری لیگ کے زیرِ اہتمام اکتوبر ۱۹۳۲ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کا مقصد فنونِ لطیفہ اور ادبیات کا مطالعہ اور اُن کی نشرواشاعت ہے پنجاب لٹریری لیگ جس کی بنیاد پنجاب کے چند صاحبِ ذوق نوجوان ادیبوں نے کچھ عرصہ قبل رکھی تھی اب تک بہت مفید کام کر چکی ہے اور امید ہے کہ یہ رسالہ جس کا ادارۂ تحریر مس ممتاز شاہنواز اور مسرز ایچ ایل پرلشر اور ڈی آر چودھری پر مشتمل ہے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا۔ اُشا ظاہری و معنوی محاسن کے اعتبار سے یکساں اہلِ علم و فن کی سرپرستی کا مستحق ہے۔ زیرِ نظر پرچے کے مضمون نگاروں میں جان ڈرنک واٹر، سروجنی نائیڈو، فریڈرک گولڈ، ایمل لڈوگ، عبداللہ یوسف علی فلک پیما، سنت نہال سنگھ وغیرہ مشاہیرِ شرق و غرب کے نام نظر آتے اور ادبی و فنی موضوعات پر مفید مضامین درج کئے گئے ہیں۔ اس رسالے کے اجرا پر برنارڈ شا۔ گالزوردی، جے سی سکوائر، رابرٹ لنڈ اور لارنس بنین جیسے شہرۂ آفاق مغربی حکماء و مصنفین نے تہنیت کے پیغامات بھیجے ہیں جو زیرِ نظر پرچے میں درج ہیں۔ رسالے میں تصاویر اور دلچسپ کارٹونوں کا اہتمام بھی کیا گیا ہے حجم ۷۲ صفحات ہندوستان کے لئے سالانہ چندہ پانچ روپے ہے اور الگ پرچے کی قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

پتا:- دفتر اشا نمبر ۱۸ ٹھنڈی سڑک لاہور

"فل بوٹ"

مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی جن کے مزاحیہ افسانوں کی شہرت اب کسی تعارف کی محتاج نہیں رہی ناول نویسی کے میدان میں آئے ہیں اور بلاشبہ یہ میدان بھی انہوں نے مار لیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ فل بوٹ بھی اپنے ۱۷۶ صفحات کے حجم کے باوجود ناول نہیں بلکہ ذرا طویل "مختصر افسانہ" ہی ہے۔ ہیرو ایک کمزور مزاج نوجوان ہے جسے تقدیر بے بس کر کے ایک خاص سمت دھکیلتی ہوئی لے گئی ہے اس کی نوجوان بیوی ایک سیدھی سادھی اور بھولی بھالی لڑکی ہے جس کی سیرت میں کوئی خصوصیت نہیں۔ البتہ مس سنگھ کی سیرت نہایت زبردست ہے جس کی محبت کو اُس کے بے وفا محبوب کی عہد شکنی بھی شکست دینے سے بالکل عاجز ہے۔ محبت کی مصیبت کا یہ عقدۂ دشوار جو ہنوز حل نہیں ہوا ہیرو کی کمزور مزاجی کی وجہ سے طبیعت میں کسی حد تک انقباض پیدا کر دیتا ہے اور ایک ناگوار اُلجھن سی محسوس ہوتی ہے جس کی تلافی مرزا صاحب کے دلکشا مزاح کی چاشنی کے بغیر ناممکن تھی افسانہ بے انتہا دلچسپ اور "بے نتیجہ" ہے اور ہم ناظرین ہمایوں سے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ اسے منگا کر ضرور لطف اندوز ہوں۔ مرزا صاحب کی دوسری تصانیف کی طرح فل بوٹ میں بھی ہندوستانی معاشرت کی جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں میں پھرنے لگتی ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت کے حُسنِ اہتمام کی حد نہیں اور قیمت صرف ۱۲؍

پتا:- مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی وکیل جودھپور (مارواڑ)